۲۸۲

دوستی از دشمن طبیعی مجوی
آب حیات از دم افعی مجوی

دشمن دانا که پی جان بود
بهتر از آن دوست که نادان بود

44 ز محمد غلام پهلوان مرحوم

100x60
000
600
6006

149 ص

2000 ص

208 ص v.1m

سلسلۂ تالیفات ظفر برادرس تاجران کتب ظفرل منزل ۲۷

کلام فوق

جسمیں

غزلوں اور عام قومی اور ملکی نظموں کے علاوہ خطہ جنت نظیر کشمیر کے مناظر
اس کے باشندوں کی تمدنی و معاشری حالت کشمیر کی تعلیمی
و اخلاقی پستی اور کشمیر کے روشن مستقبل پر نہایت دردل
چند موزوں خیالات

اور

ہر نظم و غزل سے پہلے اس کی شان نزول یا سبب تصنیف کا
دلچسپ پیرایہ میں اظہار کیا گیا ہے۔

مصنفہ

محمد الدین فوق

بار دوم (بہ اضافہ)

۱۹۳۳ء

قیمت فی جلد ۱۲؍

فہرست مضامین کلام فوق

مقدمہ۔ از مولانا محمد علم الدین صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

حصہ اول

(۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۱ء تک)

حصہ دوم

(از ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۹ء)

قیمت کلام فوق ۱۲؍

(کریمی پریس لاہور)

مقدمہ

جناب فوق. بقول ترجمان حقیقت لسان الاسرار حضرت علامہ سر اقبال اہل کشمیر کی دیرینہ قومی وملکی خدمات کے لحاظ سے "مجدد کشامرہ" ہیں۔ بلکہ حال ہی میں مولانا عبدالسلام رنیقی کو ہنگ ٹیمور رجزائر شرق الہند نے آپ کو "محی کشامرہ" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ آپ کی علمی اور ادبی سرگرمیاں قابل صد رشک اور باعث صد مباہات ہیں. آپ کی زندگی ایک سرگرم عمل زندگی ہے. جو انتہائی خاموشی کے باوجود اپنے اندر ایک طوفان حیات پنہاں رکھتی ہے یہ زندگی آجکل کے نوجوانوں کے لئے بہترین رہنما کا کام دے سکتی ہے۔

حضرت فوق ایک مقصد کو لیکر نکلے تھے اور آج نہایت تیقن سے یہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ اپنے مقصد وحید میں کامیاب اور فائز المرام نظر آ رہے ہیں. آپ نے سن شعور سے تاریخ کو اپنی جولانگاہ بنایا اور اسلاف کے زرین کارنامے آپ کی بدولت قعر گمنامی سے نکلکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔

کشمیر آپ کا وطن مالوف ہے اور ہادی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "حب الوطن من الایمان" کے بموجب آپ اس کی ہر شے کو ژرف نگاہی سے دیکھتے ہیں. اور کشمیریوں کے حیرت انگیز کارناموں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکال رہے ہیں. اور یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ آپ نے تاریخ کشمیر کے علاوہ شباب کشمیر جیسی ایک ولولہ انگیز کتاب لکھی. جو کشمیر کی گذشتہ عظمت وشوکت کی ایک زندہ یادگار ہے. کاش ملک کے کونے کونے سے اس قسم کی کتابیں لکھی جائیں. تاکہ اہل ہند کو یہ معلوم ہو جائے. کہ ان کے اسلاف نہ صرف صاحب السیف والقلم ہی تھے. بلکہ باہمی اتحاد واعتماد کو بھی وہ ملکی ترقی اور دائمی امن و امان کا ذریعہ سمجھا کرتے تھے اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر آپ نے ایک اور کتاب "تاریخ کا روشن پہلو" لکھی. یہ کتاب بھی

اس قابل ہے کہ اس بدقسمت ملک کا ہر پڑھا لکھا اسے پڑھے۔ اس کے مطالب پر غور کرے تاکہ تعصب اور ناتوان بینی۔ کوتاہ اندیشی و بدگمانی کی گھٹائیں چھن جائیں اور آفتاب حقیقت ہندوستان کے مطلع پر طلوع ہو کر ملک میں صلح و رواداری کی روشنی پھیلا دے۔

لاہور فوق صاحب کا دارالادب ہے۔ اس تاریخی شہر کے متعلق گو جج عبداللطیف مرحوم اور مولوی نور احمد چشتی نے بہت کچھ لکھا۔ مگر فوق صاحب نے اس داستان کو کچھ ایسے انداز شوق سے بیان کیا ہے کہ اس شہر کی تاریخی عظمت ہر پڑھے لکھے انسان کے دل پر چھا گئی ہے۔ آپ لاہور کی ایک نہایت مفصل و مبسوط تاریخ مرتب کرنے میں مشغول ہیں۔ جو یقیناً اپنی طرز کی ایک شاندار کتاب ہوگی۔ اور ہندوستان کے علمی اور تاریخی حلقوں میں ایک ہلچل ڈال دیگی یہ موقعہ نہیں کہ میں جناب فوق کے تاریخی کارناموں پر بحث کروں۔ میں اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ آپ ہندوستان کی ان مخصوص ہستیوں میں ہیں جنہوں نے تاریخ کا صحیح مذاق عوام میں پیدا کیا اور دورِ حاضرہ کے بلند پایہ مورخین میں آپ ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

فوق صاحب ماشاءاللہ شاعر بھی ہیں اور اس عالم میں اپنی ایک علیحدہ دنیا رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا آپ نے اپنے کلام کا مجموعہ شائع کیا تھا جسے قدردانی نے سر آنکھوں پر اٹھایا قبولیت نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رنگین پھولوں کا یہ گلدستہ تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو گیا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اسے مکمل صورت میں دوبارہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اب یہ کتاب مکمل صورت میں شائع ہو رہی ہے۔

فوق صاحب فطری شاعروں کی طرح بچپن ہی سے شعر کہتے ہیں۔ اور آپ کی شاعری فقط لفظی جگت بازی یا قافیہ پیمائی تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ اس وقت شعر کہتے ہیں جب کوئی خاص جذبہ آپ کے قلب اور جگر پر اثر کرتا ہے۔ اور آپ کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔

کلامِ فوق کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس طریقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ

اگر کوئی شخص پنجاب اور کشمیر کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ تدوین کرنا چاہے تو ۱۸۹۵ء سے لیکر آج تک کے واقعات کے متعلق بہت سا مواد اسے کلام فوق سے دستیاب ہو جائیگا۔ مثلاً کلام فوق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۷ء میں لاہور میں ایک بزم انجمن اتحاد کے نام سے جاری تھی جو اپنے مشاعرے نواب غلام محبوب سبحانی (خلف نواب شیخ امام الدین گورنر کشمیر) کی سرپرستی میں بھاٹی دروازہ کے اندر کیا کرتی تھی۔ اس انجمن کے روح رواں جناب ارشد گورگانی اور خان احمد حسین خان تھے مشاعرانہ چشمک کی بنا پر ۱۸۹۸ء کی ابتدا میں اس بزم کا ایک بازو کٹ کر علیحدہ ہو گیا جس نے بزم قیصری کے نام سے ایک علیحدہ انجمن قائم کرلی۔ اس بزم کے کرتا دھرتا میر ناظر حسین ناظم مرحوم تھے۔ یہ دونوں انجمنیں ایک مدت تک اردو علم ادب کے لئے مفید کام کرتی رہیں۔ اور لوگوں میں شعر کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ ان مجالس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں بلا امتیاز مذہب وملت ہر شاعر شرکت کرتا تھا۔

جناب فوق نے ہر نظم کی ابتدا میں اس کا شان نزول بیان کیا ہے۔ یہ تمہید اتنی مختصر اور نپے تلے الفاظ میں ہوتی ہے کہ پڑھنے والا پہروں مزے لیتا رہتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو اردو شعرا میں تو بالکل ہی مفقود ہے۔ البتہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی مثنویات اور آپکے دیوان میں پائی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن سے لیکر سلطان غیاث الدین تغلق تک کے دور اسلامیہ کی تاریخ کی بہت سی غلطیاں اس کے مطالعہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ کلام ہمارے درمیان سے معدوم ہو جاتا۔ تو یقیناً ہندوستانی تاریخ کا یہ دور بالکل پردے میں جا چھپتا۔ اور ہمارے حریفان چابکدست جنہیں مسلمانوں کی تاریخ سے قلبی خصومت ہے۔ اسے بگاڑ کر خدا معلوم کیا کچھ بنا دیتے۔

ایران جدید کے ایک جلیل القدر فرزند عارف قزوینی نے کچھ عرصہ ہوا اپنا دیوان شائع کیا تھا۔ اس نے بھی ہر نظم کی ابتدا میں ایک لمبی تمہید لکھی ہے جس میں نظم کا شان نزول

اور دیگر اثرات جن کی بنا پر وہ نظم معرض وجود میں آئی۔ خوب مزے سے لیکر بیان کئے ہیں۔ مگر یہ تمہیدیں اس قدر لمبی اور اکتا دینے والی ہیں کہ شعر کا تمام لطف انہیں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کے خلاف حضرت فوقؔ کی تمہیدیں فقط چند اشارات پر مبنی ہیں۔ اور یہ اشارات اس قدر لطیف اور شوخی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ کہ بعض اوقات اصل نظم سے زیادہ لطف دے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم کی تمہید اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"میری سیاحت اکثر سرمائی مقامات اضلاع کانگڑہ۔ شملہ۔ وسط ہند اور کشمیر میں رہی ہے۔ جہاں میلوں تک لہراتے ہوئے دھان کے سبز کھیت۔ ہرے بھرے درخت۔ قدرتی چشمے جو پتھروں پر بہتے ہوئے زمزمہ خوانی کرتے یا فراق وطن کی دردبھری کہانی سناتے اور میدانوں کو شاداب کرتے چلے جا رہے تھے۔ دیکھنے والے کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے تھے۔ دریا کے پانی کا افتاں و خیزاں بے تحاشا دوڑا آنا بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرانا اور ایک مہیب آواز پیدا کرنا۔ وہ کیف آور منظر پیش کرتا تھا۔ جو چوٹ کھائے ہوئے دل۔ دردبھرے دل زخم خوردہ دل کیلئے تیر و نشتر کا کام دیتا تھا۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں معمولی گنوار بھی اپنی دیہاتی بے بہن مست و سرشار نظر آتا ہے۔ پھر ایک ایسا شخص جو تک بندی کرنا بھی جانتا ہو۔ دل دردمند بھی رکھتا ہو۔ ایسے پرفضا اور دلفریب مقامات میں جاکر کس طرح خاموش رہ سکتا ہے؟

"گو مرادوں کی راتیں" نہ تھیں لیکن جوانی کے دن" ضرور تھے۔ اس لیے اکثر مقامات کی سیاحت پاپیادہ کی۔ راہ کے دلچسپ نظاروں کی راحت۔ پیدل سفر کی صعوبت کو فراموش کرا کر آنکھوں کے لئے کحل الجواہر اور دماغ کے لئے معجون مروارید کا کام دیتی تھی کبھی پہاڑ کی اس بلندی پر جا پہنچتا تھا جو سطح سمندر سے دس بارہ ہزار فٹ بلند ہونے کی وجہ سے عرش چہارم کا کام دیتی تھی۔ اور

جہاں سرسبز درختوں کی ان گنت اور بے ترتیب قطاروں یعنی سبزے کے مخملی فرش رنگ برنگ کے خودرو پھولوں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ طیور اپنی سریلی آوازوں اور تیز سیٹیوں کے ذریعہ چاندنی رات کے مسافروں کو بہار صبح کی خوشخبری پہنچاتے تھے۔ قدرتی آبشاروں سے دودھ کی طرح سفید دھاروں کا گرنا زیب النسا بیگم کی اس رباعی کی یاد دلاتا تھا۔

اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی — چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی
آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب — سر را بہ سنگ می زدی و می گریستی

بلندی کو طے کرنے کے بعد کبھی اس شیبی مقام پر پہنچتا تھا جہاں پہاڑ کی چوٹی کنگرہ عرش سے ہم آغوش معلوم ہوتی تھی۔

راجپوتانہ کا سفر تو صرف ایک دفعہ کیا لیکن وسط ہند میں بارہا گیا۔ اس ملک کا سفر عموماً برسات کے دنوں میں ہوتا تھا اور بندھیاچل پہاڑ کے اکثر ٹکڑے چونکہ وسط ہند میں واقعہ ہیں۔ اس لئے ان گرم پہاڑوں سے بھی ایام برسات میں قدرتی چشمے نکل آتے ہیں۔ اور چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ جو دریائے خیال کو بحر مواج کا کام دیتا ہے۔"

پہلی سیاحت کشمیر کا کلام کتنی شاندار اور لطیف تمہید سے شروع ہوتا ہے۔

"کشمیر کی تعریف میں مغربی و مشرقی تمام مورخ و سیاح متفق الرائے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اچھا اور منتخب حصہ ہمالیہ ہے اور ہمالیہ میں کشمیر ایک ایسی دلفریب سرسبز اور شاداب وادی ہے جو ۵۰ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی ہونے کی وجہ سے دنیا میں لاثانی سمجھی جاتی ہے ع پہاڑوں میں یہ میدان وسیع اللہ کی قدرت۔ کشمیر میں ولی، بزرگ، جہانگرد، خدا پرست، مصور، صناع اور شاعر اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ کشمیر کی تاریخیں ان کے حالات سے بھری پڑی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ اس

چھوٹے سے ملک میں اس قدر ذہین وصناع اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اور جو یہاں آیا وہ ع کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا ایں جاست ۔ ہی کہتا رہا۔ اس معمہ کا حل نہایت آسان ہے۔ یہاں ہرے بھرے کھیت آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ قدرت کی گلکاریاں ہر پھول اور ہر کلی کے رنگ میں دماغ کو راحت پہنچاتی ہیں۔ سمندر جیسی بڑی بڑی لہروں والی جھیل وُلر عجیب ہولناک سین رکھتی ہے۔ پھر اس کے پہلو میں ریشم سے زیادہ ملائم اور شبنم سے زیادہ صاف پانی ڈل ہیں۔ پہاڑوں کا عکس کنارہ کے خوبصورت درختوں کے سایہ کا پانی کے اندر جھومنا ڈل میں تیرتے ہوئے کھیتوں کا جہاں تہاں لہرانا سطح آب پر کنول کے پتوں اور بوٹوں کا بہار دکھانا نیلگوں آسمان کا سر پر شامیانہ کشتیوں اور ہوس بوٹوں کی سیر اور دو رویہ ایسے خوبصورت نظارے ہیں کہ دل پر بغیر اثر کئے اور روح کو بغیر جنبش دیئے نہیں رہتے۔

جو لوگ سرد ملکوں کے پروردہ ہیں اور ایسے دلفریب نظاروں کے دیکھنے والے ہیں ان سے بہتر باغبان حقیقی کی گلکاریاں کون دیکھ سکتا اور کون ظاہر کر سکتا ہے وادی میں اکثر جگہ کریوہ یعنی اونچے اونچے میدان ہیں جن کے ہرے بلند اور وسیع جنگل شالی کے سرسبز کھیت۔ شیریں اور لطیف چشمے۔ ناشپاتی۔ سیب۔ بگوگوشہ اور دیگر مختلف قسم کے میوہ دار درختوں کی قطاریں ملک کی آب وہوا اور زیب و زینت کو دوبالا کر رہی ہیں۔ دریائے جہلم اننت ناگ کے چشمہ سے نکلکر ولر میں داخل ہوتا ہے۔ تو یہاں سے ایک نیا جنم لے کر اور نہا دھو کر نکلتا ہے اور بارہ مولا کے قریب خانپورہ کے تنگ درے کے ذریعہ ڈھلوان پہاڑ کو کھودتا۔ کریدتا چیرتا۔ اور اس خوشی و مسرت میں ایک شور مچاتا ہوا پنجاب کو نکل جاتا ہے۔

جب کشمیر کے سفر اور قیام میں کسی شاعر اور مورخ اور مصنف کو قدرت کاملہ کے یہ دلفریب منظر ظہور شان ربوبیت کے یہ روح پرور نظارے متاثر کئے بغیر نہ رہے۔ تو تعجب

ناچیز (فوق) جو خاکپائے اہل ذوق بھی ہے۔ خطۂ کشمیر سے نسبتِ وطن بھی رکھتا ہے آخر پہلو میں پتھر تو نہیں رکھتا تھا ع دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؛ ابھی میں رستے میں ہی تھا کہ بھگواڑی کے پڑاؤ پر اس زمانہ میں موٹریں اور لاریاں نہ تھیں ٹانگہ کا رواج تھا اور چار پانچ دن میں راولپنڈی سے سرینگر جا پہنچتے تھے ۲۸ ستمبر کی صبح کو کشمیر سے متعلق ہی ایک نظم لکھی گئی۔ دوسرے دن کی شام کو چناری کے پڑاؤ پر ایک غزل جس میں کشمیر کی پُردرد حالت ہی کا ذکر ہے کہی گئی۔"

ایک نظم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:-

"۵ نومبر ۱۹۰۷ء کو میں غاپنور کی پہاڑی کی طرف وزارت اور تحصیل کے عقب سے روانہ ہوا۔ ایک کھیت میں پانی آرہا تھا۔ اس خیال میں محو ہو کر کہ یہ پانی کہاں سے اور کتنی دور سے اور کس چشمہ سے آتا ہے اس کے دہانہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ قریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بلندی پر جا کر جنگلی بوٹیاں اور جھاڑیاں دامنگیر ہونے لگیں لیکن بچتا بچاتا چشمہ تک جا پہنچا۔ وہاں سے اس چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی کچھ بہت دور نہ تھی "قدمے فاصلہ دارد" کی بات تھی لیکن معاملہ "مردی و نامردی" کا تھا بہر حال بلندی کی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے جا پہنچا جہاں سے تحصیل۔ دریا۔ قصبہ۔ موضع غاپنور۔ اور گرد و نواح اور نزدیک و دُور کے گل و گلزار کا نظارہ تمام تکان کو دور کر گیا۔ کہیں میدان نظر آیا کہیں کرارہ (اونچی جگہ) پر آبادی اور مکانات۔ دریا میں پانی کی چادر اور اس چادر پر لکڑی کے بنگلے یعنی ہوس بوٹ۔ برفانی پہاڑوں کا سلسلہ اور اس پر سورج کی شعاعوں کا عکس۔ یہ سین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قلم ان کے بیان سے قاصر ہے۔ قریباً دو گھنٹہ تک اس پہاڑی کی سیر کرتا رہا۔ اسی اثنا میں مندرجہ ذیل خیالات بھی موزوں ہو گئے۔"

کلام فوق کی تیسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک شعر وطن کی محبت اور اسلام کے درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ فوق صاحب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مستقل طور پر مسلمانان کشمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے اہل عالم کو ان کی مظلومی سے روشناس کرایا۔ آپ نے نہ صرف اہالیان کشمیر کی مظلومی کا رونا رو دیا۔ بلکہ اسلاف کے شاندار کارناموں کو کشمیریوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے انہیں غیرت دلائی۔ کہ وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر گامزن ہوں اور اس طرح دینی و دنیوی فلاح حاصل کریں۔ اس لحاظ سے جناب فوق کشمیر کے مولانا حالی ہیں۔ اگر مسدس حالی نے مسلمانان ہند کو خواب غفلت سے جگایا تو کلام فوق اور اخبار فوق نے اہالیان کشمیر کے اندر ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی مثال بہت کم شاعر اور بہت کم ایڈیٹر پیش کر سکتے ہیں۔ شاعر کا یہی مشن ہوتا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ حضرت فوق اس فرض سے بدرجہ اولیٰ سبکدوش ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت فوق کی مشہور نظم "کانگڑی اور پھرن" ہے۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ محبت وطن میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

خطۂ کشمیر میں ہر کوئی بے توقیر ہے ‌‌ ‌ علم کے دشمن جو ہیں ان کی یہی تعزیر ہے
حسن بھی میوے بھی چشمے بھی ہوا بھی پر فضا ‌ ‌ ‌ پھر یہ کیا جو کوئی دل والا ہے وہ دلگیر ہے

مسلمانان کشمیر کی خستہ حالی دیکھکر شاعر کا نازک دل بھر آتا ہے بے اختیار اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ اور وہ دل کو ہلا دینے والے الفاظ میں آسمان کو یوں مخاطب کرتا ہے ؎

تو نے تو گرتی ہوئی قومیں اٹھائی ہیں بہت
اے فلک اس کے سنبھلنے کی بھی کچھ تدبیر ہے

یکایک ملہم غیب یہ آواز دیتا ہے ؎

عنقریب آنے کو ہے کشمیر میں بھی انقلاب
وقت استاد زماں ہے اور زمانہ پیر ہے

شاعر کی دوربین نگاہوں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ جب مصائب حد سے گذر جاتے ہیں تو اس کے مداوا کے خود بخود سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ظلم کا انجام انقلاب اور انقلاب کا انجام قوم کی خوشحالی ہوتی ہے۔ قوموں کی قسمتیں اسی طرح بدلا کرتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء کے جہاد حریت نے ثابت کر دیا کہ شاعر کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی تھا اب آپ کے چند ایسے اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ جو ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر سے کئی سال پہلے جبکہ کسی کو کشمیر کے اس انقلاب کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہے گئے تھے۔ ؎

یہ بشارت عنقریب آنے کو ہے کشمیر میں — آج سے موقوف ہے بیگار بھی کشمیر میں
پنجاب جس کے نور سے نورا چمک اٹھا — یارب وہ روشنی کبھی کشمیر میں بھی ہو
عنقریب آنے کو ہے کشمیر میں بھی انقلاب — وقت استاد زماں ہے اور زمانہ پیر ہے
روشن ہے ایک نور دل داغدار میں — پنہاں ہے آفتاب ہمارے غبار میں
بیگار کا جو ڈر ہے وہ موت سے سوا ہے — ظالم نے کر دیا ہے جینا حرام اپنا
پردیسیوں نے آکر پھیلا دیا تعصب — اور وہ بٹھا رہا ہے نقش دوام اپنا
ان کی حکومتیں ہیں اپنی اطاعتیں ہیں — دربار خاص ان کا دربار عام اپنا
کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے — جاگیگا تو مشکل سے وہ جائے گا سنبھالا
جس دم وہ دہاڑے گا تو گونج اٹھیگی دنیا — لرزے گی زمیں ہونگے سمندر تہ و بالا
جو خوبیاں اپنی ہیں نظر آئیں گی تجھکو — سب دور کبھی ہوگا تری آنکھ کا جالا
اللہ دے سمجھ تو پھر ان کو آزما دو — گھٹنوں کے بل جوانوں کو جس نے بٹھا دیا
مسلم کشمیر کو غافل حقارت سے نہ دیکھ — شیر پر تجھکو ہوا جاتا ہے دھوکہ شیر کا

"مسلم کشمیر سے خطاب" والی نظم کے دو آخری بند ملاحظہ ہوں۔ ؎

اٹھ کہ ہیں صدیوں کے اب سوئے ہوئے بیدار سب — جن کو ہم مجبور کہتے تھے وہ ہیں مختار سب
نشۂ صہبائے درد قوم کے سرشار سب — اب بدل دینے کو ہیں عالم کے کاروبار سب

تو بھی آ اور اس تگ و دو میں ذرا شامل تو ہو　　تو ہی خضر راہ ہو پہ عازم منزل تو ہو

جمع گو تفریق کی اک ضرب سے تقسیم ہے　　گو دل ہر درد مند قوم اب دو نیم ہے

حال مستقبل شکستہ خط میں گو ترقیم ہے　　مدعائے قوم گو ندرا امید و بیم ہے

پر تری غیرت اگر شان دگر پیدا کرے　　قالب بے روح میں جان دگر پیدا کرے

ہاں مگر اک وقت آنے کو ہے بعد انقلاب　　فطرت باری کا ہوگا پھر ارادہ کامیاب

ذرہ ہائے خاک سے چمکیں گے پھر سورج نئے　　ہوں گے پھر انوار کے معدن نئے مخرج نئے

ان خرابوں سے کھچے گی پھر یہاں تازہ شراب　　آئے گا پھر اس خزاں آلودہ گلشن پر شباب

ایسے ہی اشعار الہامی اشعار کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہی وہ اشعار ہیں۔ جو دل سے نکلتے ہی اپنا گہرا اثر دکھا جاتے ہیں۔ اور اسی قسم کے شاعر اور اسی قسم کے اشعار قوموں اور ملکوں کی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا کرتے ہیں۔

حضرت فوق نے ایک ہیجانی نظم "بڈشاہ کی روح سے خطاب" لکھی ہے۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ درد اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ بڈشاہ کشمیر کا سب سے زبردست اور عظیم الشان بادشاہ ہوا ہے جس نے کشمیر کی عظمت کا سکہ تمام دنیا پر بٹھا دیا تھا۔ آج بھی کشمیر کا بچہ بچہ اسے اپنا قومی بادشاہ تصور کرتا ہے۔ حکمت عملی کے لحاظ سے وہ کشمیر کا اکبر اعظم تھا۔ اس نے کشمیریوں کیلئے مکاتب کھولے۔ انہیں تحصیل علم کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اور حکومت کے بہت سے ذمہ دار شعبے اور ادارے ان کے لئے وقف کر دیئے۔ کشمیر اور جموں کی موجودہ بیداری اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے مگر "۲۲ جولائی ۱۹۳۱ء کی صبح کو رستم خانہ سرینگر کے ہزار ہا مزدوروں پر جو حضوری باغ میں جمع ہو کر اپنے پچیس اسیر کردہ مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فوج نے حملہ کر دیا۔ اور ہتھیار لوگ نیزوں، بھالوں کی نوکوں، گھوڑوں کی ٹاپوں، ڈنڈوں کی ضرب سے زخمی ہوئے

مسلمانوں کے جو خیالات اس وقت کشمیر کے مشہور ہر دلعزیز بادشاہ زین العابدین بڈشاہ اور کشمیر کے ہندوؤں کے متعلق تھے۔ ان کو فوق صاحب نے "بڈشاہ کی روح سے خطاب"

کے عنوان سے نظم میں قلمبند کیا۔ یہ نظم درحقیقت قومی درد کا مداوا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ قوم کی مردہ رگوں میں خون حیات بن کر دوڑ سکتا ہے۔ اگر بائرن کا چائلڈ ہیرلڈ یونان کو ترکوں کے خلاف برانگیختہ کر سکتا ہے۔ اگر فردوسی کا شاہنامہ ایران کی مردہ عصبیت کو زندہ کر سکتا ہے۔ اگر بیگرا دیپرا انگلستان سے ڈکیتی کی وارداتوں کو روک سکتا ہے۔ اور اگر شکسپیئر کا مرچنیٹ آف وینس اور سکاٹ کا آیون ہو یہودیوں کے خلاف جذبات نفرت کو مٹا سکتا ہے۔ اگر عارف کے روح پرور نغمے ایران جدید کی کایا پلیٹ کر سکتے ہیں۔ اگر اقبال کی دل کو گرما دینے والی نظمیں مسلمانوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کر سکتی ہیں۔ اگر مولانا حالی کی مسدس مسلمانوں کو ترقی کے لئے مضطرب اور بیقرار کر سکتی ہے۔ اگر ہیوگو اور اسی قبیل کے دیگر شعرا اور ادبا کی تصانیف فرانس میں انقلاب پیدا کر سکتی ہیں۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ جناب فوق کی یہ نظم کشمیر میں کوئی خوشگوار ہلچل ڈالدے۔ تو کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی شعر کی تخلیق اسی غرض کے لئے ہوئی ہے۔ رودکی کے معمولی بول اگر نصر بن احمد سامانی کو کئی منزل تک بغیر موزون کے بھگا سکتے ہیں۔ اور انوری کی مشہور نظم "اشک خراساں" سلجوقیوں کے دلوں میں غشردن کے خلاف جذبات نفرت پیدا کر سکتی۔ خاقانی کی مدائن والی نظم اگر ایران کی گذشتہ عظمت کی یاد دلوں میں تازہ کر سکتی ہے۔ جناب داغ کا شہر آشوب اگر دلی کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کر کے خون کے آنسو رلا سکتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کا مشہور شہر آشوب اگر مسلمانوں کے دلوں میں ٹرکی مراکش اور ایران کی محبت کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔ اور اگر علامہ سر اقبال کی سسلی والی نظم اور ترانہ ہم کو مضطرب اور بیقرار کر کے ہیں اسلام ازم کا حامی اور پرستار بنا سکتی ہیں۔ تو فوق صاحب کی یہ نظم بھی زندگی کے لئے تڑپ اور ترقی کے لئے ایک جوش پیدا کر سکتی ہے۔

ملٹن نے ایک اچھے شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔ کہ اس میں اصلیت، جوش اور سلاست ہونی چاہئے۔ جناب فوق کی یہ نظم اس معیار پر بھی پوری اترتی ہے۔

یہ نظم صفحہ ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱ پر ملاحظہ کیجئے۔

اسی ضمن میں جناب فوق کی ایک نظم "ایک کشمیری اور پنجابی کا مکالمہ" پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ نظم کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی۔ فرزندان توحید کی درماندگی کی آئینہ دار ہے۔ نظم کا ایک ایک لفظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نظم میں جناب فوق نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ کہ کس طرح ایک اجنبی حکومت فرزندان توحید پر تشدد و تظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے۔ اور کس طرح ان کے تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لئے چالیں چلی جاتی ہیں کشمیریوں کو ان کی جہالت پر سرزنش کی گئی ہے۔ اور کشمیر میں نئے پیدا شدہ فتنہ یعنی ہندو مسلم سوال پر اہل خطہ کو متنبہ کیا گیا ہے۔ بیگار کے متعلق فرماتے ہیں ؎

خاک پاک خطۂ کشمیر ہے جنت ۔ مگر
قہر دوزخ کا نمونہ ہے وہاں بیگار بھی
خلد ہے کشمیر۔ تو اس میں عذاب نارکیوں
کیا ہوا کرتا ہے جنت میں کہیں آزار بھی
ایک تو بیگار لیں پھر اس پہ مزدوری نہ دیں
مارتے ہیں آہ ظالم تیر بھی تلوار بھی
اس بہانے سے بہت ظلم و ستم ہے ملک پر
کھا گئے ظالم زمینداروں کی پیداوار بھی
عام لوگوں کا وہاں کیا حال ہوگا سوچ لو
خوف حاکم سے جہاں لرزاں ہوں نمبردار بھی
یہ تشدد کاش پہنچائے کوئی مہراج تک
باخبر حال رعیت سے تو ہو سرکار بھی

پنجاب کی بیداری و فراوانی علم اور کشمیر کی غفلت و جہالت کا کن درد بھرے

الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

ساکنان خطۂ پنجاب کا کیا پوچھنا
چشمۂ علم و ہنر سے ملک ہے سب فیضیاب
جاگ اٹھے خواب گراں سے آج سب سوئے ہوئے
بہرہ ور تعلیم کی نعمت سے ہے ہر شیخ و شاب
پھیل جائے روشنی تعلیم کی چاروں طرف
کاش ہو کشمیر سے بھی دور ظلمت کا حجاب
کاش کشمیری بھی ہوں شیدا علوم دہر کے
کاش اہل علم و فن ہو جائے ان کا بھی خطاب
ہیں جواں کشمیر کے لہو و لعب میں مبتلا
مل گیا مٹی میں اپنے ملک کا عہد شباب
قومیت کا یاں نشاں تک بھی نہیں احساس کیا
واں دلوں میں بچوں اور بوڑھوں کے جوش و اضطراب
روز افزوں ہے یہاں اخبار خوانی کا مذاق
اور وہاں ہر بزم میں ہنگامۂ چنگ و رباب
شومئے قسمت کہ خود عیسےٰ بھی ہے بیمار و زار
اور اس پر یہ ستم بیمار بھی ہے مست خواب

مناظر نگاری مشرقی شعرا کا بیش پا افتادہ مضمون ہے۔ اور اس پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے۔ کہ مزید لکھنے کی جرات نہیں ہوتی۔ مگر جناب فوق نے اس پامال اور فرسودہ مضمون کو اس رنگ میں پیش کیا ہے۔ کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ہم جنگل میں زندگی کا کیا لطف آرہا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۷

اس سلسلہ میں "مناظر کشمیر کی یاد" بھی نہایت دلچسپ اور دلآویز ہے۔ یہ نظم کشمیر کو الوداع کہتے وقت لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس میں جذبات حسرت بھی پائے جاتے ہیں۔ اس نظم کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

الوداع اے خطۂ کشمیر اے باغ بہشت
اے کہ تیرے منظر دلکش ہیں سب داغ بہشت

مناظر کی دلفریبیوں اور رنگینیوں اور کوہساروں مرغزاروں آبشاروں بلکہ گلعذاروں تک کا ذکر کرنے کے بعد اپنے وطن کی ذلت و بے حسی اور بے بسی و بے کسی کی طرف گریز کرتے ہوئے کس درد و حسرت کے ساتھ فرماتے ہیں۔ ؎

العجب اہل ارم آرام سے محروم ہیں
ساکن جنت ہیں اور انعام سے محروم ہیں
کاش فطرت ان کی مانند سحر بیدار ہو
کاش انہیں احساس اپنے حال کا اک بار ہو
کاش یہ اس جنت کشمیر میں رضواں نہیں
اس بہشتی ارض کی حوریں نہیں غلماں نہیں
پھونکتا رہتا ہوں اس محفل میں بیداری کا صور
ایک دن میری نوا ہوگی اثر پیرا ضرور
خود بخود خاموش دل نالہ سرا ہو جائیگا
جب وطن میرا سکوں سے آشنا ہو جائے گا

فوق صاحب کہیں کہیں شوخی و ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں۔ مگر آپ کی شوخی سنجیدگی اور متانت کا پہلو لئے ہوتی ہے۔ ڈھاکہ کے مچھروں کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نمرود کی طرح نہ کیا تھا کبھی غرور
کیوں تنگ کرتے ہیں مجھے مچھر تمام رات
رکھا سنان نیش نے شب بھر گریز پا
خالی پڑا رہا مرا بستر تمام رات
تنہا ادھر میں اور ادھر فوج پشگان
کس طرح ان سے لڑ سکوں جم کر تمام رات
اک جان ناتواں یہ ستم ہائے بے شمار
گویا بنا رہا ہیں ہمیبر تمام رات
دشمن حقیر بھی ہو تو سمجھو نہ تم حقیر
جاری رہا یہ مصرع زباں پر تمام رات

اسی طرح بلیک اینڈ وائٹ بھی شوخی اور ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہے

اتفاقاً کل میں جا نکلا ٹکلسن روڈ پر
جس جگہ تھے جمع کچھ نظارے سائٹ کیلئے
بمبئے ہیئر کا سرِ راہ اک دہاں سیلون ہے
شب تو شب جو وقف ہے دن کو بھی لائٹ کے لئے
اک مس کم سن کہ ہے مستِ شبابِ حسن و عشق
بوالہوس مرتے ہیں جس پر لسینے رائٹ کے لئے
جب اسے دیکھا جبینِ ناز پر بل آ گئے
گفتگو جب کی ہوئی تیار فائٹ کے لئے
تخلیہ چاہا تو فرمایا کہ قدر خود شناس
کوششیں بیکار ہیں کالے کی وائٹ کے لئے

ایک وقت تھا کہ کشمیر کے تمام شعبہ جات پر کانگڑہ نواسی مسلط تھے۔ فوق صاحب نے اس سیاسی اقتدار کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ہو گئیں ٹھنڈی مرے اہل وطن کی گرمیاں
"کانگڑی" کی جگہ ہے اب "کانگڑا" کشمیر میں

اسی ضمن میں "زمیندار اور وطن" کا مناظرہ بھی بعض نہایت گرم شعر اپنے اندر رکھتا ہے قارئین کرام اس نظم کو پڑھیں اور حظ اٹھائیں۔

کلام فوق پر تبصرہ ختم کرنے سے پیشتر میں جناب لسان العصر حضرت اکبر مرحوم کے ان الفاظ کا اعادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ :۔

"کلام فوق بلاشبہ قابل داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہوں۔ تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوق میں فطرتی آرزوئیں بھی ہیں۔ شوخی کا اظہار بھی ہے۔ قافئے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصہ ہے اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاقی و ہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں ہے اور بعض اشعار پر توجی چاہتا ہے کہ داد دوں کہ بوٹوں بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کے شان نزول نے تو آپ کی جدت آفرینی کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ کلام فوق پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اس کا ایک ایک شعر سحر بلال بنکر دل میں اتر جاتا ہے۔ اس کا سوز و گداز اسکی مناظر نگاری اسکی سادگی و سلاست ہر دل کو تسخیر کر لیتی ہے۔

(پروفیسر) محمد علم الدین سالک ایم۔ اے
۱۰ر جولائی ۱۹۳۳ء
لاہور



محمد دین فوق بعمر 20 سال
(سنہ 1897)



محمد دین فوق بعمر 24 سال
(سنہ 1901)

کلام فوق

حصہ اوّل

نظم قدیم

(از ۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۱ء)

میری شاعری کی ابتدا قصبہ جاکے ضلع سیالکوٹ سے ہوتی ہے۔ جہاں میں ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۴ء کے وسط تک مڈل سکول میں پڑھتا رہا۔ بورڈنگ ہوس میں میرے ایک بزرگ ہم خیال منشی رحیم بخش رمز تھے۔ ہم دیوانگان شاعری کا سکول میں خوب چرچا تھا۔ ایک مرتبہ نظیر اکبرآبادی کی یہ مسدس ع کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اردو سے فارسی نثر میں ترجمہ کرنے کے لئے ملی۔ نکات شعر و اشعار سے

لاہور میں عرصہ تک گرداورقانونگو رہے ہیں قریباً دس سال ہوئے آپ کا انتقال ہوچکا ہے۔

مطلق نا آشنا ہونے کے باوجود جرات۔ دلیری اور شوق دیکھئے کہ اس اردو نظم کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا گیا۔ آخری الفاظ ملاحظہ ہوں "زاں دست دہ زاں دست گیر" ایسی مضحکہ خیز نظمیں اور غزلیں طالب علمی کے ایام میں ایک ایک دن میں کئی کئی لکھ دیگئیں۔ لیکن جب معلوم ہوا ؎

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے　　تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

تو اس دفتر کو جو سر تا سر خود غلط انشا غلط املا غلط کا مصداق تھا۔ بے توجہی اور لاپروائی کے سمندر میں خس و خاشاک کی طرح بہا دینا پڑا۔

میری تمام نظمیں اور غزلیں ۱۹۱۰ء میں دو حصوں پر مشتمل تھیں چنانچہ اس زمانہ کا کلام فوق اپنی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں جس کا نام نظم قدیم ہے۔ ابتدائے شوق کا کلام درج ہے۔ جو ۱۸۹۵ء سے نومبر ۱۹۰۱ء تک کا ہے۔ دوسرے حصہ کا کلام جنوری ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۰ء تک کے زمانہ کا ہے۔ اس کا نام میں نے نظم جدید رکھا ہے۔ تیسرے حصے میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۳ء تک کا مجموعہ کلام ہے۔

۱۸۹۵ء میں میں سیالکوٹ میں بندوبست کا کام سیکھتا تھا اور منشی رحیم بخش مرحوم انٹرنس کلاس میں پڑھا کرتے تھے اس زمانہ میں سیالکوٹ میں منشی محمد اسمٰعیل صاحب ساغر (بعد میں صاحب تبلیغ) بھی شاعری کا شغل رکھتے تھے۔ جو ہندوستان میں عرصہ تک رہنے کی وجہ سے ہندوستانی ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان دوستوں کی وجہ سے خوب تفریح رہتی تھی۔ ۱ءسے ۶ء تک کی غزلیں سیالکوٹ ہی میں کہی گئیں۔

غزل اے جو درحقیقت پہلی غزل کہلائی جانے کی مستحق ہے ۱۸۹۶ء میں چند اور غزلوں کے ہمراہ نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی مرحوم کی خدمت میں بمقام حیدرآباد اصلاح کے لئے بھیجی گئی۔ آپ نے غزل کو بعد از اصلاح واپس بھیجا۔ اور جو الفاظ ساتھ ارقام فرمائے۔ وہ آپ [illegible] یادگار کے طور پر تبرکاً درج کئے جاتے ہیں۔

"فوق صاحب اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمہارا نام شاگردوں میں درج کر لیا گیا ہے۔ نیاز دلا دینا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ۔ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ اللہ۔ حضرت امیر خسرو علیہ رحمۃ خواجہ میر درد علیہ رحمۃ حضرت شاہ نصیر رحمۃ اللہ۔ حضرت اُستاد ذوقؔ مرحوم کے نام کی۔"

جوشِ سودا میں چلے ہیں جانبِ کہسار ہم — تم سے رخصت ہوتے ہیں اب اے درو دیوار ہم
تھا نہ جبتک سر میں سودا گھر بھی تھا گلشن ہمیں — اب تو کوہ و دشت میں پھرتے ہیں مجنوں وار ہم
جب سے غیرِ دل ہے وہ نظروں میں کھٹکے مثلِ خار — جانتے تھے پہلے جن کو غیرتِ گلزار ہم
صدمہ و رنج و بلا و حسرت و یاس و الم — ہجر میں رکھتے ہیں مونس بس یہی دو چار ہم
بعد مردن رہ گئی ہیں اس لئے آنکھیں کھلی — لے چلے ہیں قبر میں بھی حسرتِ دیدار ہم
ہجر میں اپنے پرائے جب کنارہ کش ہوئے — درد و غم نے دی تسلی ہیں ترے غمخوار ہم

۱ سچ بتا اے فوقؔ کس لیلیٰ ادا پر ہے نثار
دیکھتے ہیں تجھ میں سارے قیس کے آثار ہم

آہ کی جب نارسائی دیکھ لی — ہم نے قسمت کی برائی دیکھ لی
ان بتوں کے چہرے پُرنور ہیں — ہم نے شانِ کبریائی دیکھ لی
آجتک دیکھا نہ اس بُت کا جواب — دیکھ لی ساری خدائی دیکھ لی
چشمِ تر۔ تو نے ڈبویا ہے ہمیں — ہم نے تیری آشنائی دیکھ لی
کیا کیا؟ آخر سکندر سے سلوک — خضر تیری رہنمائی دیکھ لی
وعدۂ فردا قیامت ہوگیا — آپ کی وعدہ وفائی دیکھ لی
ہم کو اس نیرنگئ تقدیر نے — شکل جو جو کچھ دکھائی دیکھ لی

۲ ظاہرا صوفی بنا باطن سیاہ
فوقؔ تیری پارسائی دیکھ لی

وہ بت مہرباں تھا خفا ہو گیا
یہ اک آن میں کیا سے کیا ہو گیا

پریشاں دلِ مبتلا ہو گیا
ترا عشق گیسو بلا ہو گیا

تکلم میں ہے خون حسرت کا رنگ
کہا شعر جو مرثیا ہو گیا

قدم کس نے رکھا ہے بالینِ گور
چراغ لحد نقش پا ہو گیا

مزارِ غریباں میں برپا ہے حشر
ادھر سے گذر کیا ترا ہو گیا

۳ خبر اس کی لے جلد اے بے خبر
کہ جینے سے فوق اب خفا ہو گیا

سوتے میں وہ زلف آئی رخسار کے نیچے
ہے ابرِ سیہ ماہِ پُر انوار کے نیچے

مصروفِ دعا ہے لبِ ہر زخم کسی کا
گردن رہے ہر دم تری تلوار کے نیچے

قرآن میں آتی ہیں نظر نور کی سطریں
رکھ لیتے ہیں جب ہاتھ وہ رخسار کے نیچے

عشاق سمجھ کر اسے محرابِ عبادت
سر اپنا جھکا دیتے ہیں تلوار کے نیچے

۴ اس سایہ کو اے فوق کہیں ظلِ ہما ہم
بستر ہو اگر یار کی دیوار کے نیچے

عشق کی دنیا میں ہر سو قیس کا چرچا ہے کیا
اس کا میرے نام کے آگے بھلا ٹھہرا ہے کیا

گریۂ حسرت کو کہتا ہے بُرا وہ بے وفا
میرا یہ رونا نہیں اچھا۔ تو پھر اچھا ہے کیا

وہ تری سنتا نہیں کرتا نہیں اقرارِ وصل
یہ بتا اب قصد تیرا اے دلِ شیدا ہے کیا

سامنے آنکھوں کے آجا او بُتِ پردہ نشیں
خانۂ دل میں جو رہتا ہے تو پھر پردا ہے کیا

راستہ کوئے صنم کا جب بتا سکتے نہیں
رہ کے دُنیا میں جنابِ خضر نے دیکھا ہے کیا

۵ دیکھتا ہے فوق کے دل کو جو قاتل بار بار
دل میں اس کے تیر و پیکاں کے سوا رکھا ہے کیا

کوئے بُتاں میں آکے ذرا جی بہل گیا
میں گرتے گرتے منزلِ غم میں سنبھل گیا

دشمن کو سوزِ رشک میں بھی پیچ و تاب ہے
رسّی اگرچہ جل گئی لیکن نہ بل گیا
اب کوئی دوستدار نہیں ہے جہان میں
"وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا"
قلب و جگر ہوئے خس و خاشاک ہجر میں
نالہ بدن میں آگ لگا کر نکل گیا

یہ آرزو تھی فوقؔ فدا کرتے جان تک
وعدہ ہزار حیف ! مگر ان کا ٹل گیا

۶

شروعِ ۱۸۹۶ء میں بوجہ ملازمت جموں کی حویلی راجہ بلدیو سنگھ والئے پونچھ میں میرا قیام تھا۔ میرے والد صاحب قبلہ (مولوی لدھا خان مرحوم) اور میرا چھوٹا بھائی چراغ الدین (مرحوم) بھی بسلسلۂ ملازمت وہیں مقیم تھے۔ ایک دن میاں فیروز الدین صاحب (مرحوم) حاکم اعلیٰ پونچھ خلف میاں نظام الدین صاحب (مرحوم وزیر پونچھ) بتقریب دورہ جموں میں تشریف لائے ان کا قیام بھی اسی حویلی میں تھا۔ جو ایک نہایت پُر فضا مقام پر توی کے کنارے واقع ہے۔ والد صاحب کے ذریعہ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ میاں صاحب مرحوم سخن فہم بھی تھے اور سخن گو بھی۔ انہوں نے میرے ٹوٹے پھوٹے شعر سُن کر میری ہمت بڑھائی۔ شوق اور بھی بڑھا۔ منشی فقیر علی صاحب عاقلؔ سے جو محکمہ پریٹ کے سررشتہ دار تھے۔ شناسائی ہوئی۔ عاقل صاحب کی شاعری کی بھی ابتدا تھی اور میرا شوق بھی روز بروز بڑھ رہا تھا۔ آٹھ دس مہینہ ہی میں غزلوں کا انبار لگا دیا۔ جو اس زمانہ میں "خونِ جگر" تصور کئے جانے کی وجہ سے "حاصلِ زندگانی" سمجھا جاتا تھا۔ بہرحال پرانی غزلیات کا بہت بڑا حصہ جموں ہی کی یادگار ہے۔

کچھ غم نہیں خلاف ہزار آسمان رہے
وہ رشکِ ماہ مجھ پہ مگر مہرباں رہے
گل پر فریفتہ نہ اگر ہو بہار میں
کیوں عندلیب موردِ جورِ خزاں رہے
ہے آرزو کہ ہو یہ سگِ یار کی غذا
یارب چٹے ہما نہ مری استخواں رہے
میں اب تو جان و دل سے خریدارِ عشق ہوں
آئندہ اس میں نفع رہے یا زیاں رہے

یاں دل میں تو ہے یار ترے کوچہ کی آرزو — زاہد رہین الفت حور و جناں رہے

لے فوق قدر اٹھ گئی شعر و سخن کی اب
وہ نکتہ داں رہے ہیں نہ وہ قدرداں رہے

مری جاں پھر گرفتار مصیبت ہونیوالی ہے — پھر ان پُر پیچ زلفوں سے محبت ہونیوالی ہے
خرام ناز سے آتے ہیں وہ گور غریباں پر — کسی بیکس کی اب برباد تربت ہونیوالی ہے
سمائی ہے محبت اک بت کافر کی پھر دل میں — ہمیں دیر و کلیسا سے پھر الفت ہونیوالی ہے
پریرویوں کی آمد کا صبا پہنچا گئی مژدہ — سلیماں کل مزار اب میری تربت ہونیوالی ہے
یہ کُنج باغ یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ گھٹا کالی — الٰہی خیر فاسد میری نیت ہونیوالی ہے

نہیں ہے بے سبب اے فوق اتنا جوش بیتابی
کسی بیدرد سے اب دل کو الفت ہونیوالی ہے

پہروں رو رہا ہوں کلیجہ تھام کے — یاد جب آیا ہے مجھکو "جامکے"لہ
سن تو لو نالے دل ناکام کے — بیٹھ جاؤ گے کلیجہ تھام کے
انقلاب نور و ظلمت ہے حیات — پھنس گئے چکر میں صبح و شام کے
ان کو رکھا اچھی طرح لے بیوفا — دل جگر دونوں ہیں تیرے کام کے
نور و ظلمت یعنی یہ لیل و نہار — شعبدے ہیں چرخ نیلی فام کے

کام کی امید ہے موہوم فوق
رہ گئے ہیں اب مسلماں نام کے

راز شب وصال بتایا نہ جائے گا — ہاں قصۂ فراق چھپایا نہ جائیگا
حسرت بھی کوئی رہ نہیں سکتی ہے بعد مرگ — انساں کے ساتھ کوئی نہ آیا نہ جائیگا
لیکر چراغ شمس و قمر ڈھونڈھے فلک — تجھ سا حسین کوئی بھی پایا نہ جائیگا
میں چاہتا ہوں راز محبت نہو عیاں — کہتا ہے رنگ رخ کہ چھپایا نہ جائیگا

لہ جامکے ایک قصبہ ہے ضلع سیالکوٹ میں جہاں میں ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۳ء تک مڈل سکول میں پڑھتا رہا۔ اب وہ مڈل سکول ہائی سکول ہے۔

اس بیوفا کا ناز اٹھانا تو سہل ہے — لیکن غم فراق اٹھایا نہ جائے گا
کہتے ہیں جب کا دل نہ جلے صورت کباب — جام شراب اس کو پلایا نہ جائے گا
جلدی کرو نہ وصل میں اے فوق اس قدر
۱۰ وہ روٹھ جائیں گے تو منایا نہ جائے گا

جب سے نہاں ہوئی الفت گیسو دل میں — بس گئی نافہ تاتار کی خوشبو دل میں
مجھکو دیوانہ جو سمجھے وہ پری رو دل میں — نکل آئے مری امید کا پہلو دل میں
نہ تسلی ہے نہ آرام نہ قابو دل میں — چھیڑی عشق جفا کار رہے جھاڑو دل میں
ترچھی چتون کی لگاوٹ میں چھری ہے پنہاں — اور کیا سمجھے اسے عاشق ابرو دل میں
داغ دل غیرت خورشید بنا ہے میرا — جلوہ گر جب سے ہوا ہے کوئی مہ رو دل میں
تیغ وہ تیغ جو اک وار میں کر دے بسمل — تیر وہ تیر جو ہو جائے ترازو دل میں
سرو و شمشاد کو گلشن میں نہ دیکھیں گے کبھی — بکے جائیں گے خیال قد دلجو دل میں
یار کی زلف بھی اے فوق ہے کالی دیوی
۱۱ جس کی تصویر لئے پھرتے ہیں ہندو دل میں

ستم دیکھتے ہیں کرم دیکھتے ہیں — تمہاری دو رنگی کو ہم دیکھتے ہیں
جھکا دیتے ہیں سر کو ہم بہر سجدہ — جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
سر بزم سرگوشیاں ہیں عدو سے — اٹھا کر ادھر آنکھ کم دیکھتے ہیں
بتوں کا ہوا عشق اے فوق جب سے
۱۲ ہم آٹھوں پہر رنج و غم دیکھتے ہیں

حال عاشق پر ترس کھاتا نہیں — کوئی اس ظالم کو سمجھاتا نہیں
عشق میں عاشق تو کچھ پاتا نہیں — ہاتھ سے جاتا ہے دل آتا نہیں
بھول جاتے ہیں گلے شکوے تمام — اس کے منہ پر کچھ کہا جاتا نہیں

موت تو ہے اک وصال دائمی — ہیں کبھی مرنے سے گھبراتا نہیں
بزم رنداں میں چلا آتا ہے جب — بے پئے ناصح کبھی جاتا نہیں

۱۳
فوق کہنے کو بہت ہیں رہنما
کوئی اس کو راہ پر لاتا نہیں

وہ کھل کر سامنے آیا تو ہوتا — دوپٹہ رخ سے سرکایا تو ہوتا
کیا انکار سر دینے میں کس دن — کبھی تو قتل کو آیا تو ہوتا
کشش تیری ستمگر جذبۂ دل — کسی کو کھینچکر لایا تو ہوتا
غش آجاتا تو آجاتا بلا سے — کسی نے جلوہ دکھلایا تو ہوتا
اجڑتا تو اجڑتا خانۂ دل — کبھی تو گھر مرے آیا تو ہوتا
نہ جانے دیتے ہم آنکھوں سے باہر — تصوّر یار کا آیا تو ہوتا
تزلزل میں زمیں سو بار آتی — مجھے قاتل نے تڑپایا تو ہوتا
ترا کہنا یقیناً مان لیتا — کبھی اس دل کو سمجھایا تو ہوتا
کسی دن او ستمگر صورت دل — میرے پہلو کو گرمایا تو ہوتا

۱۴
لپٹ کر اپنے فوق خستہ جاں سے
ذرا دشمن کو تڑپایا تو ہوتا

گرمئ مضموں سے دل جلتا ہے ہر انسان کا — آفتاب حشر ہے مطلع مرے دیوان کا
راہ زن آنکھوں سے تیری ہے بہت مشکل بچاؤ — جان کا دل کا جگر کا دین کا ایمان کا
حشر تک کیونکر نہ سینے میں خلش باقی رہے — جب ترازو دل میں ہو کانٹا ترے پیکان کا
صاحب خانہ بنا ہے دل میں گو یاد دل — میزباں کی طرح یاں آیا قدم مہمان کا

۱۵
عشق کی آفت سے ڈرنا چاہئے تجھکو بھی فوق
دل کسی ظالم کو دینا کام ہے نادان کا

سیمتن تو نے جو بھیجا مجھے لکھکر کاغذ
وہ مرے حق میں ہے رشکِ ورقِ زر کاغذ
تجھ پہ تحریر ہیں اوصاف پیمبر کاغذ
آج رتبہ ترا پہنچا ہے فلک پر کاغذ
آفریں اے کششِ شوق ترا کیا کہنا
اڑ کے پہنچا ہے یہاں مثل کبوتر کاغذ
شوق تحریر مضامین وصال ایسا ہے
چھوٹتا ہاتھ سے میرے نہیں دم بھر کاغذ
یار کے چہرۂ روشن کی جو لکھی ہے صفت
ورق مہر سے ہے بڑھکے منوّر کاغذ
یار کو آرزوئے وصل جو لکھی لے فوق
رنگیا دستِ تمنا سے لپیٹ کر کاغذ

۱۶

کروں رازِ دل کو عیاں کس طرح
رکھوں سوزِ غم کو نہاں کس طرح
ذرا اپنے جور و ستم کو تو دیکھ
کرلیتا ہے تو امتحاں کس طرح
ادھر خوفِ گلچیں ادھر بیمِ برق
چمن میں رکھوں آشیاں کس طرح
مجھے فوق ہے ماہ رویوں سے عشق
نہ ہو آسماں بدگماں کس طرح

۱۷

دل و دیں لے اڑی ان کی نظر صاف
نہ ہو یوں بھی کسی کا گھر کا گھر صاف
اگر کچھ بھی نہیں ہے آدمیت
تو پھر انساں بھی ہے اک جانور صاف
وہی منہ پر ہیں جو باتیں ہیں پیچھے
مرا آئینہ رو ہے کس قدر صاف
کبوتر جا چکا لے کر خطِ شوق
کہاں ہیں اس کے ایسے بال و پر صاف

۱۸

کوچۂ جاناں میں لے ہی گئی تقدیر آج
بے طرح دستِ اجل بھی تھا گریباں گیر آج
کہہ رہا ہے ہوشیار اے آسمانِ پیر آج
آتش افشاں ہے ہمارا نالۂ شب گیر آج
بے طلب آئے مرے گھر میں وہ دل تھامے ہوئے
جذبۂ دل نے دکھائی خوب ہی تاثیر آج
یاد رہ رہکر نہ کیوں آئیں عزیزانِ وطن
روکتا ہے ہر قدم پر خارِ دامنگیر آج

یوم حج ہے فوق! دیکھو منظر شان حرم
ایک درویش و غنی کی ہو بیاں توقیر آج

مجھ سا مشتاق ستم جب نہ ملا میرے بعد   چھوڑ دی ترک ستمگر نے جفا میرے بعد
عذر خواہی کے لئے میری لحد پر آیا   بے محل اس کو یاد آئی وفا میرے بعد
روح بے چین ہوئی جسم میں پھر آنے کو   عفو کی یار نے جب میری خطا میرے بعد
جس ستمگر نے مجھے قتل کیا تھا اے فوق
جاوداں وہ بھی تو زندہ نہ رہا میرے بعد

کوچہ میں پری زادوں کے جانا نہیں اچھا   دیوانۂ عشق دل کو بنانا نہیں اچھا
ہر بار مجھے ترچھی نگاہوں سے نہ دیکھو   سیدھا نہ ہو جو تیر چلانا نہیں اچھا
کہتے ہیں مرے درد جدائی کو وہ سنکر   بے لطف یہ قصہ ہے سنانا نہیں اچھا
آتے ہو عیادت کے لئے ساتھ عدو کے   اس طرح مرے دل کو دکھانا نہیں اچھا
ہر طرح کی تکلیف ہے احساس پہ موقوف   اے عشق مرا ہوش میں آنا نہیں اچھا
ہونے لگا اس بت کو بھی اب زعم خدائی
اے فوق وہاں سر کو جھکانا نہیں اچھا

دیا ہر چند میں نے واسطہ گیسوئے جاناں کا   نہ چھوڑا تار کوئی دست وحشت نے گریباں کا
تو تم بھی بہت سچے تمہارے عہد بھی سچے   نہ جامہ مصحف رخ کو عبث پہناؤ قرآں کا
بہائے آنکھ نے شرم گناہ سے اس قدر آنسو   کہ ہر اشک ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا
کلیجہ بھی ہے زخمی دل بھی ہے مجروح سینے میں   مزہ ہم نے اٹھایا ہے تمہارے تیر پیکاں کا
فلک کی سرد مہری کی کوئی پرواہ نہیں ہم کو   جلا دے گا اسے شعلہ ہماری آہ سوزاں کا
خدا نے رشک قمر اے فوق اس بت کو بنایا ہے
مقابل ہو رخ روشن کے کیا منہ ماہ تاباں کا

کس لیے تم دل دکھاتے ہو کسی ناشاد کا
قہر ہوتا ہے اثر مظلوم کی فریاد کا

رحم آجائے نہ اس کو دیکھکر میری تڑپ
یا الٰہی حوصلہ قائم رہے جلاد کا

بارہا ٹالا ہے اس نے وعدۂ دیدار کو
کھیل ہے دل توڑ دینا اس ستم ایجاد کا

شاق ہے اپنی ہی ہستی کا تصور کیوں نہ ہو
قیمتی ہے مجھکو اک اک لمحہ تیری یاد کا

ان کے کانوں پر گراں ہیں فصل گل میں چہچہے
بلبلوں کو مار دے گر بس چلے صیاد کا

۲۳
فوق پھر تیرا سخن مقبول عالم کیوں نہ ہو
فیض ہو تجھ پر اگر کچھ داغ سے استاد کا

نقش پائے رہرواں یہ جسم لاغر ہوگیا
ضعف سے ہم جس جگہ بیٹھے وہیں گھر ہوگیا

مشورے اغیار سے ہوتے تھے جس کے قتل کے
آج وہ دنیا سے رخصت اے ستمگر ہوگیا

نالہائے آتشیں سے جو شرر پیدا ہوا
آسماں پر جا کے وہ مہر منور ہوگیا

وقعت اشک ندامت کوئی دیکھے حشر میں
میری آنکھوں سے گرا جو اشک گوہر ہوگیا

۲۴
فوق حسن یار کے لکھنے لگا اوصاف جب
غیرت تار شعاعی تار مسطر ہوگیا

نہیں ہوتی ہے یکجائی خدا جانے کہاں ہو تم
رہوں کب تک میں سودائی خدا جانے کہاں ہو تم

پتہ کچھ بھی نہیں ملتا بہت کی جستجو میں نے
کہوں کیونکر نہ ہرجائی خدا جانے کہاں ہو تم

عدو کے گھر میں بھی دیکھا مکان دل میں بھی ڈھونڈا
نہ کام آئی شناسائی خدا جانے کہاں ہو تم

بنایا ہم کو وارفتہ یہاں تک وحشت دل نے
کہ خود دل سے صدا آئی خدا جانے کہاں ہو تم

۲۵
تمہارا جلوہ ہے گو فوق کے پیش نظر ہر دم
مگر کہتی ہے بینائی خدا جانے کہاں ہو تم

ہمدم فرقت ترا اے جان کوئی بھی نہیں
دل بہلنے کے لئے سامان کوئی بھی نہیں

یاس و درد و رنج و غم جاتے رہے دل سے کہاں
آج تو گھر میں مرے مہماں کوئی بھی نہیں

مر گیا میں عشق میں خود اپنی گردن کاٹ کر — اے ستمگر اب ترا احسان کوئی بھی نہیں
محو کر دیتی ہیں مجھکو بھولی باتیں یار کی — ورنہ مطلب کے لئے نادان کوئی بھی نہیں
شاعری میں دسترس اے فوق ہے مشکل بہت
۲۶ گرچہ یہ سچ ہے کہ کام آسان کوئی بھی نہیں

احمد نامدار کو دیکھو — رحمت کردگار کو دیکھو
یا نبی بیکسی نے گھیرا ہے — تم مرے حال زار کو دیکھو
خواب میں ہو گئی زیارت شہ — طالع سازگار کو دیکھو
شاہ دیں سے کہونگا محشر میں — بندۂ جاں نثار کو دیکھو
یا حبیب الہ اب للہ
۲۷ فوق سینہ فگار کو دیکھو

مرے گھر بے بلائے آئے ہیں وہ — دل بے تاب کی تاثیر دیکھو
وہ مجھ سے اور کھنچتے جا رہے ہیں — یہ اُلٹی آہ کی تاثیر دیکھو
شبیہہ یار کا کھنچنا نہیں سہل — مصور خود بنا تصویر دیکھو
کہاں ہے فوق کے سینے میں اب دل
۲۸ نہ باور ہو تو پہلو چیر دیکھو

کوچۂ قاتل سے میں زندہ نکل سکتا نہیں — بات یہ سچ ہے اجل کا وقت ٹل سکتا نہیں
ان سے جو عہد وفا ہے اب وہ ٹل سکتا نہیں — پاؤں راہ عشق میں اپنا پھسل سکتا نہیں
جو مری تقدیر میں لکھا ہے وہ پیش آئیگا — زور کچھ تدبیر کا قسمت سے چل سکتا نہیں
پانی پانی کوہ بھی ہوتا ہے سنکر حال فوق
۲۹ لیکن اس بت کا دل سنگیں پگھل سکتا نہیں

ہو لے کے یہ ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے جو کوئے جاناں سے آ رہے ہیں
کسی کی تقدیر سو رہی ہے اُسی کو گویا جگا رہے ہیں

تمام ناقوس بُتکدوں میں یہ شور ہر دم مچا رہے ہیں!
بُتوں کو خوف خدا نہیں ہے زمانے بھر کو ستا رہے ہیں

کبھی تو حیرت ہے جلوہ گہ میں کبھی غشوں پہ غش آ رہے ہیں
تمہارے غمزے تمہارے جلوے ہمیں تماشا دکھا رہے ہیں

حجاب و بے پردگی کے منظر حسین کیا کیا دکھا رہے ہیں
چھپا چھپا کر دکھا دکھا کر ہمارے دل کو لبھا رہے ہیں

اٹھو بھی اے فوق سب مسافر وہ بستر اپنے اٹھا رہے ہیں
یہ خواب غفلت رہے گا کب تک جو جانے والے ہیں جا رہے ہیں

کہاں میسر ہے خواب راحت الم کے کشتوں کو قبر میں بھی
وہ خفتگان عدم کو ٹھوکر لگا لگا کر جگا رہے ہیں

یہ کیا ستم ہے یہ کیا جفا ہے یہ کیا نظر ہے یہ کیا دغا ہے
کہ میرے پہلو میں بیٹھ کر وہ عدو سے آنکھیں لڑا رہے ہیں

کہاں یہ ممکن کہ مہربانی سے کوئی دل کی لگی بجھائے
یہ شمع رُو ہیں بڑے ستمگر ہمارے دل کو جلا رہے ہیں

بچھاؤ اے فوق راستے میں آج اپنی مشتاق دید آنکھیں
خبر ملی ہے کہ اس گھڑی وہ اسی طرف اُٹھ کے آ رہے ہیں

وفا کی ہم نے اس بُت نے جفا کی
سر آنکھوں پر جو مرضی ہے خدا کی

کسی پہلو نہیں آتا مجھے چین
شب فرقت ہے یارب کس بلا کی

نظر آئی نہ وہ زلف سیہ تاب
نماز شام بھی ہم نے قضا کی

تقابل تیری زلف عنبریں سے؟ سراسر ہے خطا مشک خطا کی

۱۳ زکوٰۃ حسن کا ہے فوق سایل
صدا سن لیجئے اپنے گدا کی

سینکڑوں جاتے ہیں چھک کر ترے میخانے سے — تجکو کیا ملتا ہے ساقی مرے ترسانے سے
راہ پر شیخ نہ آؤں ترے بہکانے سے — تا دمِ مرگ نہ نکلوں کبھی میخانے سے
مری حالت کو دمِ نزع جو آکر دیکھا — وہ بھی غم سے کے سدھارے مرے غم خانے سے
بے تعصب ہوں مجھے عشق رخ و گیسو ہے — انس کعبہ کی طرح رکھتا ہوں بت خانے سے
کام کچھ سہل نہیں عشق میں جل کر مرنا — سوز الفت کا مزہ پوچھئے پروانے سے
کفر و اسلام سے ہے مذہب عشاق جدا — ہم کو کعبہ سے تعلق ہے نہ بت خانے سے

۳۲ تنگدستی میں کسی نے بھی نہ پوچھا اے فوق
کام نکلا کبھی اپنے سے نہ بیگانے سے

دعا ہے عشق میں یارب نہ دم نکلے نہ غم نکلے — کہ ہجر و وصل کے ارمان کیا نکلے جو کم نکلے
ملایک نے سحر میں آکے جب دیکھا عمل نامہ — بُرے اعمال دفتر میں ہمارے یک قلم نکلے
ہمارا نالۂ پرشور ایسا شور کرتا ہے — کہ جس سے صورِ اسرافیل کا بھی دم میں دم نکلے
کسے معلوم تھا ادب سمجھے گا دل تو پھر نہ نکلیگا — قیامت کے تری زلفوں میں کافر پیچ و خم نکلے
تمنا ہے وہ رکھدے پاؤں سینہ پر دمِ رحلت — ہماری جان مضطر یار کے زیر قدم نکلے
کیا تقدیر نے دونوں کو بے حرمت زمانہ میں — کہ آدم خلد سے نکلے ترے کوچے سے ہم نکلے
نہیں غدار نزاکت قتل میں سخت جاں میں ہوں — ذرا ہو جنبش ابرو تو آسانی سے دم نکلے
بت کافر ترے قرآں اٹھانے کا یقیں کیا ہو — سب اے پیماں شکن جھوٹے ترے قول و قسم نکلے

۳۳ ہمیں اے فوق سبقت لیگئے فرہاد و مجنوں پر
کہ راہ عشق میں ہم ان سے آگے دو قدم نکلے

تم نے غصے میں کبھی آنکھ لڑائی ہوتی	اسی صورت سے مجھے شکل دکھائی ہوتی
پھر کسے اپنا بناتے وہ اکیلے رہکر	کاش میری ہی طرف ساری خدائی ہوتی
اے صبا خاک جو کرنی تھی ہماری برباد	کوچۂ یار میں لے جاکے اڑائی ہوتی
خلق کو ظلم سے کرتے یہ ستمگر برباد	ان کے قبضہ میں اگر ساری خدائی ہوتی

(۳۴) ہم کو اے فوق سنانے سے ہوا کیا حاصل
داستاں غم کی اسی بُت کو سنائی ہوتی

مزارِ پاک ختم المرسلینؐ سے	فلک کو شرم آتی ہے زمیں سے
ڈرا سے دل پیچ زلفِ عنبریں سے	کہ اندیشہ ہے مارِ آستیں سے
دل پُر درد سے نکلی ہے فریاد	گذر جائیگی تو یہ عرش بریں سے
تمہیں ظالم کہا تو کیا غلط ہے؟	عیاں ہے شانِ صفا کی جبیں سے

(۳۵) اگر اسلام کا دعوےٰ ہے اے فوق
محبت رکھ شہِ دنیا و دیں سے

مضطرب عشق نے کر دی ہے طبیعت میری	برق و سیماب سے کچھ بڑھکے ہے حالت میری
بہ گئے آنسوؤں کے ساتھ جگر کے ٹکڑے	لٹ گئی دیکھتے ہی دیکھتے دولت میری
رہ گئے تا بہ لبِ گور عزیز و احباب	کی تیرے غم نے بس مرگ رفاقت میری
حشر کے دن بھی ہے گا دہی ظلمت کا حجاب	ساتھ جائیگی وہاں بھی شبِ فرقت میری

(۳۶) داغ کا فیض اگر یونہیں رہیگا اے فوق
مان جائیں گے سخن سنج فصاحت میری

غزل ۳۷ لاہور کے ایک دوست کی فرمایش سے جموں ہی میں لکھی گئی اس میں قابل ذکر بات یہ ہے۔ کہ ہر شعر کے پہلے مصرعہ کا پہلا حرف لینے سے ایک نام "گوبند لال" نکلتا ہے۔

گاتے ہیں ساز کے پردے میں یہ گانیوالے
اک نظر دیکھتا جا روٹھ کے جانے والے

وائے تقدیر نہ نکلا کوئی ارمان وصال
روٹھے ہیں عیش کو مٹی میں ملانے والے

بھر لیا سینے کے دامن کو ترے تیروں سے
میرا دل دیکھ مرے دل کو ستانے والے

ناز سے کیا دل غمناک کی حالت پوچھی
مَیں تصدق مرے روٹھے کو منانیوالے

دونوں ہاتھوں سے جگر تھام کے چپ بیٹھے ہیں
درد دل یونہی سناتے ہیں سنانے والے

لائیے آفت تازہ کوئی لانا ہے اگر
کہتے ہیں دل کو مصیبت میں پھنسانے والے

آخری وقت ہے آجاؤ عیادت کے لئے
جانب ملک عدم جاتے ہیں جانے والے

لکھی ہے صنعت توشیح میں اے فوق غزل
نام اس طرح بتاتے ہیں بتانے والے

(۳۷)

[illegible]

فسانہ ترے حسن کا کو بکو ہے
ہر اک شے میں جلوہ نما تو ہی تو ہے

نہ پامال کر دیکھ اس کو ستمگر
یہ وہ دل ہے جس میں تری آرزو ہے

تصور ترے قد کا ہے چشم تر میں
کہ سرو ایستادہ لب آب جو ہے

وہ فرماتے ہیں پی بھی لے آب خنجر
بہت دیر سے خشک تیرا گلو ہے

نبھے گی بتا کس طرح فوق تیری
کہ تو صلح جو ہے وہ بت جنگ جو ہے

(۳۸)

[illegible]

خال کا دانہ تہ ابرو نظر آیا مجھے
آج زیر تیغ اک ہندو نظر آیا مجھے

جب سنا اے رشک مسیحا تو نظر آیا مجھے
درد سے دل اپنا بے قابو نظر آیا مجھے

سرمہ ساں بس کر سما جاؤں کسی کی آنکھ میں
آنکھ میں رہنے کا یہ پہلو نظر آیا مجھے

ہو گیا ثابت کہ ہے غارت گر ایماں وہ بت
ہر مسلماں صورت ہندو نظر آیا مجھے

جس کو عالم کہتے ہیں پرتو ہے تیری ذات کا
میں نے دیکھا جس طرف بس تو نظر آیا مجھے

آگیا دل زیر مشق حسب نگاہ ناز کا
ناوک دلدوز ہم پہلو نظر آیا مجھے

آج پہنچا ہے فلک پر فوق میرا بھی دماغ
(۳۹)
ہم بغل الفت سے وہ مہ رُو نظر آیا مجھے

لطف ہے پیرِ مغاں دے پھر کوئی ساغر مجھے
مست کر دے تا خیالِ ساقیِ کوثر مجھے

روضۂ حضرت کا شوقِ دید ہمدم کچھ نہ پوچھ
اُڑ کے میں فوراً پہنچ جاتا جو ملتے پر مجھے

بے نیاز فرش مخمل ہوں گدائے شاہ ہوں
خاکِ یثرب کا فقط درکار ہے بستر مجھے

فوق اندیشہ نہیں روزِ قیامت آنے دے
(۴۰)
بخشوا لیں گے خدا سے شافعِ محشر مجھے

غزل ۱۲ جولائی یا اگست ۱۸۹۶ء میں جموں ہی میں کہی گئی تھی لیکن عرصہ تک نظر انداز رہی۔ آخر جب میں ۱۸۹۷ء میں لاہور آیا اور حضرت داغ مرحوم سے استفادہ حاصل کرنے کی خواہش ہوئی تو آپ نے تحریر فرمایا۔ ایک غزل نمونہ کے لئے بھیج دو۔ تاکہ تمہاری طبیعت کا اندازہ لگایا جائے۔ چنانچہ یہی غزل داغ مرحوم کو اصلاح کے لئے بھیجی گئی آپ ان دنوں بیمار تھے۔ آپ نے اصلاح دی اور تحریر فرمایا "میں تمہاری طبیعت سے بہت خوش ہوا۔ میں مر کر بچا ہوں۔ اس واسطے جواب میں دیر ہوئی۔ ابھی تک صحت کامل نہیں"۔
فصیح الملک داغ دہلوی۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء حیدرآباد دکن۔

ہائے اتنا بھی اثر نالۂ سوزاں میں نہیں
کہ ذرا جائے ترحم دلِ جاناں میں نہیں

نالہ و آہ و فغاں شیون و بے تابیٔ دل
کون سا شغل ہے جو فرقتِ جاناں میں نہیں

اے صبا تجھ سے کھلیگی نہ مرے دل کی کلی
میں ہوں اس گل پہ تصدق جو گلستاں میں نہیں

تجھ پہ عالم ہے فدا اس پہ زلیخا عاشق
بات جو تجھ میں ہے وہ یوسفِ کنعاں میں نہیں

آفریں ہے مرے تلوؤں کو جنوں کر شاباش
نام کو بھی کوئی اب خار بیاباں میں نہیں

اب کہاں کاتبِ اعمال کریں گے تحریر
خالی کوئی بھی جگہ نامۂ عصیاں میں نہیں

خود ہی منظور نہیں آپ کو ملنا ورنہ
کون سی بات ہے جو آپ کے امکاں میں نہیں

فوق کانٹوں کی طرح دل میں کھٹکتے ہیں یہ گُل
(۴۱)
غیرتِ گل جو مرا آج گلستاں میں نہیں

میہماں آ کے جو وہ رشکِ گلستاں ہوگا — گھر مرا رشکِ وہ روضۂ رضواں ہوگا
طالبِ زخم ہیں میرے جگر و دل دونوں — اے فلک تو ہی بتا کس کا وہ مہماں ہوگا
دل کے دنیا کے پرے دمجھے مٹی دیں گے — آج تابوت مرا تختِ سلیماں ہوگا

ان بتوں سے جو کریگا تو محبت اے فوق
(۴۲)
پھر نہ تو ہوگا نہ دیں ہوگا نہ ایماں ہوگا

غزل ۴۳ قیامِ جموں کی آخری غزل ہے۔ حضرت احسان شاہجہانپوری مرحوم نے ارمغان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ شاہجہانپور سے جاری کیا تھا۔ یہ غزل اسی کے مصرع طرح پر ہے۔

زاہد مرے ساتھ نئے تو بہ شکن ہوا — انکار مے پہ ساغر مے خندہ زن ہوا
صحرا نشین بھی بھاگتے ہیں مجھ سے دشت میں — جب آیا میرے سامنے مجنوں ہرن ہوا
احباب بدحواس ہوئے ایسے بعد مرگ — تربت کی فکر کی نہ خیال کفن ہوا
ناز و نیاز عاشق و معشوق دیکھئے — بلبل کے اشک گر پڑے گل خندہ زن ہوا
کرنے لگا جو لذتِ تیغ ستم بیاں — پُرخوں ہمارے زخمِ جگر کا دہن ہوا
دیوانہ وار دیکھتا ہوں سب کو بزم میں — نظارہ کس پری کا سرِ انجمن ہوا

ہر روز سیر باغ کو جاتے ہیں اب تو فوق
(۴۳)
کس گلبدن کی یاد میں شوق چمن ہوا

ستمبر ۱۸۹۶ء میں ملازمت جموں کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد میں گھوڑتل ضلع سیالکوٹ چلا گیا۔ ۱۸۹۶ء کی آخری سہ ماہی ۱۸۹۷ء کے ایام بھی یہیں گذارے۔ ۴۳ تک کا جو کلام ہے وہ ارمغان کے مطرحہ مصرعوں پر ہے باقی کلام متفرق ہے۔

بتوں نے دوستی کی دشمنی میں
کہ ساری حسرتیں جی کی جی میں

اشارے کرتی ہے وہ شوخ چتون
لہو ہوگا کلیجہ عاشقی میں

الگ بیٹھے ہوئے ہو منہ بنا کر
بگڑتا ہے کوئی یوں دل لگی میں

ملایا تو نے اس مہ سے نہ اے چرخ
رہے ارمان میرے جی کے جی میں

بت ناداں نے منہ دیکھا تو بولا
کوئی میٹھا ہو ایسے آرسی میں

مزے ملتے ہمیں لطف و ستم کے
جو ہوتی دلدہی بھی دلبری میں

تمہیں خود گالیاں دیتے ہو ہم کو
تمہیں خود روٹھ جاتے ہو ہنسی میں

حسینوں کی محبت چھوڑ دو فوق
وفاداری نہیں باقی کسی میں (۴۳)

مانند دہن شکوہ قاتل کے لئے ہے
صورت یہی زخم دل بسمل کے لئے ہے

حیرت زدہ دل کو مرے آئینہ بنا تو
اک چیز یہ آرائش محفل کے لئے ہے

اے چرخ مجھے ڈال کے آفت میں نہ خوش ہو
آسانی بھی آخر مری مشکل کے لئے ہے

تھم تھم کے کریں ذبح وہ رک رک کے کریں قتل
تدبیر یہ بے تابئ بسمل کے لئے ہے

دم بھر بھی تو وہ ہوش میں آنے نہیں دیتے
اچھی یہ سزا فوق سے غافل کے لئے ہے (۴۴)

اظہار غم عشق بیاں ہو نہیں سکتا
وہ حال ہے دل کا کہ بیاں ہو نہیں سکتا

ہم چشم تصور سے اسے دیکھ ہی لیں گے
پردے میں رہے لاکھ نہاں ہو نہیں سکتا

دل لیکے بھی ناداں بنے بیٹھے ہیں معشوق
اس طرح کہ چوری کا گماں ہو نہیں سکتا

بھڑکیگی اگر آتش غم ضبط کروں گا
اس آگ کے شعلے سے دھواں ہو نہیں سکتا

میخانے میں عزت نہیں دستار کی زاہد
بے ساغر دیے پیر مغاں ہو نہیں سکتا

اے فوق تو کچھ پوچھ نہ قصہ مرے دل کا (۴۵)
یہ حال ہے ایسا کہ بیاں ہو نہیں سکتا

بے خود آخر ارنی گو کو کیا تھا کس نے — تم نہیں تھا تو دکھایا تھا یہ جلوا کس نے؟
گر گئی خاک ہمیں برق تجلیٔ جمال — طور کا آج دکھایا ہے تماشا کس نے؟
تم وہی ہو کہ نگاہوں میں رہے ہو برسوں — تم کو ہم نے نہیں دیکھا ہے تو دیکھا کس نے؟

شکر ہے کہتے ہیں اب تو وہ اٹھا کر چلمن (۴۶)
تم سے اے فوق کیا ہے کبھی پردا کس نے؟

بیٹھا ہوں میں نقش کف پا بن کے زمیں سے — کیا پائیں گے جز خاک وہ مجھ خاک نشیں سے
کیونکر ہو الگ گردن عشاق حسیں سے — خنجر کو چلی جاتی ہے کچھ لاگ انہیں سے
گمنام ہی رکھیگا زمانہ مجھے شاید — مٹ جاتا ہے بنتے ہی مرا نقش نگیں سے
گر بڑھ کے پہنچ جاؤں کبھی یار کے در تک — امید وفا کی ہو اگر جان حزیں سے
آنے کو ہے وہ شوخ یہاں بہر عیادت — ہیں طالب مہلت ہوں دم باز پسیں سے

اے فوق انہیں غیر کی خاطر جو ہے منظور (۴۷)
کرتے ہیں سر بزم وہ تکرار ہمیں سے

جو نار اس کے عشق کی ہے جو دل پر لگی ہوئی — تا مرگ یہ رہے گی برابر لگی ہوئی
شکوے تو ہیں ہزاروں گراں سے روبرو — مہر سکوت ہے مرے لب پر لگی ہوئی
سوز الم نے دل کو جگر کو جلا دیا — اے ہم نفس یہ آگ ہے گھر گھر لگی ہوئی

اے فوق دختِ رز کو کہوں کیا بقول ذوق (۴۸)
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جو تیغ جفا سے کبھی بسمل نہیں ہوتا — الفت کے شہیدوں میں وہ داخل نہیں ہوتا
گو سارے زمانہ کو بھلایا مرے دل نے — لیکن وہ تیری یاد سے غافل نہیں ہوتا

کھاتا نہیں جو تیشۂ اُلفت کا کبھی زخم — فرہاد کا رتبہ اسے حاصل نہیں ہوتا
جس نے تیری فرقت میں اٹھائے نہوں صدمے — وہ تیری ملاقات کے قابل نہیں ہوتا
اے فوق نہ ہونا الگ اب اس دشمن جاں سے
(۴۹) مل جاتا ہے جو دل کبھی الگ نہیں ہوتا

بیمارِ عشق ابروِ خمدار مر گیا — یعنے حریص لذتِ آزار مر گیا
کوے صنم میں جاتے ہی نکلی بدن سے جان — دارالشفا پہنچتے ہی بیمار مر گیا
چشم ولب نگار سے اپنا دل حزیں — سو بار زندہ ہو گیا سو بار مر گیا
نفرت تھی جس غریب کے سائے سے آپکو — خوش ہو جیے کہ وہ پس دیوار مر گیا
نکلا نہ فوق کوچۂ ساقی سے جیتے جی
(۵۰) آخر کو میکدے ہی میں میخوار مر گیا

کہیں عشق ہے اور کہیں حسن تو ہے — کہیں شور بلبل کہیں رنگ و بو ہے
کہوں کس طرف چشم مشتاق دیکھے — کہ جلوہ ترا جلوہ گر چار سو ہے
کہیں گریۂ چشم یعقوب بیدل — کہیں جلوۂ یوسف خوب رو ہے
کہیں بطن ماہی میں یونس بنا تو — کہیں دوست ہے تو کہیں تو عدو ہے
کہیں طور پر ہے تو برق تجلی — کہیں اپنی ہی دید کی آرزو ہے
کہیں بن کے مجنوں تو جنگل میں آیا — کہیں مثل لیلےٰ ہوا روبرو ہے
کہیں بن کے فرہاد تیشہ چلایا — کہیں حسن شیریں کہیں جنگجو ہے
کہیں تو انا الحق کے پردے میں ظاہر — کہیں بن کے منصور سولی پہ تو ہے
نہاں ہو کے اوجھل ہوا آنکھوں سے لیکن
(۵۱) تو ہر رنگ میں فوق کے روبرو ہے

۱۱ جنوری ۱۸۹۶ء کو میں لاہور پہنچا۔ ان دنوں نواب غلام محبوب سبحانی مرحوم

اور خان احمد حسین خان صاحب بی اے (سابق ہنٹر سب جج و ایڈیٹر شباب اردو) کی توجہ اور کوشش سے بھاٹی دروازہ کے اندر انجمن مشاعرہ اتحاد کے جلسے بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ فروری ۱۸۹۶ء کی کسی تاریخ کو مصرع طرح "گھونگٹ پری رخوں کا ہے ٹٹی شکار کی" پر مشاعرہ تھا۔ میری عمر اس وقت بیس سال کی تھی کسی مشاعرہ میں غزل پڑھنا میرے لئے بالکل نئی بات تھی۔ اور اس حجاب کے علاوہ اجنبیت سب پر مستزاد تھی باوجود اس کے ابتدائی شوق بلکہ خبط کے تصدق سے مشاعرہ میں گیا۔ اور ایک نہیں دو غزلیں پڑھیں۔ ایک مقید قافیہ مزار اور ایک عام قافیہ پر۔ سامعین نے داد دی۔ بعض شعر دو بارہ سہ بارہ سنے گئے۔ اس کے بعد ہمت بندھ گئی۔ اور ہر مشاعرہ میں شامل ہوتا رہا۔ منشی رحیم بخش صاحب رمز (مرحوم) جو میرے ہموطن اور ہم سکول تھے۔ اور یہاں ایف۔ اے کلاس میں پڑھا کرتے تھے۔ اکثر مشاعروں میں میرے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔

بعد فنا تڑپ ہے دل بیقرار کی (مطلع) ہے زلزلے میں خاک زمین مزار کی

وہ ٹھوکروں سے اور ملاتے ہیں خاک میں — مٹی خراب کرتے ہیں میرے مزار کی

کیونکر نہ اے صبا ترا احسان مند ہوں — لائی ہے کوئے یار میں مٹی مزار کی

او بانئے ستم اسے ٹھکرا نہ بار بار — مٹی خراب ہوگی ہمارے مزار کی

اپنے کہاں نصیب کہ ہو روشنی نصیب — جلتے ہی شمع بجھ گئی میرے مزار کی

اے ذوق دل کے داغوں سے وہ روشنی ہوئی
پر نور ہے زمین بھی میرے مزار کی (۵۲)

فرقت ہوئی بدن سے مری جان زار کی — یا ہو گئی ہے باغ سے رخصت بہار کی

حالت بہت ردی ہے دل بیقرار کی — اب لطف کے ستم ہوں خدا لیں ہجر یار کی

واعظ سنا کچھ اور کہیں سے یہ دل ڈرے — محشر تو ایک طرز ہے رفتار یار کی

آتی ہے ہوائے خزاں کچھ اگر یونہیں — اڑ جائے گی چمن سے یہ رونق بہار کی

میں اور ان سے پھیر لوں دل کو محال ہے ناصح نہیں یہ بات مرے اختیار کی
صیاد اب تو کھول دے للہ میرے پر سنتا ہوں دھوم آمد فصل بہار کی
قاصد ترے بیان میں کچھ لطف اور ہے سچ کہہ یہ بات تیری ہے یا اس نگار کی
کہئے نہ دشمنوں سے مرے دل کا حال زار پردہ دری نہ کیجئے اس پردہ دار کی
میں تجھ سے بدگماں ہوں تو شکوے کی کیا جگہ کوئی بھی تو نے بات کہی اعتبار کی
گیسو کو چھوڑتے نہیں رخ پر شب وصال تصویر کھینچتے ہیں وہ لیل و نہار کی

اے فوق شاعری کو ادب سے سلام کر
(۵۲)
صورت نکال جا کے کہیں روزگار کی

جس جگہ جلوۂ محبوب خدا ہوتا ہے وہ مکاں عرش سے رتبہ میں سوا ہوتا ہے
یاد گیسوئے سیہ تاب میں گھبراتا ہوں رات کا آنا مرے سر پہ بلا ہوتا ہے
جسم اور روح کی فرقت سبب غم ہے مگر چھوٹنا یار کا اس سے بھی برا ہوتا ہے
تجھکو لذت کے لئے چھیڑیں گے او شیریں لب تیری گالی میں بھی شکر کا مزا ہوتا ہے
میرے گھر آتے نہیں غیر کے گھر جاتے ہیں آپ کا وعدہ اسی طرح وفا ہوتا ہے

فوق کا خون ذرا دیکھ ملا کے قاتل
(۵۳)
شوخ کس طرح ترا رنگ حنا ہوتا ہے

غزل ۵۴ ۵ مارچ ۱۸۹۷ء میں بمقام لاہور رسالہ ارمغان شاہجہانپور کے مصرع طرح بابت ۱۸۹۷ء کے لئے لکھی گئی۔

نالہ و زاری رہے ماتم رہے خون حسرت ہو تو برسوں غم رہے
خندۂ گل گریۂ شبنم رہے ہنسنے رونے کا یہی عالم رہے
عشق میں خالی رہے کیوں گھر مرا یا کسی کی یاد ہو یا غم رہے
ہمرہانِ قافلہ سے کہہ صبا گرہی رفتار ہے تو ہم رہے

کہتے ہیں وہ سینکڑوں ہیں غمزدہ — اک تمہیں کیا مبتلائے غم رہے

قتل میں قاتل کو ہے عجلت بہت — کس طرح چلنے سے خنجر تھم رہے

فوق جھک کر قتل گہ میں زیر تیغ

(۵۴)

سر برآوردہ جہاں میں ہم رہے

۱۸۹۶ء میں بہ سرپرستی میرزا ناظر حسین خان ناظم لاہور میں ایک اور مشاعرہ بنام مشاعرہ قیصری خوب دھوم دھام سے ہوتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناظم صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے خوش وضع خوش گو اور خوش باش شاعر تھے ۔ ان کے شاگرد ابھی تک لاہور میں موجود ہیں ۔ پہلے ایک ہی مشاعرہ تھا لیکن بعد میں شاعرانہ نوک جھوک کی وجہ سے دو پارٹیاں بن گئیں ۔ ایک نے اپنا مشاعرہ زیر اہتمام منشی احمد حسین خان و بہ سرپرستی نواب غلام محبوب سبحانی جاری کر دیا ۔ جہاں میرزا ارشد مرحوم کے شاگرد اور مداح کثرت سے آیا کرتے تھے ۔ اور دوسرا ناظم صاحب نے قیصری کے نام سے الگ قائم کر دیا ۔ نوک جھونک کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ ناظم صاحب کے ایک شاگرد (غلام حسین خان) کا تخلص ارشد اور ارشد صاحب کے ایک شاگرد (منشی غلام محمد) کا تخلص ناظم رکھا گیا ۔ مشاعرہ قیصری کے ۱۸۹۶ء کے کسی مہینہ کے مصرع طرح پر میں نے بھی ایک غزل لکھی اور پڑھی ۔ مصرع طرح کا ردیف قافیہ "ماتم کے لئے شبنم کے لئے" تھا

وقف ہے یہ جان حزیں آلام پیہم کے لئے (مطلع) غم مرے دل کیلئے ہے دل مرا غم کیلئے

گھر عدو کا ڈھونڈھتی پھرتی ہے میری آہ گرم — نکلے ہیں نالے تلاش عرش اعظم کے لئے

آسماں نے آبیاری کی جو باغ دہر کی — کھل گئے غنچوں کے منہ گلشن میں شبنم کیلئے

کیوں شب و روز شب کی محنت سے ہمیں روزی ملے — جب مقدر ہے مشقت ابن آدم کے لئے

زخم دل میرے ہنسی اس پر اڑائیں گے بہت — ہمدمو تکلیف کیوں کرتے ہو مرہم کے لئے

فوقؔ سے ناشاد مکھواں تب کو بل جائیں گے

۵۵،

اس قدر ہے کیوں تردد اس کے ماتم کیلئے

جولائی ۱۸۹۷ء کی گرمیاں تھیں، میں ان دنوں پیسہ اخبار میں کام کرتا تھا۔ دفتر سے واپس آیا۔ تو رسالہ ارمغان ملا جس میں اگست کے پرچہ کے لئے یہ مصرع طرح تھا "ع مرا دل اور تیری آرزو ہو"۔ آج لاہور شہر کے گرد جو میونسپل باغات ہیں۔ وہ بہت خوبصورت اور ہموار اور ان کی سڑکیں ایک فرحت بخش سیرگاہ کا کام دیتی ہیں۔ ان دنوں یہ حالت نہ تھی۔ درخت نہایت گنجان تھے۔ اور سیرگاہ تو کہیں نام کو بھی نہ تھی میں ارمغان کا پرچہ لیکر دہلی دروازہ کے باہر بائیں طرف کے باغ میں ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ اور وہاں مصرع طرح پر حسبِ ذیل چند شعر موزوں کیے۔

جنابِ مصطفےٰ کا جو عدو ہو / وہ کس منہ سے خدا کے روبرو ہو
ہے جوشِ جنوں بعد فنا بھی / پریشاں خاک میری کو بکو ہو
عبث ہو بخیہ گر کرنا ہے محنت / یہ وہ دامن نہیں جس میں رفو ہو
ہے تا صبحدم اصرار و انکار / شبِ وعدہ مزے کی گفتگو ہو
مبارک ہو تجھی کو حور زاہد / دعا کرتا ہوں اور وہ ماہرو ہو
اڑائی خاک چھانے کوہ و صحرا / جو مل جاؤ تو کیوں یہ جستجو ہو
تمہیں چاہوں امیدِ وصل کے ساتھ / مجھے اپنی غرض کی آرزو ہو

مزہ لے فوقؔ جب ہے دل لگی کا

۵۶،

کہ میں ہوں صلح جو وہ جنگ جو ہو

ایمان میرا۔ بیابان میرا ۲۷ الی غزل جولائی یا اگست کے پیامِ یار کے کسی مصرع طرح پر ہے بیاض میں نقل کی تاریخ ۲۷ ستمبر ۱۸۹۷ء بروز ہفتہ درج ہے۔ "پریشان ہوا" اور "پیغمبر خدا" والی نعتیں بھی انہی ایام میں بمقام لاہور لکھی گئی تھیں۔

حبیب ہے اللہ نگہباں میرا   بُت ہو کیوں دشمن ایماں میرا
جوشِ وحشت میں ہے جنت کی بہار   حُور کا دل ہے بیاباں میرا
بلبلِ باغ محمدؐ ہوں میں   دشت یثرب ہے گلستاں میرا
کوئی طوفان ہی کر دے نہ بپا   ہجر میں دیدۂ گریاں میرا
کوئی پیمانہ لیے آتا ہے   ٹوٹنے والا ہے پیماں میرا
پند بے جا ہے تری اے ناصح   اور ہے حال پریشاں میرا
سینہ داغوں سے بھرا رہتا ہے   تر و تازہ ہے گلستاں میرا
خوف سے شہر کی جانب بھاگے   قیس دیکھے جو بیاباں میرا
دستِ وحشت نے لیے وہ لتّے   پرزے پرزے ہے گریباں میرا

شافعِ حشر نبی ہیں اے فوقؔ
(۵۷)
ہیچ ہے دفترِ عصیاں میرا

دل جو سودا زدۂ گیسوئے پیچاں نہ ہوا   جسمِ خاکی کا غبار آہ پریشاں نہ ہوا
زلف و رخسار سے بیگانہ رہا دل میرا   شکر ہے شیفتۂ سنبل و ریحاں نہ ہوا
شوق لے کوچۂ محبوب میں خود پہنچایا   حضرت خضر کا مجھ پر کوئی احساں نہ ہوا
وہ زلیخا کا ہے معشوق یہ محبوبِ خدا   ماہِ یثرب کا مقابل مہِ کنعاں نہ ہوا
پہنچی ہے ہند سے یورپ میں ضیائے اسلام   کس جگہ نور ترے دیں کا نمایاں نہ ہوا
یاد ہے دل میں شہِ ہر دو سرا کی ہر دم   جب سے آباد ہے یہ گھر کبھی ویراں نہ ہوا
فرقتِ شاہ میں جینے سے ہے مرنا بہتر   عاشقِ سرورِ دیں موت سے ترساں نہ ہوا

اے طبیبو اسے یثرب میں پہنچ جانے دو
(۵۸)
ہند میں فوقِ جگر خستہ کا درماں نہ ہوا

حاصل ہے دل کو الفتِ پیغمبرِ خدا   یہ بھی ہے ایک رحمتِ پیغمبرِ خدا

دو طفل مردہ کر دیئے زندہ حضور نے — معجز نما ہے دعوت پیغمبر خدا
ہوگی ضرور امت سرور مقیم خلد — مقبول ہے شفاعت پیغمبر خدا
مقبول بارگاہ الہٰی ہے وہ بشر — پائی ہے جس نے صحبت پیغمبر خدا
ہر گل چمن میں طبلۂ عطار بن گیا — پہنچی وہاں جو نکہت پیغمبر خدا
دونوں جہاں میں اس کا ٹھکانا کہیں نہیں — جس دل میں ہے عداوت پیغمبر خدا
پہنچا دے مجھکو روضۂ انور پہ اے نصیب — کب تک رہیگی فرقت پیغمبر خدا
قرآن و آل چھوڑ گئے آپ خلق میں — امت نے پائی دولت پیغمبر خدا
اے فوق خلد کی ہے اگر تجھکو آرزو
(۵۹)
دل سے نہ جائے الفت پیغمبر خدا

فروری ۱۹۰۸ء کے رسالہ ارمغان شاہجہانپور کے مصرع طرح ع "ملک سخن سے آصف عالم پناہ کا" نے دنیائے شاعری میں ایک دھوم مچا دی تھی۔ یہ مصرع شہریار دکن ہز ہائینس میر محبوب علیخان غفران مآب (موجودہ نظام دکن ہز اگزالٹیڈ ہائینس میر عثمان علیخان بہادر کے والد) کی ذات گرامی کے متعلق تھا۔ ارمغان کے تین چار رسالے متواتر اسی "طرح" پر شائع ہوتے رہے۔ لاہور میں میری تحریک سے جنوری ۱۹۰۹ء میں اسی "طرح" پر انجمن اتحاد کا ایک عظیم مشاعرہ بھاٹی دروازہ کے اندر ہوا۔ اکثر حضرات نے غزلیں پڑھیں اور خوب سما پڑھیں میں نے تین غزلیں بقید قافیہ آہ۔ نگاہ (متفرق) حسب ذیل پڑھیں۔

بڑھ جاتا ہے بڑھانے ہی سے جی سپاہ کا — اے دل نہ توڑ حوصلہ فریاد و آہ کا
اے آسمان ڈھونڈھ لے موقع پناہ کا — ہونے کو ہے ہدف تو مرے تیر آہ کا
کیوں چیخ کر ہلا دوں زمین و سپہر کو — دیکھو گے جوش نالہ و فریاد و آہ کا
جا کر جگا دے یار کو وہ خواب ناز سے — اتنا کہاں ہے حوصلہ عاشق کی آہ کا
کھنچی جو میں نے آہ تو وہ اور کھنچ گئے — الٹا اثر دکھایا ستمگر نے آہ کا

کیوں اتنے بدحواس نظر آتے ہیں رقیب — کیا صبر پڑ گیا دلِ مضطر کی آہ کا
اب یہ گلہ کہ آئی ہوئی نیند اڑ گئی — کیوں امتحاں کیا تھا بھلا میری آہ کا
دل سے نکل کے ہوتی ہے کیا در بدر خراب — پرساں نہیں کوئی بھی غریبوں کی آہ کا
وہ کج خواب ناز سے کہتے ہوئے اٹھے
اے فوق ہم نے شور سنا تیری آہ کا

(۶۰)

جھونکا لگا ہے کس دلِ مضطر کی آہ کا — شعلہ بھڑک اٹھا تری برقِ نگاہ کا
ممکن نہیں کہ پائے وہ موقع پناہ کا — ٹھہرے کہاں ہے بسمل تیغِ نگاہ کا
میری طرف بھی دیکھ لے او جانِ صنم — میں بھی تو صید ہوں ترے تیرِ نگاہ کا
کس طرح دل کو کھینچ کے لیجائیگا کہیں — میں بھی تو جذب دیکھ لوں تیرِ نگاہ کا
ہم سے اگر رہیں گی یہی کج ادائیاں — نکلے گا بل نہ یار کی ترچھی نگاہ کا
ہم کو خلش رہے کہ تڑپ غم نہیں ہے فوق
دل کو ہدف بنائیں وہ تیرِ نگاہ کا

(۶۱)

اللہ رے غرور مرے رشکِ ماہ کا — پہنچا ہے آسمان پہ گوشہ کلاہ کا
سنتے ہیں روز شور بھی فریاد و آہ کا — پھر بھی انہیں یقیں نہیں حالِ تباہ کا
محتاج ہیں سبھی تری رحمت کے اے غنی — سلطاں بھی ہے فقیر تری بارگاہ کا
یاروں نے کوہ و دشت میں ڈھونڈھا ہزار بار — ملتا نہیں پتہ دلِ گم کردہ راہ کا
اس ڈر سے کر سکے نہ کبھی عرضِ حال ہم — نازک مزاج ہے صنمِ کج کلاہ کا
لذت سزائے مجرمِ الفت میں کچھ نہیں — اللہ ذوق دے نہیں عفوِ گناہ کا
دل لے چکے ہو عہد وفا پر قسم کے ساتھ — پھر بھی تمہیں خیال نہیں کچھ نباہ کا
کچھ اور بڑھ گئی شبِ فرقت کی تیرگی — سایہ جو پڑ گیا مرے بختِ سیاہ کا

اے فوقؔ اب مزے سے کرو شغل شاعری
(۶۲)
ملک سخن ہے آصف عالم پناہ کا

مئی ۱۸۹۹ء کے رسالہ ارمغان شاہجہانپور کی طرح ع آپ کو ہم نے کہیں دیکھا تو ہے" نظر سے گذرتے ہی دل میں جم گئی۔ ان دنوں شاعری کا خبط اور جنون نہ درد پر تھا۔ اس غزل سے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ رات کے دو بجے تک جاگتا رہا جب تک غزل مکمل نہ ہو چکی۔ نیند نہ آئی چاندنی رات تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ چارپائی پر لیٹے ہی لیٹے پنسل سے جو کچھ ذہن نشین ہوتا تھا لکھ لیتا تھا۔ ان دنوں ارمغان شاہجہانپور اور مشاعرہ اتحاد لاہور کی کوئی طرح ایسی نہ تھی جس پر غزل نہ کہی گئی ہو۔

عشق میں گو جان کا کھٹکا تو ہے	لیکن آخر ایکدن مرنا تو ہے
ایک دن دشمن نہ ہو جائیں ذلیل	نام بے عزت مرا رکھا تو ہے
اے خدا خط کا بھی لایا ہو جواب	نامہ بر دوڑا ہوا آتا تو ہے
توبہ توبہ کرتے ہو کیوں شیخ جی	صحبت مے میں تمہیں دیکھا تو ہے
دیکھئے کیا کیا نظر آتی ہے سیر	دشت وحشت میں قدم رکھا تو ہے
لے اڑوں گا ایک دن مثل پری	نام دیوانہ مرا رکھا تو ہے
دیکھئے اب ہم بھی کچھ کہتے کو ہیں	آپ نے ناحق ہمیں چھیڑا تو ہے
حشر کے دن ہوگا اس کا فیصلہ	بے خطا سرکار نے مارا تو ہے
گالیاں ہی خط میں گو اس نے لکھیں	یہ بھی کیا کم ہے کہ خط لکھا تو ہے

مار ڈالو فوقؔ کو یا بخش دو
(۶۳)
جان و دل سے آپ کا شیدا تو ہے

انجمن مشاعرہ اتحاد لاہور کا مشاعرہ ۹۔ اگست ۱۸۹۹ء کے مصرع طرح ع ناتوانی سی ناتوانی ہے" کے لحاظ سے گو ایک کمزور مشاعرہ سمجھا جائے لیکن شاعروں کی کثرت

اور بعض اچھی غزلوں کے پڑھے جانے کے باعث گذشتہ مشاعروں کی نسبت پُرزور رہا۔ ۱۱-۱۲ اگست کی تاریخوں میں وقتاً فوقتاً یہ غزل مکمل کی گئی اور ۱۹ اگست کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

جوش پر عالمِ جوانی ہے — موسمِ عیش و کامرانی ہے
فخر کرتے ہیں قیصر و دارا — تیرے در کی وہ پاسبانی ہے
سنئے تو سرگذشتِ دل اک دن — ایک حسرت بھری کہانی ہے
کہہ نہیں سکتے زور سے کچھ ہم — بات مانو تو مہربانی ہے
مٹنے دیں گے نہ داغِ دل کو ہم — آپ کی اک یہی نشانی ہے
باغ میں آ گیا کوئی صیاد — بند بلبل کی نغمہ خوانی ہے
ایک شیریں ادا کی فرقت میں — تلخ ہم کو یہ زندگانی ہے
اُن سے شکوہ جفا کا ہے بیسود — جن کا شیوہ ضرر رسانی ہے
جلوہ گر ہیں کبھی نہ آئے تم — لن ترانی ہی لن ترانی ہے
سانس تک مجھ سے اٹھ نہیں سکتی — "ناتوانی سی ناتوانی ہے"
آج بیٹھو نہ آسماں کے تلے — رنگ ملبوس آسمانی ہے
آہ اے آرزوئے ہم سخنی — یار کو عذرِ بے دہانی ہے
گالیاں دے کے نامہ بر سے کہا — ان کا پیغام یہ زبانی ہے
جنبشِ لب سے جی گئے کُشتے — تیرے ہونٹوں میں زندگانی ہے

میرے رونے کے سامنے اے فوقؔ

(۶۴)

شرم سے ابر پانی پانی ہے

غزل ۶۵ ارمغان کے مصرع طرح پر تھی۔ جو اگست ۱۸۹۸ء کے ارمغان میں چھپی تھی۔ اُن دنوں چومحلہ بھاٹی دروازہ میں اس لئے رہایش تھی۔ کہ وہ جگہ مشاعرہ

اتحاد کے بہت قریب تھی۔ یہ مشاعرہ نواب غلام محبوب سبحانی رئیس لاہور کے اصطبل میں ہوا کرتا تھا جو بھاٹی دروازہ کے اندر تھا۔

جو نرالا ہو وہی تازہ ستم ایجاد ہو / جس میں ہو شانِ کرم مجھ پر وہی بیداد ہو
خوف سچی بات کہدینے میں ہو سکتا ہے کیا / لاکھ میں دو لاکھ میں کہدونگا تم جلاد ہو
بیکسوں پر لطف او صیاد کرنا چاہیئے / فصلِ گل آئی گرفتارِ قفس آزاد ہو
قصۂ فرقت سنانے پر وہ فرماتے ہیں یوں / ہم تو سنتے ہیں وہی دلچسپ جو روداد ہو
عاشق اس بت کی کمر کے ہیں ہزاروں ناتواں / کیا تعجب ہے کہ اب ملکِ عدم آباد ہو
مجھ کو کچھ کہنے نہیں دیتی مری دیوانگی / قصۂ غم وہ سنا سکتا ہے جس کو یاد ہو

جس قدر اشعار ہیں گویا وہ ہیں سب لختِ دل
(۶۵)
فوق تم کو کون کہتا ہے کہ بے اولاد ہو

غزل ۶۶ اواخر ۱۹۰۰ء یا اوائل ۱۹۰۱ء کے زمانہ کی ہے۔ ٹھیک وقت یاد نہیں۔

تیری صورت کو دیکھتا ہوں میں / اپنی حسرت کو دیکھتا ہوں میں
کوچۂ یار میں ملا زاہد / اس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں
تیری چاہت تو دیکھ لی ظالم / اب عداوت کو دیکھتا ہوں میں
تو نے صورت تو دلربا پائی / تیری سیرت کو دیکھتا ہوں میں
ہائے مجھ سے ترا جدا ہونا / اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں میں
بند آنکھیں نہیں تصور میں / خوابِ راحت کو دیکھتا ہوں میں
تم جو کہتے ہو تجھ سے الفت ہے / اپنی صورت کو دیکھتا ہوں میں

خط کے ایک ایک حرف میں اے فوق
(۶۶)
ان کی حرفت کو دیکھتا ہوں میں

۵-جون ۱۹۱۰ء کے اخبار صدائے ہند لاہور میں جس کا موجودہ نام آج میونسپل گزٹ ہے ۔ نورجہان بیگم ناز دہلوی نے ایک مصرع طرح دیا ع ہمیں کچھ تمہاری خبر ہوگئی۔ منشی دین محمد صاحب ایڈیٹر و مالک صدائے ہند کی فرمائش سے میں نے بھی توجہ کی۔ توار کا دن تھا۔ پار کے میلہ کی وجہ سے چند احباب کے ساتھ "مقبرہ" جہانگیر گیا جہاں میلہ زور وشور سے لگا ہوا تھا۔ آصف جاہ اور نورجہاں کے مقبرے بھی دیکھے۔ اسی اثنا میں چند شعر بھی موزوں ہوگئے ۔ جو ۲ جنوری ۱۹۰۱ء کے صدائے ہند میں چھپ گئے۔ ان میں سے چھ شعر انتخاب کیے جاتے ہیں۔

وہی بات جو کارگر ہو گئی — وہی آہ جو باثر ہو گئی
نہ کیوں کوئے قاتل کا رستہ ملے — طلب موت کی راہبر ہو گئی
نہ کیوں عشق کا باغ پھولے پھلے — مری شاخ غم بارور ہو گئی
وہی مدعا جو کہ پورا ہوا — وہی چال جو فتنہ گر ہو گئی
ہمیں کچھ تمہارا پتہ مل گیا — ہمیں کچھ تمہاری خبر ہو گئی

یہی حاصل زندگانی ہے فوق
اگر آبرو سے بسر ہو گئی

متفرقات

جنمیں وہ قومی اور متفرق نظمیں ہیں۔ جو انجمن نعمانیہ۔ انجمن حمایت اسلام۔ مشاعرہ اتحاد۔ اور بعض دیگر جلسوں میں پڑھی گئیں۔

جہالت

لٹریری سوسائٹی یعنی انجمن اتحاد کے مشاعرہ میں علاوہ مصرع طرح کے اخلاقی نظموں

کے لئے بھی کوئی نہ کوئی عنوان دیا جاتا تھا۔ اواخر ۱۸۹۸ء کے مشاعرہ میں جس میں خان احمد حسین خان صاحب بی۔اے سیکرٹری کے علاوہ نواب غلام محبوب سبحانی صاحب اور شیخ محمد رفیع صاحب اختر سوداگر اعظم بھی شامل تھے جہالت کے عنوان پر چند اصحاب نے نظمیں پڑھیں میں نے بھی ایک نظم لکھی جو اس زمانہ کے تقریباً تمام اردو اخبارات میں چھپ گئی تھی۔

جہالت۔ تیرا نور ظلمت سے بدتر | مروت ہے تیری عداوت سے بدتر
سعادت ہے تیری شقاوت سے بدتر | ہے تعریف تیری مذمت سے بدتر
برائی ہے کیا جانے تجھ میں کہاں کی | شب و روز ہے تجھ پہ لعنت جہاں کی

جہاں آئی تو لیکے ادبار آئی | مصیبت کی بن کر مددگار آئی
خزاں بن کے تو بہر گلزار آئی | ہر اک سمت سے تجھ پہ دھتکار آئی
ترا کام ہے اک کو اک سے لڑانا | پدر کو پسر سے جدا کر دکھانا

نحوست کی کالی گھٹا بن کے آئی | تو اہل وفا پر جفا بن کے آئی
زبانوں پہ تو بے مزا بن کے آئی | تو افلاس کی اک ہوا بن کے آئی
جسے دیکھ پایا کہ ہے شاد و خورم | کیا تو نے اس کو گرفتار ماتم

عجب شوخیاں ہیں عجب ناز تیرے | غضب کے ہیں ظالم یہ انداز تیرے
کرشمے ستم ہیں فسوں ساز تیرے | گرے سرنگوں سب سرافراز تیرے
جہالت تو ہے دشمن جان انساں | بہت بستیوں کو کیا تو نے ویراں

نہ انجام اچھے نہ آغاز تیرے | مگس سے بھی بدتر ہیں شہباز تیرے
ہوئے سارے ساماں خدا ساز تیرے | بنے رنج و ادبار ہمراز تیرے
جہاں آئی کالی بلا بن کے آئی | تو انساں کے حق میں قضا بن کے آئی

ترے ہاتھ نے سینکڑوں گھر اجاڑے | بنے کام لاکھوں کے دم میں بگاڑے
ہزاروں بہادر تہمتن پچھاڑے | نہ اکھڑے قدم جس جگہ تو نے گاڑے

تری سرکشی سے شرارت سے توبہ | تری پہلوانی سے طاقت سے توبہ
تو عالی نسب کی شرافت کی دشمن | تو زردار لوگوں کی دولت کی دشمن
تو اہل زمانہ کی راحت کی دشمن | تو عیزت کی دشمن تو حشمت کی دشمن
غرض تیرا ہر ایک شیوہ بُرا ہے | تجھے دوست اپنا سمجھنا بُرا ہے
تجھے علم سے اور عالم سے نفرت | تجھے ظلم سے اور ظالم سے اُلفت
تجھے عدل سے اور عادل سے دہشت | تجھے عقل و عاقل سے یکسر عداوت
تجھے اچھے کاموں کی عادت نہیں ہے | تو نشتر کہیں ہے تو کانٹا کہیں ہے
زمانہ میں ظاہر ہے تیری بُرائی | گلہ تیرا کرتی ہے ساری خدائی
تیری تیرگی کی گھٹا ایسی چھائی | کہ دینے لگا آسماں بھی دُہائی

دعا ہے یہ فوق حزیں کی زبان سے
کہ اللہ تجھکو اٹھائے جہاں سے

مسدس قومی

یہ پہلی نظم ہے۔ جو کسی پبلک جلسہ میں مینے پڑھی۔ سردیوں کے دن تھے میں جموں کے محکمہ بربٹ میں ملازم تھا۔ کہ انجمن حمایت اسلام گوجرانوالہ کے سالانہ اجلاس میں مجھے شمولیت کی دعوت دی گئی۔ میرا قیام جموں میں حویلی راجہ بلدیو سنگھ والئے پونچھ میں تھا۔ وہ جگہ بڑی پُرفضا ہے۔ اور توی کے کنارہ پر ہے۔ نظم کا کچھ حصہ اسی پرفضا جگہ میں لکھا۔ اور چند اشعار توی کے ساحل پر جاکر لکھے۔ حاجی شمس الدین صاحب جو اس زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سکرٹری تھے۔ اس جلسہ کے صدر تھے۔ انہوں نے ایک دو بند سنکر ہمت بڑھائی۔ اور میں لے بمشکل تمام یہ منزل طے کی

جہاں میں جس گھڑی آئے پیمبر   گرے بُت سرنگوں ہو کر سراسر
ہوئی توحید ہر سو جلوہ گستر   پڑا یہ شور و غل مکے میں گھر گھر
خداؤں کو ہمارے ہو گیا کیا؟   انہوں نے بھی بہم جھگڑا کیا کیا؟
وہ مکہ مسکن کفار جو تھا   وہ مکہ مکتب پندار جو تھا
وہ مکہ مرجع ادبار جو تھا   وہ مکہ منزل اشرار جو تھا
نبی نے آتے ہی حالت بدل دی   ہر اک صورت ہر اک سیرت بدل دی
وہ کعبہ خانۂ اصنام جو تھا   وہ فرقہ خود رو و خود کام جو تھا
وہ فرقہ جہل میں بدنام جو تھا   عدوئے بانی اسلام جو تھا
نکالے بُت دیئے ایسے سبق بھی   کہ جن سے ہل گئے چودہ طبق بھی
محبت رات دن اصنام سے تھی   طبیعت خوش مئے گلفام سے تھی
انہیں نفرت خدا کے نام سے تھی   غرض ناآگہی انجام سے تھی
کوئی نیکی کو کب پہچانتا تھا؟   نصیحت کون؟ کس کی مانتا تھا
سراسر دشت تھے واں کے گلستاں   گلوں کے بدلے تھے خار مغیلاں
زمیں جنگ و جدل سے سب تھی ویراں   ہر اک تھا دوسرے کا دشمن جاں
کہ ناگہ بحر رحمت میں اٹھا جوش   ہوئے پیدا عرب میں شاہ حق کوش
نبی وہ نام جس کا مصطفےٰ ہے   نبی وہ جو شہِ ہر دو سرا ہے
نبی وہ جس کا رخ بدرالدجیٰ ہے   نبی وہ جس کا شیدا خود خدا ہے
نہ پوچھو کیا تھی عزت مصطفےٰ کی   کہ ان میں شان پنہاں تھی خدا کی
نہ سوچا پر ذرا اہل عرب نے   ستم برپا کیا اہل عرب نے
نہ مانا کچھ کہا اہل عرب نے   سراسر کی خطا اہل عرب نے
جفاؤں سے ہوئے تنگ ایسے حضرت   گئے سوئے مدینہ کر کے ہجرت

وہ بوجہل اور وہ اس کی جماعت — انہیں پہنچاتے تھے رنج و مصیبت
سبھی ناری تھے مصروف شرارت — مگر حضرت نے پائی تھی وہ ہمت
نہ چھوڑا دامن صبر و تحمل — خدا کے فضل پر رکھا توکل
نبی کو قوم سے تھی وہ محبت — رہے سب کے شریک رنج و راحت
اسی سے گرچہ پاتے تھے اذیت — اسی کی آپ کے دل میں تھی الفت
ہمیشہ کی کرم کی پاسداری — تری خاطر تھی لے امت یہ ساری
مسلمانو! ذرا تم بھی تو سوچو — کہ اس دنیا میں تم کیا کر رہے ہو
خبر اپنی نہیں غفلت سے تم کو — ذرا آئینہ لے کے منہ تو دیکھو
ذرا سا منہ نکل آیا تمہارا — ہوا ہے بدنما نقشہ تمہارا
نہ تم میں الفت و شفقت رہی ہے — نہ وہ اخلاص کی عادت رہی ہے
نہ جرأت ہے نہ حریت رہی ہے — نہ کچھ اسلام کی چاہت رہی ہے
زمانہ نے بدل لی چال اپنی — کرو تم بھی تنزل سے ترقی
خدارا اپنی حالت کو سنبھالو — فضائے دہر کی دم بھر ہوا لو
ذرا پہلو کو اپنے چیر ڈالو — دل کم بخت کو اس سے نکالو
اسے سمجھاؤ ہو کر دست بستہ — کہ اے زار و زبون و خوار و خستہ
نکوکار اور بدخو مل گئے ہیں — بہم ضرغام و آہو مل گئے ہیں
مسلمان اور ہندو مل گئے ہیں — یہ دونوں ہو کے یکسو مل گئے ہیں
زمانہ سے گئی باد نفاق اب — بھلا دے تو بھی ہاں یاد نفاق اب
تمہیں سمجھانے آتے ہیں سراسر — یہ واعظ راہِ دین حق کے رہبر
مقرر ہے کوئی بالائے منبر — سناتا ہے کوئی آیات پڑھ کر
سخنور کوئی قومی نظم لایا — تمہارے واسطے جلسے میں آیا

مسلمانو! یہ کب تک خواب غفلت بھلا کب تک نشاط و عیش و عشرت
یہ کب تک راحت و لطف و مسرت خدا را چھوڑ دو اپنی یہ عادت

رسول اللہ سے یثرب میں جاکر کہونگا میں غزل اپنی سناکر
کہاں مجھکو بھلا تاب ثنا ہے کہ تیری شان تو شانِ خدا ہے
محمد مصطفےٰ ہے نام تیرا تو ہی بدرالدجیٰ شمس الضحیٰ ہے

تو ہی ہے باعث ایجاد عالم ہر اک انسان پر احساں ترا ہے
ترا نام مبارک وہ کہ جس سے مشام جاں معطر ہو رہا ہے
لگا دے پار اب امت کا بیڑا کہ اس کا حال ابتر ہے بُرا ہے

خدا را فوق کی فریاد سُن لے
کہ یہ بیچارہ اک مسکیں گدا ہے

مدد اے شافع روز قیامت مدد اے قافلہ سالار امت
مدد اے قاسم تسنیم جنت مدد اے منبعٔ صدق و مروت

تری امت ہوئی بدخواہ اپنی ہوئی وہ دشمن جاں آہ اپنی
مدد اے کاشف اسرار قدرت مدد اے گوہر تاج رسالت
مدد اے بزم حق کے زیب و زینت مدد اے یاور وقت مصیبت

سوئے امت نظر اکرام کی ہو ترقی پھر وہی اسلام کی ہو
مدد اے رہبر راہ شریعت مدد اے واقفِ راز طریقت
مدد اے گلشن باغ دیانت مدد اے سرو بستانِ ہدایت

تری امت نے سب رستے بھلائے خزانے دین و دنیا کے لٹائے
زباں کو تھام لے اے فوق اس جا ادب سے کام لے لے فوق اس جا
نہ یوں الزام لے اے فوق اس جا خدا کا نام لے لے فوق اس جا

کہ تو بھی سب میں ہے ناچیز و بدتر
نہ بچے گا ایسے الزاموں سے کیونکر

بس اب اللہ سے مانگو دعائیں
کہ ہوں سب دور نکبت کی گھٹائیں

نہ یاں افلاس کی آئیں بلائیں
ہماری آرزوئیں سب بر آئیں

مسلماں سب الٰہی نیک ہو جائیں
ملیں ایسے کہ ملکر ایک ہو جائیں

الٰہی دولت صحت عطا ہو
الٰہی باہمی الفت عطا ہو

الٰہی عزت و ثروت عطا ہو
الٰہی خوبیِٔ قسمت عطا ہو

الٰہی اوج پر ہو نجم تقدیر
زیادہ مہر سے ہو اسکی تنویر

الٰہی دولتِ ایماں عطا ہو
الٰہی نور قلب و جاں عطا ہو

الٰہی ہمتِ مرداں عطا ہو
الٰہی منزل عرفاں عطا ہو

دُعا ہے مرتے دم اے رب اکبر
ترا ہی نام جاری ہو لبوں پر

مناجات قومی

(نوشتہ جنوری ۱۸۹۹ء بمقام لاہور)

الٰہی قوم میں ایسے جواں ہوں
کہ فخر قوم ہوں فخر زماں ہوں

کتاب شرع کے معجز بیاں ہوں
غلام پادشاہ انس و جاں ہوں

انہیں ممتاز کر دونوں جہاں میں
معزز ہوں زمین و آسماں میں

چراغ دیں میں تازہ روشنی ہو
الٰہی دور سب کی بیکسی ہو

وہی راحت وہی گھر گھر خوشی ہو
وہی ثروت وہی خوش طالعی ہو

نکلتی ہیں دلوں سے یہ دعائیں
کہ دین حق کے دشمن منہ کی کھائیں

گھٹا ادبار کی چھائی ہے ٹل جائے
زمانہ کی ہوا جلدی بدل جائے

سرِ اعدا پہ تیغ رشک چل جائے
نہال آرزوئے قوم پھل جائے

کوئی جاہل نظر آئے نہ ایسا
کہ جس کو بھول جائے نام تیرا

وہی صنعت وہی حرفت ہو جاری
وہی شوکت ہو دنیا میں ہماری

ملے اب مفلسی سے رستگاری
نہ دکھلائے کبھی منہ اپنا خواری

پھر آجائیں وہ ایام ترقی
مسلماں ہوں خوش انجام ترقی

ہم اک دوسرے کا ہو ہوا خواہ
سب آئیں راہ پر جتنے ہیں گمراہ

نہ نکلے آہ اب دل سے بجز واہ
کرم کر قوم پر لے میرے اللہ

بُری حالت ہے یہ حالت بدل دے
الٰہی ہمت حسن عمل دے

خموش اے فوق کب تک یہ صدائیں
کہاں تک قوم کی حالت سنائیں

بہت روئے بہت مانگیں دعائیں
کہو یہ بھی جو کی ہیں التجائیں

زمہجوری برآمد جانِ عالم
ترحم یا رسول اللہ ترحم

ترکیب بند قومی

جو جنوری ۱۸۹۹ء کے آخری ہفتہ میں لکھا اور فروری ۱۸۹۹ء کے آخری ہفتہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ شیرانوالہ دروازہ میں پڑھا گیا۔

سودا زدۂ قوم پریشان بہت ہیں
حکمت کوئی چلتی نہیں حیران بہت ہیں

عالم ہیں مگر حسن عمل سے نہیں واقف
کہنے کو جو دانا ہیں وہ نادان بہت ہیں

رکھتے نہیں دل میں جو ذرا قوم کی الفت
اس مذہب و ملت کے مسلمان بہت ہیں

اسباب محبت نظر آتے نہیں لیکن
کم بخت عداوت ہی کے سامان بہت ہیں

اسلام کی خدمت نہ کریں قوم کی اصلاح
ریفارمری کے مگر ارمان بہت ہیں
تاثیر سے خالی نہ ہے شکوۂ قومی
گو ایسے بیاں کیلئے عنوان بہت ہیں

یارب تو ضیا اختر قسمت کو عطا کر
جوہر کی چمک تیغ حمیت کو عطا کر

ہم کثرت آلام سے حیران بہت ہیں
ہے خانۂ دل ایک ہی مہمان بہت ہیں
صحرائے مدینہ کو نہ چھوڑیں گے کبھی ہم
یوں خاک اڑانے کو بیابان بہت ہیں
اے عشق محمد مجھے وحشی ہی بنا دے
دنیا میں اگرچاک گریبان بہت ہیں
کر فضل سے یارب تو عطا ہم کو مسرت
پہلے سے بھی ہم پر ترے احسان بہت ہیں
عُقدہ ہے تو کھول دے سب عقدے یوں گے
دشوار ہیں ہمکو تجھے آسان بہت ہیں
پھر بیکسیٔ قوم کو رحمت سے تو کھو دے
قبضے میں ترے لطف کے سامان بہت ہیں
کیا دُور ہے تجھ سے کہ کرے عفو خطائیں
ہر چند مسلمانوں کے عصیان بہت ہیں

یارب تری سرکار میں یہ اپنی دُعا ہے
کر رحم و کرم قوم کا اب حال بُرا ہے

شاداب یہ گلزار نظر آئے تو جانیں
ہاں نخل تمنا میں ثمر آئے تو جانیں
اے چرخ نہ دکھلا تو ہمیں نورِ مہ و مہر
کچھ ہم میں ضیا مثل قمر آئے تو جانیں
اے آہ دکھا اپنا اثر آج ہمیں بھی
گر قوم کا دل درد سے بھر آئے تو جانیں
ہر حال کی یوں تو خبر آجاتی ہے ہم تک
کچھ بےخبروں کی بھی خبر آئے تو جانیں
ہر چند دل زار میں ہیں سینکڑوں ارماں
ان میں سے مگر ایک بھی بر آئے تو جانیں
جو فن و ہنر اپنے تھے غیروں کو ملے ہیں
اب یوسف گم گشتہ جو گھر آئے تو جانیں
سنتے ہیں کوئی شاہد مقصود ہے اے قوم
آغوش میں تیرے وہ اگر آئے تو جانیں

اے قوم ترے واسطے کیا اور دعا ہو
ادبار کی اب دُور یہ گھنگھور گھٹا ہو

جس چیز کی طالب ہے طبیعت نہیں ملتی | کیا کیجئے پہلی سی وہ حشمت نہیں ملتی
گو بخت سیہ کی ہے سیاہی میں ترقی | گو اس سے شب تار کی رنگت نہیں ملتی
گو رنج و غم و درد و محن کی ہے افراط | گو ہم کو مسرت کسی صورت نہیں ملتی
گو چرخ ستمگار نے پیسا ہے ستم سے | گو اوروں کو اس طرح اذیت نہیں ملتی
گو بغض و عداوت نے بنا کام بگاڑا | گو ڈھونڈھے سے بھی ہم میں محبت نہیں ملتی
گو قوم کے بیمار دل کو اب بستر غم پر | پہلو کے بدلنے کی بھی طاقت نہیں ملتی

پر چشم عنایت جو تری ہم پہ ذرا ہو
بیمار الم ۔ قوم کو دم بھر میں شفا ہو

خوئے بدرا بہانہ ہا بسیار

"حکایات لقمان" کو جو کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کی بہترین اخلاقی کتابوں میں سے ہے ۔ جولائی ۱۸۹۹ء میں منظوم کرنے کا خیال آیا چنانچہ گوسفند اور بھیڑیے کی حکایت نظم کی گئی لیکن پھر خیال اس طرف رجوع نہ ہو سکا اور کچھ عرصہ کے بعد بالکل فراموش ہو گیا ۔

حکایات لقمان میں ہے لکھا | کہ اک گوسفند اور اک بھیڑیا
گئے پانی پینے کو اک نہر پر | کہ تھا پیاس سے حال ان کا بتر
بلندی پہ پینے لگا بھیڑیا | مگر گوسفند اس سے نیچے گیا
طبیعت گئی بھیڑیے کی بدل | پڑا اس کی نیت میں فوراً خلل
کہا دل میں یہ مال تو خوب ہے | پسند طبیعت ہے مرغوب ہے

اگر ہاتھ آئے تو کیا خوب ہو ملے گرم لقمہ مزا خوب ہو
بہانہ کوئی چھیڑ کا چاہیئے نہ یوں بے سبب یہ جفا چاہیئے
غضبناک ہو کر یہ اس کو کہا کہ پانی کو کیوں تو نے میلا کیا
چمکدار تھا پانی اور صاف تھا یہ مانند آئینہ شفاف تھا
لرز کر کہا اس نے سنئیے حضور غلام آپ کا صاف ہے بیقصور
نہ میلا کیا میں نے پانی ذرا کہ پستی کی جانب سے ہوں پی رہا
بلندی سے پیتا جو میں ایجناب تو پانی بلا شبہ ہوتا خراب
نہ مجکو بنائیں خطاوار آپ نہ ٹھہرائیں ناحق گنہگار آپ
کہا بھیڑیئے نے او بیباک سن زیادہ نہ بن چست و چالاک سن
یہ گستاخیاں مجھ سے او بے ادب نہیں تو نے دیکھا ہے میرا غضب
میرے ساتھ ہے اس طرح ہم سخن سمجھ لیتا ہوں تجھ سے او بدچلن
بتا پانی کیوں تو نے میلا کیا بتا بے ادب جلد مجکو بتا
شرارت ہے چہرے سے تیرے عیاں یہ شوخی یہ بیباکی اے بدزباں
تو گستاخ ہے شوخ و عیار ہے خطا ہے تری تو خطاوار ہے
نہیں ان بہانوں سے کچھ بھی حصول ترے عذر و حیلے ہیں سارے فضول
کہا کانپ کر اس نے اے مہرباں ذرا غور سے سنئیے میرا بیاں
دل و جان سے میں آپ کا ہوں غلام نہ الزام دیجیے مجھے نیک نام
اگر ہے مری کچھ خطا بخش دیں مجھے از برائے خدا بخش دیں
کڑک کر یہ پھر بھیڑیئے نے کہا میرے سامنے تو نہ باتیں بنا
بتا میں نے تیرا بگاڑا تھا کیا مجھے گالیاں دیں جو اے پُر جفا
یہ سنتے ہی ہوش اس کے جاتے رہے کہ دشمن کے تیور ڈراتے رہے

کہا مانئے میرا معقول عذر　　مری تو ہے بس دو مہینے کی عمر
سنا بھیڑیے نے یہ جس دم جواب　　کہا پھر کڑک کر ارے خانہ خراب
نہیں گالیاں دیں ہیں تو نے اگر　　تو دی ہیں ترے باپ نے پیشتر
یہ کہتے ہی بس ٹوٹ کر جا پڑا
اور اک آن میں پھاڑ کر کھا گیا

گردش ایام

نومبر ۱۸۹۹ء کے مشاعرہ اتحاد میں علاوہ مصرع طرح کے گردش ایام کے عنوان پر ایک مضمون بھی قرار پایا تھا میں نے اس پر مندرجہ ذیل خیالات نظم کی صورت میں ظاہر کئے۔

فلکِ پیر نے آفت جو نہ ڈھائی ہوتی　　اخترِ بخت میں گر جلوہ نمائی ہوتی
حسرتوں نے نہ اگر خاک اڑائی ہوتی　　ہمکو زندانِ الم سے جو رہائی ہوتی
دیکھتے تم کہ عجب عید منائی ہوتی

آہ کی بابِ اثر تک جو رسائی ہوتی　　بختِ واژوں نے جو صورت نہ دکھائی ہوتی
لشکرِ غم کی جو ہم پر نہ چڑھائی ہوتی　　ہمکو زندانِ الم سے جو رہائی ہوتی
دیکھتے تم کہ عجب عید منائی ہوتی

گردشِ دہر جو چکر میں نہ لائی ہوتی　　تیرگی یاس کی ہم پر جو نہ چھائی ہوتی
شکلِ امید فلک نے جو دکھائی ہوتی　　ہمکو زندانِ الم سے جو رہائی ہوتی
دیکھتے تم کہ عجب عید منائی ہوتی

دردِ پہلو کی جو سینے سے جدائی ہوتی　　ابر کی طرح فلاکت جو نہ چھائی ہوتی
روٹھی تقدیر کسی نے جو منائی ہوتی　　ہمکو زندانِ الم سے جو رہائی ہوتی

دیکھتے تم کہ عجب عید منائی ہوتی

گردش دہر کے پتھر سے مرا شیشۂ دل
ہو کے سو ٹکڑے بنا رنج کی پہلی منزل
اب ہو مشکل مری آساں یہ بہت ہے مشکل
بحر عشرت کا کہیں بھی نہیں ملتا ساحل
لب دریا کہو کس طرح رسائی ہوتی

گردش دہر نے بے طرح ستایا ہم کو
صورت نقش قدم اس نے مٹایا ہم کو
ہدف تیر ستم آہ بنایا ہم کو
قلزم اشک کی موجوں میں بہایا ہم کو
دل میں یہ خوف خدا کچھ بھی تو لائی ہوتی

بخت فرہاد کو خسرو سے لڑایا تو نے
چشم یعقوب سے بھی نور گنوایا تو نے
کوئی بھی دیکھا نہ اپنا نہ پرایا تو نے
ایک ہی راستہ دنیا کو بتایا تو نے
تجھ پہ بھی آفت تازہ کوئی آئی ہوتی

تو نے زنجیروں میں جکڑے ہیں بہت سے آزاد
تجھ سے دلشاد ہزاروں ہوئے یکسر ناشاد
تو نے ڈالی ہے یہاں رنج والم کی بنیاد
خلق کو ظلم سے کرتی تو ستمگر برباد
تیرے قبضہ میں اگر ساری خدائی ہوتی

نوحہ غلام پہلوان مرحوم

۲۰ مئی ۱۹۱۰ء کی سہ پہر کو پنجاب کا مشہور اور نیکدل پہلوان جس نے اپنی شہزوری و پہلوانی کے سکے یورپ تک بٹھا دیئے تھے۔ کلکتہ میں بمرض مہلک ہیضہ عین شباب کے عالم میں نذر اجل ہو گیا۔ اس کی وفات پر اکثر نوحے اور مرثیے لکھے گئے۔ انہی دنوں انجمن مشاعرہ اتحاد کا جلسہ (مشاعرہ) اخبار ٹربیون کے دفتر واقعہ انار کلی[1] میں تھا۔ میں نے بھی اس مشاعرہ میں مرحوم کے انتقال پر ایک نظم پڑھی۔

[1] ٹربیون کا دفتر آج کل بلڈنگ نزد رتن باغ وچھارت بلڈنگس میں ہے۔

جب پہلوانوں اور کشتی گیری کے شوقینوں اور عام حضرات کو خبر ہوئی۔ تو انہوں نے اس مرثیہ کی کئی کئی نقلیں حاصل کیں۔

باغ میں ہر پھول کیوں مرجھا گیا
سرو مثل بید کیوں تھرا گیا

آہ کیا بادل الم کا چھا گیا
یک بیک دورہ خزاں کا آ گیا

تو کہاں ہے اے ہوائے خوشگوار
لٹ گئی حسرت بھرے دل کی بہار

ہو گئی پژمردہ کیوں دل کی کلی
گریۂ شبنم ہے ہر گل کی ہنسی

دل نہیں کرتا پسند اب دل لگی
کیا خبر وحشت اثر دل نے سنی

جس سے رخصت ہو گئے ہوش و حواس
آج سب اپنے پرائے ہیں اداس

کیا سنائیں رنج و غم کی داستان
درد دل کا ہو سکے کیونکر بیاں

چین سے بیٹھے ہوئے تھے شادماں
کان میں آواز آئی ناگہاں

اک جواں کی ہائے رحلت ہو گئی
پہلوانی آج رخصت ہو گئی!

ٹوٹے تجھ پر آسماں اے آسماں
اے اجل مر جائے تو بھی ناگہاں

کیوں نہ روئیں ہر گھڑی پیر و جواں
مر گیا مشہور عالم پہلواں

کہتے ہیں یہ سب دم نوحہ گری
تو کہاں ہے اے غلام امرتسری

ہائے رستم سا جواں مر جائے یوں
ہائے نادر پہلواں مر جائے یوں

دشمنوں کا مہرباں مر جائے یوں
آرزوئے دوستاں مر جائے یوں

اے فلک کیوں ہوگا رنج و غم تجھے
مدتوں کوسے گا اک عالم تجھے

اے اجل خوف خدا تجھکو نہیں
غم جواں کی موت کا تجھکو نہیں

پاس بوڑھوں کا ذرا تجھ کو نہیں
فکر جز فکر جفا تجھ کو نہیں

دوستی کر یا عداوت اے اجل
فرض ہے تیری اطاعت اے اجل

دل سے ہو سکتا نہیں ضبط فغاں
آنکھ سے آنسو نہ ہوں کیونکر رواں

الوداع اے طاقت و صبر و تواں
مل گیا مٹی میں نامی پہلواں

دوستو نوحہ پڑھو ماتم کرو
خوب لے پہلواں کا غم کرو
تیرے مرجانے سے حیف اے نامور
رنج و غم میں مبتلا ہے ہر بشر
جائے اشک آنکھوں میں ہے خون جگر
واقعہ ہے سخت قصہ مختصر
اس الم کو کوئی پوچھے ہم سے آہ!
ہند خالی ہو گیا رستم سے آہ
آج رخصت نوجوانی ہو گئی
دل شکستہ کامرانی ہو گئی
خاک بر سر زندگانی ہو گئی
جان نذر پہلوانی ہو گئی
تو بھی وقف جور دوراں ہو گیا
داخل گور غریباں ہو گیا
تو وطن سے دور جس دم ہو گیا
عیش تیرے واسطے غم ہو گیا
نغمۂ شادی بھی ماتم ہو گیا
دفتر اقبال برہم ہو گیا
جان دینے کو نہ جاتا تھا ادھر
کھا گئی بنگال کی تجھ کو نظر
کون سی جلدی تھی تجھ کو اے غلام
اور چندے خلق میں کرتا قیام
منتظر دیدار کے تھے خاص و عام
تیری شہرت سے تھے ہم بھی شادکام
موت نے لیکن تجھے مہلت نہ دی
آرزو جی میں ہی جی کی رہ گئی
پارسا تو خلق میں مشہور تھا
تیرے چہرے پر خدا کا نور تھا
دل ترا ہر حال میں مسرور تھا
عجب و نخوت سے تو کوسوں دور تھا
عمر طبعی تک نہ پہنچا تو غلام
تیرا نوحہ بھی نہ کیوں ہوتا تمام

قطعات فوق

(جو انجمن نعمانیہ لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۲ء میں پڑھے گئے)

ہم نہ دنیا میں کسی قابل ہوئے
بن کے انساں ننگ آب و گل ہوئے

رہ گئے سامان ہی کی فکر میں ساتھ والے داخل منزل ہوئے

لطف جب ہے کہ اثر آئے دعا سے پہلے کاسہ مقصد کا ہو معمور صدا سے پہلے
قوم بیمار ہے سنتے ہو مسیحا نفسو تندرست اس کو کرو آکے دوا سے پہلے

اندوہ و رنج و یاس سے اب روح بھر گئی دنیا کو چھوڑ دیں یہی جی میں ٹھہر گئی
کس زندگی کے واسطے دنیا کی جستجو "تھوڑی سی رہ گئی ہے بہت سی گذر گئی"

اغیار کے جو دن تھے برے وہ بدل گئے فضل خدا سے صدمہ و آفات ٹل گئے
اے قوم خشک کیوں ہے تری شاخ آرزو نخل مراد سارے زمانے کے پھل گئے

تصویر شراب

یہ نظم لالہ نند لال صاحب سکرٹری امرتسر ٹمپرنس سوسائٹی اور میر کرامت اللہ صاحب تیر امرتسری کی حسب فرمایش ۱۰ جون ۱۹۰۱ء کو ٹمپرنس سوسائٹی امرتسر کے دسویں سالانہ جلسہ کے لئے لکھی گئی تھی۔ لالہ دنی چند صاحب منصف پھالیہ ضلع گجرات نے اس کو اپنے خرچ سے چھپوا کر مفت تقسیم کیا تھا۔

چل رہا ہے دور ساغر آجکل میکشی ہوتی ہے گھر گھر آج کل
کھا رہی ہے عقل چکر آجکل ہو گئے مفلس تونگر آج کل
شوق مے کا ہے اگر عالم یہی
دیکھنا کیسی پڑے گی ابتری

دختِ رز کا جب سے چرچا ہو گیا بادہ کش بدمست و رسوا ہو گیا
بحر صہبا سر سے اونچا ہو گیا ہند کا کچھ اور نقشا ہو گیا
ہائے ہندوستان والے لٹ گئے
ہائے اعلیٰ شان والے لٹ گئے

دُخترِ رز کا جو دیوانہ ہوا ہوش سے وہ دم میں بیگانہ ہوا
دارِ عشرت اس کو میخانہ ہوا مغبچوں سے خوب یارانہ ہوا

زہر ہے اس آبِ خون آشام میں ہوش جاتے رہتے ہیں اک جام میں
وحشتِ رند ہے وہ بلائے ناگہاں کھا گئے جس نے ہزاروں نوجواں
دور اس کا گردشِ دورِ زماں اس سے چکرایا ہوا ہے آسماں
سانپ کے کاٹے سے ممکن ہے حیات پر نہیں اس زہر سے ملتی نجات
آلِ مے جو جواں ہو جائے گا دم میں رسوائے جہاں ہو جائے گا
وقفِ جورِ آسماں ہو جائے گا بے نشاں اس کا نشاں ہو جائیگا
سوئے مے جس کی طبیعت آئیگی جان اس کی دیکھ لینا جائیگی
قبر کی ظلمت میں جی گھبرائے گا عیش دنیا کا بہت یاد آئے گا
دفترِ اعمال کھولا جائے گا اپنی رندی پر بہت پچھتائے گا
آہ وزاری پھر نہ کچھ کام آئیگی جب سیہ کاری کی بدلی چھائیگی
اے لباسِ زعفرانی الوداع اے عروجِ کامرانی الوداع
اے شرابِ ارغوانی الوداع نشۂ عہدِ جوانی الوداع
بن گئے انجان کیسے جان کر جان کھوئی دل کا کہنا مان کر
اے میری جادو بیانی الوداع عیش و راحت کی کہانی الوداع
اے حیاتِ جاودانی الوداع اے ہوائے ملکِ فانی الوداع
ریزۂ الماس تھا جامِ شراب دل کو چھلنی کر گیا خانہ خراب
اے مذاقِ زندگانی الفراق بحرِ مضمون کی روانی الفراق
اے مرے دردِ نہانی الفراق حسرتوں کی نوحہ خوانی الفراق
آج دل کا کارواں سب کٹ گیا خوں کلیجا ہو گیا دم گھٹ گیا
دوست اور احباب سمجھاتے رہے جو ضرر تھے مے کے بتلاتے رہے
حال میخوار دل کا دکھلاتے رہے ہر گھڑی ہر لحظہ غم کھاتے رہے

پر دل کم بخت نے سمجھا نہ کچھ — دوستوں کی بات کو جانا نہ کچھ
رخصت اب اے آسمانِ کینہ جو — رخصت اب اے عیش و راحت کے عدو
رخصت اب اے دشمنِ ہر آرزو — رخصت اب اے چشمِ تر کی آبرو
الفراق اے جوشِ ایامِ شباب — الفراق اے بادہ و جامِ شراب
حب سے قربِ بادۂ انگور ہے — دل مرا راحت سے کوسوں دور ہے
سرگرانی میں سرِ مخمور ہے — منزلِ حسرت دلِ مسرور ہے
رنج میں ہوں غم میں ہوں آفت میں ہوں — کچھ نہ پوچھو کیسی کیفیت میں ہوں
حب سے دل کو ہے مئے رنگیں کا شوق — کچھ نظر آتا نہیں ہے تحت و فوق
چھوٹتا منہ سے نہیں تلخی کا ذوق — پڑ گیا گردن میں خود لعنت کا طوق
زندگی میری اسیرِ غم ہوئی — بزمِ شادی مجلسِ ماتم ہوئی
زندگی کی خشک ڈالی الوداع — اے مری آشفتہ حالی الوداع
اے لبِ جامِ سفالی الوداع — اے شرابِ پرتگالی الوداع
الفراق اب اے دلِ خانہ خراب — زندگانی ہو گئی نذرِ شراب
شغلِ مے کی حب سے عادت ہو گئی — زندگی مجھکو مصیبت ہو گئی
ایسی وارفتہ طبیعت ہو گئی — آرزوئے دل بھی رخصت ہو گئی
پھونک دے سوزِ غمِ پنہاں مجھے — پیس ڈالے گردشِ دوراں مجھے
چاہئے مے سے بچے ہر اک بشر — آتشِ دوزخ ہے یہ بہرِ جگر
دل کو اور معدے کو دیتی ہے ضرر — ہے اثر اس کا برا اعصاب پر
آج سب سن لیں صدائے عام ہے — جامِ آبِ رز لہو کا جام ہے
زہر کا ساغر ہے جامِ جم نہیں — موت کے قاصد سے ہرگز کم نہیں
اے فلک اب تو نہیں یا ہم نہیں — تابِ ضبطِ نالۂ پیہم نہیں

ایک مدت تک بہت پیتے رہے　　بادہ خواری کے لئے جیتے رہے
موت کے دن آ گئے نزدیک اب　　سانپ بن کر ڈس گئی بنت العنب
دخت رز ہے خانماں سوز طرب　　اب نہیں دل کو کسی شے کی طلب
توڑ لے دل مے کا ساغر توڑ دے　　زہر کو منہ سے لگانا چھوڑ دے
رعشہ آیا ہاتھ سے طاقت گئی　　پاؤں چل سکتے نہیں ہمت گئی
گھر کی سب دولت گئی عزت گئی　　آبرو رخصت ہوئی وقعت گئی

ایسی ذلت میں جیا جاتا نہیں
دامن توبہ بھی ہاتھ آتا نہیں



محمد دین فوق بعمر 30 سال
(سنہ 1907)



محمد دین فوق بعمر 33 سال
(سنہ 1910)

کلام فوق

حصہ دوم

نظم جدید

(از ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۹ء)

اس حصہ میں وہ نظمیں درج ہیں۔ جو وسط ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۹ء کے اخیر تک وقتاً فوقتاً کہی گئی ہیں۔ چھ سال کے اس عرصہ میں قریباً ہر سال دو ایک مہینے میں سفر میں رہا۔ لاہور میں چونکہ اخباری کاروبار اور تصنیف و تالیف کی وجہ سے شعرگوئی کی فرصت کم ملتی تھی۔ اس لئے سوائے چند ایک نظموں کے جن کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ باقی سب زمانہ سیر و سیاحت کی ہیں۔

میری سیاحت اکثر سرمائی مقامات اضلاع کانگڑہ۔ شملہ۔ وسط ہند اور

---

[1] نومبر ۱۹۰۱ء میں میں نے اخبار پنجہ فولاد جاری کیا جو ۱۹۰۱ء میں بعض وجوہات سے بند کر دینا پڑا۔ وسط ۱۹۰۱ء کے بعد اخیر ۱۹۰۲ء تک کوئی غزل یا نظم نہیں کہی گئی۔

کشمیر میں رہی ہے۔ جہاں میلوں تک لہراتے ہوئے دھان کے سبز کھیت ہرے بھرے درخت قدرتی چشمے جو پتھر دل پر بہتے ہوئے زمزمہ خوانی کرتے یا فراق وطن کی درد بھری کہانی سناتے اور میدانوں کو شاداب کرتے چلے جا رہے تھے۔ دیکھنے والے کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے تھے۔ دریا کے پانی کا افتاں وخیزاں بے تحاشا دوڑا آنا۔ بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرانا اور ایک مہیب آواز پیدا کرنا۔ وہ کیفیت آور منظر پیش کرتا تھا۔ جو چوٹ کھائے ہوئے دل۔ درد بھرے دل۔ زخم خوردہ دل کیلئے تیر ونشتر کا کام دیتا تھا۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں معمولی گنوار بھی اپنی دیہاتی لے میں مست ذمسرواہ نظر آتا ہے۔ پھر ایک ایسا شخص جو تک بندی کرنا بھی جانتا ہو۔ دل درد مند بھی رکھتا ہو۔ ایسے پُر فضا اور دلفریب مقامات میں جا کر کس طرح خاموش رہ سکتا ہے؟

گو "مرادوں کی راتیں" نہ تھیں لیکن "جوانی کے دن" ضرور تھے! اس لئے اکثر مقامات کی سیاحت پا پیادہ کی۔ راہ کے دلچسپ نظاروں کی راحت۔ پیدل سفر کی صعوبت کو فراموش کرا کر آنکھوں کے لئے کحل الجواہر اور دماغ کے لئے معجون مروارید کا کام دیتی تھی۔ کبھی پہاڑ کی اس بلندی پر جا پہنچتا تھا۔ جو سطح سمندر سے دس بارہ ہزار فٹ بلند ہونے کی وجہ سے عرش چہارم کا کام دیتی تھی۔ اور جہاں سرسبز درختوں کی ان گنت اور بے ترتیب قطاریں۔ سبزہ کے مخملی فرش۔ رنگ برنگ کے خودرو پھولوں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ طیور اپنی سُریلی آوازوں اور تیز سیٹیوں کے ذریعہ چاندنی رات کے مسافروں کو ہنگام صبح کی خوشخبری پہنچاتے تھے۔ قدرتی آبشاروں سے دودھ کی طرح سفید دھاروں کا گرنا ریب اللہ بیگم کی اس رباعی کی یاد دلاتا تھا۔

آتشبازانہ لوحہ گر از اہمرہ ہستی — صیں بر جبیں نگندہ زاندوہ کیستی؟

آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب سرِ راہ بہ سنگ مے زدی و سے گریستی

بلندی کو طے کرنے کے بعد کبھی اس شیبی مقام پر پہنچتا تھا۔ جہاں پہاڑ کی چوٹی کنگرہ عرش سے ہم آغوش معلوم ہوتی تھی۔

راجپوتانہ کا سفر تو صرف ایک دفعہ کیا۔ لیکن وسط ہند میں بارہا گیا۔ اس ملک کا سفر عموماً برسات کے دنوں میں ہوتا تھا۔ اور مندھیاچل پہاڑ کے اکثر ٹکڑے چونکہ وسط ہند میں واقع ہیں۔ اس لئے ان گرم پہاڑوں سے بھی ایام برسات میں قدرتی چشمے نکل آتے ہیں۔ اور چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ جو دریائے خیال کو بحر مواج کا کام دیتا ہے۔

طرز قدیم کی غزلیں اور نظمیں مشق سخن کے لئے تھیں۔ شاعری کا شوق زوروں پر تھا۔ دل بے فکر اور آزاد تھا۔ نظم جدید میں "سفری غزلوں" کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان میں کہیں دردِ دل کہیں قومی جذبات کا اظہار ہے۔ کہیں ملک اور اہل ملک کے تشویشناک حالات کا ذکر ہے۔ غرض تھوڑی سی مشق کے بعد رنگ شاعری نئی شکل بدلنے کے لئے خود بے تاب ہو رہا تھا۔

حصہ دوم کی نظموں اور غزلوں میں طبیعت کو میں نے کہیں مجبور نہیں کیا۔ مقطع نہیں ہو سکا۔ یا شعر کم ہیں۔ تو کوئی پرواہ نہیں کی۔ جو کہا ہے طبیعت کی رضامندی سے اور دل کی خوشی سے۔ اور درحقیقت شعر طبیعت کا ایک بے اختیار جوش اور دل کا پرجوش اُبال ہے۔ اور پورا اور حقیقی لطف اسی میں ہے۔ کہ بے ساختہ بلا تصنع اور بلا فرمائش دماغ سے دل اور دل سے زبان پر جاری ہو۔

۱۹۰۳ء میں لالہ رتن سہائے آزاد نے اپنے تخلص کی رعایت سے آزاد نام ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں نظم کا بھی کافی حصہ ہوتا تھا۔ رسالہ کو رونق دینے کیلئے انہوں نے چمن سخن کے نام سے ایک مشاعرہ بھی قائم کیا جس کے چند جلسے اچیسن سکول بیرون موری دروازہ کے وسیع صحن میں ہوتے رہے۔ جنوری ۱۹۰۳ء کے آخری ہفتہ کی شام کو ع اترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا۔ پر مشاعرہ ہوا میں نے بھی اس پر ایک غزل لکھی جو اخبار پنجہ فولاد جاری کرنے کے بعد سب سے پہلی غزل تھی۔

کیا کہیے حال کافر دیندار کیا ہوا؟ — چاہت میں تیری سبحہ و زنار کیا ہوا
کیوں چپ سی لگ گئی بت کافر کے سامنے — ہاں کچھ تو پھوٹ اے لب اظہار کیا ہوا
عریاں کیا ہے دست جنوں نے اگر مجھے — تو ڈھانک تجھکو دامن کہسار کیا ہوا
تونے جو[1] دوست بن کے کیا دشمنوں کا کام — بدلہ ہم اس کا لیں گے ستمگار کیا ہوا
اللہ رے میری چھیڑ منا کر کہا انہیں — ہاں کہیے اب وہ آپ کا انکار کیا ہوا
گر پنجہ جنوں کی نہیں ایسی چیرہ دستیاں — دستار میں رہا نہ اب اک تار کیا ہوا
قربان اپنے ذوق اسیری کے جائیے — آزاد ہو گیا میں گرفتار کیا ہوا
پہلو سے میرے اٹھ کے چلے درد کی طرح — بیٹھے بٹھائے آپ کو آزار کیا ہوا
صدمہ فراق کا ہے کہ آزار موت ہے — تن سے گئی ہے جان جدا یار کیا ہوا
نیرنگ لبوں سے چھیڑ کی عادت نہیں رہی — پھیکے جو پڑ گئے مرے اشعار کیا ہوا

ہے نغمہ سنج[2] فوق بھی صحن چمن میں آج
کچھ تو بھی بول بلبل گلزار کیا ہوا

---

۱ و ۲۔ ان شعروں میں خاص واقعات پیش آمدہ کی طرف اشارہ ہے

سفر پونچھ (کشمیر) کا کلام

میرے ہم وطن دیوان بخکم چند ریاست پونچھ کے گورنر تھے ۱۹۱۲ء میں ایک مرتبہ وہ لاہور آئے میں پونچھ ہرس میں جو لاہور میں راجہ صاحب پونچھ کی کوٹھی ہے ملا ہمارے خاندانی تعلقات گھرتل کے برادران ہنود اور بالخصوص دیوان پارٹی سے بھائیوں کی طرح چلے آتے تھے۔ وہ مجھے دیکھکر بہت خوش ہوئے اور شفقت بزرگانہ سے پیش آئے میں نے کہا میرے والد بزرگوار اور میرے بڑے بھائی (بابو رحیم بخش صاحب) تو پونچھ دیکھ چکے ہیں مجھے بھی دیکھنے کی خواہش ہے۔ فرمایا بہت اچھا۔ جب جی چاہے آجاؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ میں اگست ۱۹۰۳ء میں گجرات دھمبر کے راستے پونچھ روانہ ہوا۔ اگست کی اٹھارہویں تاریخ تھی اور میں پونچھ و کشمیر کے بلند ترین اور سرسبز و شاداب پہاڑ حاجی پیر کو جو قریباً دس ہزار فٹ تک بلند ہے سطے کر رہا تھا اور اس کڑی منزل کی دشوار گذاری سے چور ہو رہا تھا۔ کرچونی پر پہنچے اور نشیب شروع ہونے کے مقام پر جو وہ ہے۔ وہاں سے ٹھنڈی ہوا کے دو جان بخش جھونکے آئے۔ کہ تمام تکان دور ہو گئی نیز قدرتی دلکش نظاروں کی خوبصورتی سے نگاہیں مانوس ہوتے ہی طبیعت کو تک بندی کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ اور مندرجہ ذیل شعر موزوں ہو گئے۔

بات اس سے دو بدو ہونے لگی — بے تکلف گفتگو ہونے لگی
وائے بدبختی کہ زمزم کی جگہ — آب سرکی آبرو ہونے لگی
بن سیج اے قوم۔ خود ہو چارہ ساز — اب تو ذلت چارسو ہونے لگی
دل سے مٹتی جاتی ہیں سب خواہشیں — جب سے تیری آرزو ہونے لگی
زاہد و قاضی و شیخ و مولوی — آج سب سے دو بدو ہونے لگی
ہو گئی موقوف سب بول چال — جبکہ تجھ سے گفتگو ہونے لگی

تم کو تو دعوے تھے ضبطِ آہ کے
فوق اب کیوں ہائے ہُو ہونے لگی

غالباً وسط جون ۱۹۱۰ء کے دن تھے۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی میں پونچھ (کشمیر) کے مقام پیر اعلےٰ صاحب کے قبرستان کی سیر کر رہا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ دریائے بلنیار کی لہروں اور موجوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شہر خموشاں کا سنسان عالم چاندنی رات کا دلفریب منظر۔ اوڑی سے آگے علی آباد اور حیدر آباد کے درمیانی پہاڑ حاجی پیر کے دلکش نظاروں کی یاد یہ سب باتیں ارغنوں کا کام دے رہی تھیں۔ قبرستان کے احاطہ میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ قریباً بارہ بجے تک یہ چند اشعار تیار ہو گئے۔

ضعف سے لب تک نہ آئی دیکھئے — آہ کی یہ نارسائی دیکھئے
مٹ گئے آخر جبین داستان — انتہائے جبہ سائی دیکھئے
دل بنا ہے خضر راہ کوئے یار — راہزن کی رہنمائی دیکھئے
کہہ رہی ہے آج ہم سے صبح وصل — لذتِ شام جدائی دیکھئے
کیسے گل بوٹے کھلے ہیں خاک پہ — دستِ قدرت کی صفائی دیکھئے
بلبل و گل قمری و شمشاد ہیں — عشق کی جلوہ نمائی دیکھئے
روح پرور ہے ہوا برسات کی — مردہ تن میں جان آئی دیکھئے
رنگ گل بھی اڑ گیا بو کی طرح — باد صرصر کی صفائی دیکھئے
بس شہرستان الفت دیکھئے — بادشاہوں کی گدائی دیکھئے
جو ملا ہم کو۔ ملا مطلب پرست — آج کل کی آشنائی دیکھئے
پھنس گئے دنیا کی دار و گیر میں — ہونی ہے کب تک رہائی دیکھئے
دیکھئے جاتی ہے کب جان حزار — آتی ہے کس وقت آئی دیکھئے

ہیں جہانگیری سرائیں منہدم ۔ دہر کی عبرت نمائی دیکھئے
اینٹ ۔ پتھر ۔ چونہ ۔ دیواریں تباہ ۔ حق نے کیا صورت دکھائی دیکھئے
دیکھئے تقدیر کی نیرنگیاں
فوق کی بخت آزمائی دیکھئے

برق دل کی بیقراری دیکھئے ۔ عمر کیا جلدی گذاری دیکھئے
پاس تک آتے نہیں مشکل کے وقت ۔ دوستوں کی پاسداری دیکھئے
اب تو بن بن کر بگڑ جاتے ہیں کام ۔ شومیٔ قسمت ہماری دیکھئے
گریۂ اغیار پر کیا غش ہیں آپ
فوق کی بھی آہ وزاری دیکھئے

؎ شاہان مغل (اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ عالمگیر) گجرات۔ بھمبر۔ نوشہرہ۔ راجوری۔ تھنہ اور بہرام گلہ کے رستے کشمیر جایا کرتے تھے۔ اسی رستہ کا نام پرانا شاہی رستہ ہے۔ چونکہ ان پہاڑی دشوار گذار رستوں میں برف وباراں کی وجہ سے خیمہ و خرگاہ بھی زیادہ مفید ثابت نہ ہوتے تھے۔ اس لئے جہانگیر نے سنہ ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) میں یہ حکم صادر کیا کہ کشمیر سے انتہائے کوہستان تک ہر منزل میں بادشاہ اور اس کے اہل حرم اور اہل کاروں کے لئے عمارات تعمیر کی جائیں۔ چنانچہ بہت جلد کشمیر سے بھمبر کی حد تک سرائیں اور مساجد تعمیر ہو گئیں۔

اب یہ سرائیں نہایت ردی حالت میں ہیں۔ چھت کا تو کیا ذکر کئی جگہ چار دیواری تک بھی غائب ہے مسجدوں کا تو کوئی نشان تک بھی نہیں ملتا۔ جب سے کشمیر جانے کے لئے "جہلم ویلی روڈ" اور "بانہال روڈ" تیار ہوئی ہیں۔ مہاراجہ اور ان کے وزرا اور دفاتر صاحبان انگریز اور دیگر سیاح انہی راستوں سے کشمیر کو جاتے ہیں۔ قدیم شاہی راستہ اب مقامی لوگوں کے لئے رہ گیا ہے۔ کوئی سیاح اس رستہ اب کشمیر نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس رستہ کی تمام شاہی عمارات اب کھنڈر کی صورت میں نظر آ رہی ہیں۔

جون ۱۹۰۴ء کے آخری ایام میں نے پونچھ میں گذارے۔ ۲۷ جون کو پونچھ سے کشمیر واپس روانہ ہوا۔ ۳۰ جون کی صبح کو جبکہ بارش کے بعد آسمان کھل چکا تھا اور ہوا سرد چل رہی تھی میں ایک ڈھکی کو طے کر رہا تھا۔ جو کوٹلی اور ناڑہ کے درمیان واقع ہے پہلے چار شعر اس ڈھکی کے درمیان اور اس سے اگلے چھ شعر ناڑہ کے پڑاؤ پر ۱½ بجے بعد دوپہر لکھے گئے۔ یہاں بارش اور تکان کی وجہ سے رات بھر ٹھہرنا پڑا۔ آدھی رات کے بعد ٹھیک ایک بجے چاندنی رات میں یہاں سے روانہ ہوا۔ ناڑہ اور میرپور چوکھ کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی آتی ہے۔ پہاڑ کے دامن سے لپٹی ہوئی آبشاروں کی سفید چادریں۔ ہو کا عالم۔ خوشگوار چاندنی۔ دماغ کی یکسوئی۔ یہ اسباب ایسے نہ تھے۔ جو گنگنانے پر مجبور نہ کرتے۔ چنانچہ مقطع کے اوپر کے چار شعر اس کیفیت نے اور موزوں کرا دیئے۔

اے عزیز من عزیز دل عزیز جاں ہے تو — مصر حسن و عاشقی میں یوسف کنعاں ہے تو
تجھ میں آبادی ہے ارمانوں کی اے صحرائے عشق — گرچہ میرے خانۂ دل کی طرح ویراں ہے تو
تجھ میں جلتے ہیں چراغوں کے عوض الفت کے داغ — آہ اے دل میری امیدوں کا گورستاں ہے تو
بے حقیقت کیوں ہے تو اے گوشۂ خلوت نشیں — گو ہے ویرانہ میں لیکن رشک صد بستاں ہے تو
تجھ میں پوشیدہ ہیں رنگا رنگ کی نیرنگیاں — جلوۂ قدرت کی مظہر سیر کوہستان ہے تو
اے فقیر عشق کیا پروا امیروں کی تجھے — ملک تسلیم و رضا و صبر کا سلطاں ہے تو
مٹ گئے جور فلک سے اچھے اچھے نوجواں — ہائے غفلت اس جوانی پر مگر نازاں ہے تو
بڑھ کے سو ساماں سے ہے تیرا یہ مجھ سے پوچھنا — کیا تری حالت ہے اور کیوں بے سر و ساماں ہے تو
ذوق سے تعریف کیا ہوگی ترے اشعار کی — شاعری ہے جسم اے اقبال اس کی جاں ہے تو
چھوڑ دے ملکی عمارت کے خیال خام کو — یہ جہاں مہماں سرائے ہے اور اک مہماں ہے تو
مانگ جو کچھ مانگنا ہے آج اے حسن طلب — خود وہ کہتے ہیں بتا کس چیز کا خواہاں ہے تو
عشق نے تجھ کو کیا پھر مثل بلبل نغمہ ریز — اے غزل اس درد شیریں کا مگر درماں ہے تو

دلی دروازے[1] رہا کرتا ہے فوقِ خستہ جاں
اس قدر کیوں جستجو میں اہلِ حیراں ہے تو

مشاعرہ اتحاد اور مشاعرہ قیصری ایک دوسرے کی ضد کی وجہ سے قائم تھے۔ منشی احمد حسین خاں بی اے جج ہو کر لاہور سے باہر چلے گئے۔ اور اتحاد ٹوٹ گیا۔ قیصری کی قیصریت بھی اتحاد کے ساتھ ہی تھی۔ میر ناظر حسین خاں ناظم مرحوم نے اپنا اخبار ناظم الہند پھر جاری کر دیا۔ اور وہ بھی مصروف ہو گئے۔ لاہور کے اہلِ سخن اور علم دوست حضرات کو ایک جدید مشاعرہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میر بشارت حسین صاحب جالب[2] دہلوی جو روزانہ پیسہ اخبار کے ایڈیٹر اور میرے استاد بھائی تھے۔ میرے دفتر (اخبار پنجہ فولاد) ہی کے قریب ایک احاطہ میں رہا کرتے تھے۔ ان کے مشورہ سے ایک جدید مشاعرہ کی طرح ڈالی گئی۔ مصرع طرح استاد داغ مرحوم کا یہ مصرع تھا ع یہ کہئے آپ میرے طلبگار کیوں ہوئے۔ پنجہ فولاد اور بعض دیگر اخبارات میں مصرع طرح چھپ جانے کی وجہ سے غزلیں تو باہر سے بھی آ گئیں لیکن افسوس مشاعرہ نہ ہو سکا۔ میں نے بھی ایک غزل لکھی تھی۔ جو ذیل میں درج ہے۔

---

[1] دہلی دروازہ لاہور کے اندر برسوں تک قیام رہا۔ ایک تنگ اور مختصر سی گلی میں قیام تھا۔ منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت مرحوم جھنجھانوی جو استاد داغ کے بہترین شاگردوں میں تھے۔ اپنی خاص طبیعت کے باوجود نہایت زندہ دل تھے انہوں نے شالامار باغ میں ایک دفعہ چار یاری مشاعرہ قائم کیا جس میں راقم الحروف خود وجاہت صاحب۔ ڈاکٹر عبد الحکیم بسمل ہوشیارپوری اور منشی فیاض احمد فیاض فاروقی انسپکٹر پولیس جودھپور شریک تھے۔ مصرع طرح یہ تھا ع فوق صاحب گلی میں رہتے ہیں۔

[2] میر جالب لاہور سے لکھنؤ جا کر ہمدم کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے اپنا ایک ذاتی اخبار ہمت کے نام سے جاری کر رکھا تھا۔ جولائی ۳۲ء میں چند روز کی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کا اخبار ان کے صاحبزادہ میر عشرت حسین کی ہمت و کوشش سے اب تک جاری ہے۔

آنکھیں کھلیں تو مائل پندار کیوں ہوئے
غفلت ہی ہمکو خوب تھی ہشیار کیوں ہوئے

پوچھا یہ کیا؟ ہمارے طلبگار کیوں ہوئے
یہ کہیئے آپ اتنے طرحدار کیوں ہوئے

غافل یہ شرع عشق کی گر پیروی نہیں
منصور جیسے زیب سر دار کیوں ہوئے

حیرت نے کی زباں جو دم عرض حال بند
بولے کہ چپ ترے لب اظہار کیوں ہوئے

دیکھا جو پھول دست نگارین یار میں
کھاتے ہیں خار خار کہ ہم خار کیوں ہوئے

نکلے نہ تم مکان سے باہر کبھی ۔ مگر
مشہور شہر و کوچہ و بازار کیوں ہوئے

وہ پوچھتے ہیں وقت عیادت یہ بار بار
تم میری آنکھ دیکھ کے بیمار کیوں ہوئے

دس بیس خم شراب کے خالی کئے نہ کیوں؟
زاہد ذرا سی پی کے سیہ کار کیوں ہوئے

کیسا ستم ہے کر مرا دل یہ پوچھنا
مجبور آپ کیوں ہوئے ناچار کیوں ہوئے

ظالم نے حلق پر سے اٹھا لی یہ کہہ کے تیغ
تم آپ قتل ہونے کو تیار کیوں ہوئے

وعدہ تھا مجھ سے خلوت عیش و نشاط کا
تم آج زیب محفل اغیار کیوں ہوئے

موسیٰ و برق طور کا قصہ سنا نہیں
کیا پوچھتے ہو طالب دیدار کیوں ہوئے

جب کچھ نہیں تمیز سیاہ و سفید میں
ہم محو عشق زلف و رخ یار کیوں ہوئے

جب تجھ میں شاہد ازلی کی نہیں ہے شان
تیرے مطیع کافر و دیندار کیوں ہوئے

ان کو یہ شوق ہے کہ بڑھائیں ستم کی مشق
ہم کو یہ رنج ہے وہ دل آزار کیوں ہوئے

عشاق کو مزا نہیں ملتا جو عشق میں
دنیا کی لذتوں سے وہ بیزار کیوں ہوئے

انگلش زبان ہی سے جو نا آشنا ہو تم
اے ذوق پھر ایڈیٹر اخبار کیوں ہوئے [۱]

---

[۱] میں ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں کشمیر میں تھا۔ راجہ غلام محمد خاں صاحب جاگیردار ذیلدار تحصیل ہندواڑہ کے پاس مقیم تھا۔ کہ ایک برقعہ پوش عورت سے جو راجہ صاحب کے پاس ہی بیٹھی تھی راجہ صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سنتے ہی اس نے کہا بھائی ذوق! (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱ پر دیکھئے)

سنہ ۱۹۰۴ء کی سیاحت وسط ہند کا کلام

سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک کتاب بنام یادِ رفتگانِ ہند مسلمان صوفیائے لاہور کے حالات میں میں نے لکھی اس کا مسودہ راجہ رگھبیر سنگھ آنجہانی والئے ریاست میہر (سنٹرل انڈیا) کو ان کے نام نذر کرنے کی خاطر دکھایا گیا۔ وہ صوفی منش بے تعصب اور وسیع القلب راجہ تھے۔ انہوں نے مسودہ کی پسندیدگی کے بعد ایک سو جلدوں کی خریداری کا حکم دیا۔ ان کے میر منشی لالہ شاردا پرشاد میرے دوست تھے۔ انہوں نے لکھا خود آئیے۔ رقم بھی لے جائیے اور مل بھی جائیے۔ میں ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء کو لاہور سے روانہ ہوا۔ گاڑی رات کے گیارہ بجے انبالہ پہنچی۔ لاہور سے انبالہ تک اس غزل کے ابتدائی پانچ شعر کہے گئے۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ جب کروٹ بدلی۔ تو معلوم ہوا کہ دہلی کا سٹیشن ہے۔ اور صبح کے ۶ بج چکے ہیں۔ چھٹا اور ساتواں اور مقطع کا شعر دہلی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰) یہ آپ ہی کی غزل ہے جس کا یہ شعر ہے ؎ دس میں خم شراب کے خالی کئے نہ کیوں۔ زاہد ذرا سی پی کے سیہ کار کیوں ہوئے۔ ساتھ ہی پانچ سات شعر اس غزل کے سنا دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام جنت نور تھا۔ تریہگام کے متصل اس کا وطن ہے لیکن بالعموم وہ اب وہاں ہی رہتی ہے وہ بھی اس طرح سے صبر کرتے ہی نہیں ہیں عاشق بدنام کہیں۔ دن کہیں ہیں رات کہیں ہیں صبح کہیں شام کہیں ہیں۔ قرآن شریف پر اس کو بہت عبور ہے۔ اور نہایت خوش الحانی اور درد دل کے ساتھ پڑھتی ہے۔ بعض وقت الٰہی تباہی باتیں بھی شروع کر دیتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں میں اسے تریہگام میں ڈاکٹر غلام محمد صاحب افسر انچارج ہسپتال کے مکان پر دوبارہ ملا۔ اس کو بہت سے اردو فارسی کے شعر یاد ہیں۔ لاہور دیکھنے کی اس کو بڑی تمنا تھی۔ سنہ ۱۹۲۹ء کے دسمبر میں ڈاکٹر غلام محمد کے ہمراہ آخر لاہور بھی دیکھ گئی۔ اور کئی دن تک میرے مکان پر رہی۔ اس مرتبہ اس نے نقاب اٹھا دیا تھا۔ عمر اس کی ۵۰ سال کے قریب ہے۔ تعلیم اس نے اپنے باپ سے حاصل کی ہے جو ابھی تک زندہ ہے۔

سٹیشن پر کہا گیا ۔ آٹھواں اور نواں شعر ۱۰ ۔ اکتوبر کو دموہ کے سٹیشن پر اور آخری دو شعر میہر کے سٹیشن پر صبح کے ۹ بجے کہے گئے ۔

آنکھ رونے کے لئے ہے لب ہنسی کیواسطے
عیش و غم کے ہیں یہ ساماں آدمی کیواسطے

بے ثباتی ہے جہاں میں زندگی کیواسطے
جز بقائے حق بقا ہے کب کسی کیواسطے

غم جب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں ہے مدتوں
عیش دنیا ہے گھڑی یا دو گھڑی کیواسطے

دین کی پابندیوں کے ساتھ ہے دنیا کی شرط
ہائے کیا کیا قیدیں ہیں آدمی کے واسطے

چار آنسو جو بہاتا اور ایسا کون تھا؟
شام غربت رو دی میری بیکسی کیواسطے

جلوۂ قدرت ہے تو ہاں اے شعاع آفتاب
تیری آمد ہے جہاں میں روشنی کیواسطے

ہائے اے نظارۂ کشمیر اے مخمل کے فرش
چشم وا رہتی ہے تیری دید ہی کیواسطے

باعث ایجاد عالم شافع روز جزا
مرتبے ایسے ہزاروں ہیں نبی کیواسطے

غافلو! دنیائے دوں رکھتی نہیں ہے ثبات
مرتے ہو کیا چار دن کی زندگی کیواسطے

شرم دنیا ہے نہ خوف حق نہ پاس ننگ و نام
بے حیائی بڑھ گئی بے پردگی کیواسطے

ملک کی خدمت اگر ہوتی نہیں تجھ سے تو کیا؟
فوق ۔ کوئی کام کرلے قوم ہی کے واسطے

اسی سفر میں ۱۶ ۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو ½۱ بجے بعد دوپہر آگرہ سے گوالیار کے درمیانی سٹیشنوں پر چلتی گاڑی میں یہ غزل کہی گئی ۔

حال دل ہم انہیں اس طرح جتا دیتے ہیں
شعر اقبال کے دو چار سنا دیتے ہیں

بدلے گالی کے دعائیں نقد دیتے ہیں
ہائے یہ لوگ بھی کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں

بے زبانی میں بھی اے کہنے والے سن رکھ
لب خاموش سے ہم تجھکو دعا دیتے ہیں

حسن کی شرکت کبھی کی ہم نے مصیبت میں ترک
وقت مشکل وہی اب ہم کو دغا دیتے ہیں

کیوں نہ اڑ جائے بدن سے تپ غم کی آتش
اپنی آنچل سے وہ خود دامن کو ہوا دیتے ہیں

نظم اقبال بھی بے چین تو کرتی ہے مگر
تیرے اشعار بھی اے ذوق مزا دیتے ہیں

میہر ایک چھوٹی سی ریاست ستنا ریلوے جنکشن کے پاس ہے۔ لالہ سارداپرشاد میر منشی وہاں تھے۔ میں سید ھا ان کے مکان پر گیا۔ جہاں آٹھ دس دن تک مجھے رہنا پڑا۔ ایک دن۔ (۲۷- اکتوبر ۱۹۰۸ء کو دو بجے دن کے) میہر کی مشہور مصفا ندی پر نہانے گیا۔ وہاں پہاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ ندی خاموشی کے ساتھ بہ رہی تھی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پانی کے اندر دوڑ رہی تھیں۔ ایک طرف کنارے پر آموں کے بیشمار درخت پھل سے لدے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان پر ایک کالی گھٹا اٹھی۔ برستی تو نہیں لیکن ہوا کو خوشگوار بناکر مندرجہ ذیل غزل کی تحریک و ترغیب کے اسباب پیدا کر گئی۔ ؎

ذوق کیوں گمنام ہے کچھ نام کر ۔۔۔ نام کی خواہش ہے تو کچھ کام کر
نفس کافر ہے بغل میں رام کر ۔۔۔ یاد اے بندے خدا کا نام کر
اے دل اس سے وصل کا پیغام کر ۔۔۔ خدمت نامہ بری انجام کر
مدعی نے کر دیا رسوا تجھے ۔۔۔ اب نہ ہم کو مورد الزام کر
کوچہ گردی کر نہ اے شوریدہ سر ۔۔۔ دامن کہسار میں آرام کر
عارض و گیسو کا رکھ اے دل خیال ۔۔۔ سیر ان دونوں کی صبح و شام کر
جب کہا دل کو پرکھ لو دیکھ لو ۔۔۔ لو لے جا بازار میں نیلام کر
در پہ اے ظالم کھڑے ہیں صاحب شان ۔۔۔ مثل نادر حکم قتل عام کر

ذوق خدمت کر کوئی اسلام کی
ترک ورنہ دعوئے اسلام کر

راجہ صاحب میہر بیمار تھے۔ ۲۲- اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ان کا غسل صحت تھا۔

لالہ سارداپرشاد میر منشی کے ایماسے میں نے مندرجہ ذیل چھ شعر ۲۰ اکتوبر کی سہ پہر کو میر منشی صاحب ہی کے مکان پر لکھے۔ جو دربار میں راجہ صاحب کے سامنے خود میں نے پڑھے اور انہوں نے قولاً و عملاً اپنی پسندیدگی و قدردانی کا اظہار فرمایا۔

ہر وقت مبارک تجھے ہر بار مبارک
صحت رہے اے شاہ خوش اطوار مبارک

جو تیری خوشی ہے وہی عالم کی خوشی ہے
ہر شخص نہ کیونکر کہے ہر بار مبارک

ہر سال مبارک ہو دسہرہ کا یہ تہوار
ہر سال رعایا کہے سرکار مبارک

جو فتح کا ہمدم ہو وہ اقبال سلامت
سر کاٹے جو دشمن کا وہ تلوار مبارک

تو آپ بھی فرزانہ ہے عمال بھی دانا
یہ قافلہ اے قافلہ سالار مبارک

ہوتی ہے مقدر ہی سے شاہوں کی زیارت
اے دیدۂ بیدار یہ دیدار مبارک

ستنا میں جو بگھیل کھنڈ کی تمام ریاستوں کا سنٹر ہے۔ اور ایک خوش نما چھوٹا سا شہر ریاست ریواں کے علاقہ میں ہے۔ گوجرانوالہ کے بابو نورالدین سٹیٹ انجنیر مرحوم اور ہمارے لاہور کے ہموطن بابو عنایت حسین کے قیام کی وجہ سے دو تین دن قیام کرنا پڑا۔ یہاں اخبار پنجہ فولاد کے کئی اور بھی خریدار تھے۔ جن میں کپتان محمد سلطان حسین صاحب جو آجکل ریواں میں ایک معزز عہدہ پر ہیں۔ پنجہ فولاد کے بند ہونے کے بعد اب تک اخبار کشمیری کے خریدار چلے آتے ہیں۔ یکم نومبر کی صبح کو ۶ بجے جبکہ ابر کی وجہ سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بابو عنایت حسین صاحب نے یہ مصرع پڑھا ع نباہ ہے جلتے ہیں جب تک نباہ دیکھتے ہیں۔ میں نے اس پر حسب ذیل چند شعروں کی غزل لکھی۔

ہمارا حال جو وہ گاہ گاہ دیکھتے ہیں
بہت بگڑتے ہیں جب لب پر آہ دیکھتے ہیں

کبھی ملے بھی تو وہ بزم غیر ہی میں ملے
یہی نظارے ہم آنکھوں سے آہ دیکھتے ہیں

نہیں ہے ڈر فلک کینہ ساز کا ہم کو
کسی کی گردشِ چشمِ سیاہ دیکھتے ہیں

مرے گلے پہ وہ تلوار رکھ کے کہتے ہیں
ہم اپنے چاہنے والے کی چاہ دیکھتے ہیں

کبھی ادھر بھی نکل آ تو عیدِ عشق کے چاند
کہ بن کے ہم ہمہ تن چشم راہ دیکھتے ہیں

وفا کی بو نہیں ہر چند ان حسینوں میں
نباہے جاتے ہیں جب تک نباہ دیکھتے ہیں

کبھی شکایتِ جور و ستم جو کرتا ہوں
وہ کس غضب سے خدا کی پناہ دیکھتے ہیں

قیامِ رنگِ جہاں کو نہیں کسی صورت
سفید دن کو تو شب کو سیاہ دیکھتے ہیں

خدا کی بارشِ رحمت نے دھو دیا کیا فوق
سفید ہم تری فردِ گناہ دیکھتے ہیں

ستنا کے بعد احباب کی کشش خاص ریواں لے گئی۔ جو ستنا سے قریباً ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آموں کے پھلدار درختوں نے سرزمین کو خوب رونق دے رکھی تھی۔ ریواں کے پاس ہی دریائے گھوگھر بہتا ہے جس کا پانی بعض مقامات پر پتھروں سے ٹکرا کر دودھ کی ایک سفید چادر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ یہاں حافظ سرفراز احمد وکیل دربار آصف۔ شیخ الہی بخش آثر تلمیذ حضرت امیر مینائی۔ منشی محمد نوح صاحب نوح[1] (آرہ ضلع الہ آباد) تلمیذ حضرت استاد مرزا داغ مرحوم اور دیگر اہلِ سخن و اہلِ علم حضرات سے نیاز حاصل ہوا جناب نوح کا دیوان مکمل تھا استاد کا ایک سرٹیفکیٹ بھی ان کے پاس موجود تھا کہ وہ میرے بہترین شاگردوں میں ہیں۔ اور کلام بہت اچھا کہتے ہیں۔ جناب نوح بالکل نوجوان ہیں۔ اور اس عمر میں کلام کی یہ پختگی۔ زبان کی سلاست اور شستگی ان کی قابلیت

[1] جناب نوح کے دو دیوان چھپ چکے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ان کے کلام کی بہت شہرت ہے اور وہ کئی شاگردوں کے استاد ہیں۔ آرہ میں ایک بہت بڑی زمینداری کے مالک ہیں۔ راقم سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی ہے۔

کی دلیل ہے۔ شیخ الٰہی بخش صاحب آثر کے کلام سے بھی محظوظ ہوا۔ حافظ سرفراز احمد کے فرزند شیخ اشتیاق احمد اشتیاق تخلص کرتے تھے۔ اور نہایت چھوٹی عمر ہی میں شعر گوئی کا شوق رکھتے تھے غرض وہاں جتنے دن رہا شعر شاعری کے چرچوں سے مسرت خاص حاصل ہوتی رہی ۳-۴-۵ نومبر ۱۹۰۴ء کے متفرق اوقات میں کبھی کبھی کوئی شعر زبان پر جاری ہو جاتا تھا۔ انہی کا مجموعہ ذیل کی بے مطلع غزل ہے۔

حشر کے دن تابش خورشید ٹھنڈی ہو گئی — ابر رحمت گا گنہگار دل پہ جب سایا ہوا
کہتے ہو حسرت بھری شے ہم نہیں کرتے پسند — پھیر دو پھر خدا تم میرا دل آیا ہوا
لگ گئی ہے اس کو جس دن سے ہوائے گرم عشق — دیکھتا ہوں غنچۂ خاطر کو مرجھایا ہوا
تیرا عاشق ہے جو زلف و خال کا سودا زدہ — دیکھ دشت و کوہ میں پھرتا ہے گھبرایا ہوا
ایک دن رکھنے نہ دے بنیاد قصر عیش کی — یاد ہے ہم کو وہ ظالم کا ستم ڈھایا ہوا

لطف اے کان کرم گر آج تو خالی نہ جائے
آرزوئیں تیرے در پہ لے کے فوق آیا ہوا

(سنٹرل انڈیا کے سفر سے واپسی پر بمقام ریلوے سٹیشن جھانسی ۶ بجے شام ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ء)

فصل گل ہے رحم او صیاد کر — لے اس موسم میں تو آزاد کر
مٹ گیا یا رب نشان زندگاں — ہو چکے برباد اب آباد کر
ملزم عشق آگیا در پر ترے — منصفی کر خواہ اب بیداد کر

تو کہاں سے آگیا اے درد عشق
جا کسی عاشق کا دل آباد کر

(چلتی ٹرین میں آگرہ سے گوالیار تک ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء)

وہ بت مہرباں تھا خفا ہو رہا ہے — الٰہی وہ کیا تھا یہ کیا ہو رہا ہے
صبا دیکھ گلشن میں کیا ہو رہا ہے — کہ یوں ذکر صل علیٰ ہو رہا ہے

ستاتے ہو مجھکو میں دم توڑتا ہوں — بُرا کر رہے ہو بُرا ہو رہا ہے
طبیعت تری اور مجھ پر ہو مائل — ادا تیرے منہ سے یہ کیا ہو رہا ہے
ترے درد میں ہے قیامت کی لذّت — مزا مل رہا ہے مزا ہو رہا ہے
جفا کرنے والا تُلا ہے جفا پر — فدا ہونے والا فدا ہو رہا ہے
بُرے دن بھلا اس سے کیا ہونگے بڑھکر — بھلا کر رہا ہوں بُرا ہو رہا ہے
جو کل تھا عنایات بے حد کے لائق — وہی آج وقفِ جفا ہو رہا ہے
بدل دی ہے شکل ایسی کچھ مفلسی نے — کہ نا آشنا آشنا ہو رہا ہے

چلو حالت فوق بیمار دیکھیں
کہ وقفِ دوا و دعا ہو رہا ہے

۱۹۰۵ء کی سیاحت وسط ہند کا کلام

ایک افسردہ دل

بندھیل کھنڈ اور بگھیل کھنڈ کی ریاستوں میں میرے اخبار پنجہ فولاد کی بہت اشاعت اوران ریاستوں میں اس کی اس قدر اہمیت تھی کہ اکثر والیان ریاست کے علاوہ نوگاؤں اور ستنا کے پولٹیکل ایجنٹ صاحبان بھی اس کے خریدار تھے۔ نوگاؤں ایجنسی میں اجے گڑھ ایک ریاست ہے جس کے فرمانروا مہاراجہ سر رنجور سنگھ کے سی ایس آئی اخبار کے خاص قدردان تھے۔ وہ علم دوست بھی تھے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے ایک کتاب بنام آئینہ کاشتکاری سردار بسا دا سنگھ دسکنہ قادیان پنجاب ا ناظم ریاست کی وساطت سے مجھے بھی چھاپنے کو ملی۔ وہ کتاب میں چھاپ کر اور ہمراہ لے کر ۲۸ ستمبر ۱۹۰۵ء کو اجے گڑھ کے لئے لاہور سے روانہ ہوا۔ ۲۹ ستمبر کو $2\frac{1}{2}$ بجے دن کے گوالیار ریلوے سٹیشن سے دتیا ریلوے سٹیشن کے درمیان نظم عنوان بالا کا پہلا بند

اور دوسرا بند اسی تاریخ کی شام کو جھانسی کے سٹیشن پر تیسرا بند ۲۵ اکتوبر کو خاص اجے گڈھ میں اور چوتھا اور پانچواں بند لاہور واپس پہنچکر نومبر کے ابتدائی دنوں میں لکھا گیا۔ اجے گڈھ میں نواب شمشیر بہادر اخگر اور ان کے بھائی نواب عظمت علی خان کے ساتھ اکثر شعر اشعار کا چرچا رہتا تھا۔ اخگر بڑے قادر الکلام اور جہیر الصوت شاعر تھے ۱۹۲۷ء میں انتقال کر گئے۔

تجھے ذوق ناداں یہ کیا ہو رہا ہے کہ تو جان سی شے کو یوں کھو رہا ہے
نہیں حال کھلتا طبیعت کا تیری کبھی ہنس رہا ہے کبھی رو رہا ہے
کبھی روٹھ جانا کبھی من بھی جانا سبک سب کی نظروں میں کیوں ہو رہا ہے
محبت نہیں دیکھ خوب ان گلوں کی تو کیوں کانٹے اپنے لئے بو رہا ہے
تصور ہے کس کے عرقناک رخ کا کہ یوں منہ کو اشکوں سے تو دھو رہا ہے
ڈبو کر رہے گا ترا ہائے رونا
خدا کے لئے بند کر رونا دھونا

کبھی بزم یاراں کی تھی تجھ سے زینت کبھی مل کے کرتے تھے ہم عیش و عشرت
کبھی رنگ رلیوں میں کٹتی تھیں راتیں کبھی وہ بھی دن تھے کہ تھی خوش طبیعت
کبھی سیر قبر جہانگیر شہ تھی کبھی قبر نور جہاں پر تھی رقت
کبھی سیر دریا کی تھیں دل میں موجیں چراغوں کے میلہ میں گہ گرم صحبت
کبھی تم سے رونق تھی بزم سخن کی نمایاں تھا بشرے سے جوش مسرت
سبب اپنی افسردگی کا بتا کچھ
ذرا حال تو اپنے جی کا بتا کچھ

یہ مانا کہ خو ہے تجھے خامشی کی نہ عادت تھی پر اس قدر بے رخی کی
گریباں پھٹا ہے تو ہے چاک دامن نہ کر مٹی برباد تو سادگی کی

تجھے میرے سر کی قسم اب بتا دے کہاں دل لگا یا کہاں دل لگی کی
مزا زندگی کا نہیں تلخ ناحق حلاوت ہے یہ عشق کی چاشنی کی
کبھی آہیں بھرنا کبھی سر بزانو نہیں قدر تجھکو ذرا زندگی کی

دو بارہ نہیں پھر کے دنیا میں آنا
غنیمت ہے یاروں سے ملنا ملانا

نہ کر مفت برباد اپنی جوانی ذرا بیٹھ یاروں میں کر شادمانی
مزے میں کسی روز آ کر سنا دے ہمیں اپنے منہ سے سب اپنی کہانی
سکوت آج کل کیوں یہ آٹھوں پہر ہے وہ پہلے کی اب کیا ہوئی خوش بیانی
اگر یونہیں حالت ہے تیری تو اک دن سمجھ لیں گے ہم خود ہی راز نہانی

مگر دیکھ اچھی نہیں یہ کدورت
ملاتا ہے کیوں خاک میں اپنی صورت

خدا کے لئے اب بھی دل کو سنبھالو نہ سر پر مصیبت کی ناحق بلا لو
جوانی کے دن ہیں امنگوں کی راتیں اٹھو حوصلے اپنے دل کے نکالو
جو دو چار دلسوز احباب میں ہوں انہیں اپنی بزم طرب میں بلا لو
زمانہ میں رہ کر چلو چال ایسی کہ دشمن کو بھی دوست اپنا بنا لو
کہے دیتے ہیں ہم کہے دیتے ہیں ہم کہ تم دل سے گھر میں غموں کو نہ پالو

ہمارا اگر تم نے کہنا نہ مانا
سمجھ لو نہیں پھر کہیں بھی ٹھکانا

کوٹھی ایک چھوٹی سی ریاست کا نام ہے۔ جو ستنا سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہے ہم دو تین دوست ۸۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو صبح سویرے ہی پیدل سیر کرتے ہوئے وہاں چلے گئے۔ رستہ میں پانچ شعروں کی غزل مرتب ہو گئی۔

مرے تلووں کے چھالوں کی جلن کچھ اور کہتی ہے
اگرچہ سرگرمئے حب وطن کچھ اور کہتی ہے

شکایت پہلے سنتے تھے عدو کی نارسائی کی
ہمیں سے اب تمہاری انجمن کچھ اور کہتی ہے

لڑکپن کی ادائیں چھوڑ دے عہد شباب آیا
گلے سے لگ کہ اب دل کی لگن کچھ اور کہتی ہے

زمانہ عیش و عشرت میں جو گذرا اس کا کیا کہنا
مگر اب آمد رنج و محن کچھ اور کہتی ہے

کسے منظور ہے یوں مفت میں نذر اجل ہونا
مگر اے فوق اب دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے

(۱۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء بمقام لبے گڈھ سنٹرل انڈیا صبح ½ ۹ بجے)

ہے تیرا نام جپنے کو مرے منہ میں زباں میری
ترے نظارہ کو آنکھوں میں ہیں پتلیاں میری

در و دیوار پھاڑے کھاتے ہیں تری جدائی میں
نہ کیوں اب زندگی دو بھر ہوئے آرام جاں میری

تمہارا امتی ہوں نار دوزخ سے بچا لینا
خدارا یا محمد لاج رکھ لینا وہاں میری

مری بنیا ہوں پر ہائے اے ظالم ترا کہنا
نہ خود بدنام ہو ناداں نہ کر رسوائیاں میری

ہوس دنیا کی دولت کی تجھے دیں کی طلب مجھکو
خدا سے بات رہجائے یہاں تیری وہاں میری

نہ کیونکر اپنی نظمیں ہوں مجھے بیحد پسند اے دل
کہ ہر اک شعر میں لکھی ہوئی ہے داستاں میری

جتائے چرخ نے آثار پیری کر دیئے ظاہر
بہت ہی جوش پر اے فوق تھی طبع جواں میری

میں لبے گڈھ ہی میں تھا کہ پنجابی کے ایک پرانے شاعر بردہ کا یہ مشہور مصرع میری زبان سے نکل گیا ع بردہ سیاں درختاں دی کرے راکھی پھل پکے تے کھان نصیب والے۔

نواب شیر بہادر انگر میرے پاس بیٹھے تھے کہنے لگے اس مصرع کا کیا مطلب سمجھا ہے۔ کچھ نہیں سمجھا۔ پنجابی زبان سے ناواقف ہوں۔ ذرا مطلب سمجھا دیجئے۔ میں نے تھوڑے سے فکر کے بعد کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے ؎

والے ناکامی جواں ہو کر ہوئے وہ نذر غیر
پک گیا جب پھل تو دشمن آئے کھانے کیلئے

۱۵ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو اسی زمین میں چند اور شعر کہکر نواب شمشیر بہادر[۵] کو سنائے۔

انتہائی حکم ہے میرے ہی آنے کے لئے
ورنہ ان کا در کھلا ہے اک زمانے کے لئے

چین سے کٹتی تھی اچھی یا بری تھی زندگی
درد عشق آیا کہاں سے دل دکھانے کیلئے

واہ رے تاثیر گریہ ان کو کہنا ہی پڑا
دیدہ کو ہے آنکھ یار دلنے رلانے کے لئے

دوستی کے بھیس میں دشمن ہوئے اہل وطن
دشت غربت ہے فقط بخت آزمانے کیلئے

تونے کی صیاد کیسی خانہ ویرانی مری
چار تنکے بھی نہ چھوڑے آشیانے کے لئے

اپنے بیگانوں نے آنکھوں سے گرایا مثل اشک
تو ہی آجا اے اجل مجھکو اٹھانے کے لئے

واہ رے نیرنگ الفت میں نے دیکر ایک دل
کلفت و درد و الم سارے زمانے کے لئے

عشق پنہاں عاشقوں کا حسن بے پردا ترا
وہ چھپانے کے لئے ہے یہ دکھانے کے لئے

موت یوں کرتی ہے اک گل چراغ زندگی
جیسے صرصر شمع کو آئے بجھانے کے لئے

ہائے ناکامی جواں ہو کر رہے وہ نذر غم
پاس آگیا جب پھل تو دشمن آئے کھانے کیلئے

کوئی زنداں میں گیا تو ہو گیا کوئی بری
حکم ہے اک قوم کو باقی ستانے کے لئے

(۲۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو راجگڑھ میں صبح کے وقت)

مٹی میں مل رہے ہیں ہندوستان والے
دوزخ میں جل رہے ہیں جنت نشان والے

اک تو کہ تیرے خواہاں سارے جہان والے
اک ہیں کہ میرے دشمن خود خاندان والے

گر کر سنبھل رہی ہیں دنیا کی ساری قومیں
سنبھلیں گے کب الٰہی ہندوستان والے

میرا بیاں بھی جھوٹا میری زباں بھی جھوٹی
تو ہی ہے ایک سچا سچی زبان والے

---

[۵] نواب شمشیر بہادر افسر، ریاست راجگڑھ سنٹرل انڈیا کے رئیس اور جاگیردار تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ بڑے وجیہ جوان تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بھائی نواب عظمت علیخاں بھی شاعری کا شوق رکھتے ہیں۔

اہل زمیں نے ہم پر جو کچھ ستم کیے ہیں / مخفی نہیں ہیں تجھ سے اے آسمان والے
مانند شمع مجھکو حیرت سے تکتے ہیں / ہیں بے زبان گویا سامنے زبان والے
دیکھیں ذرا ملا ایک رفعت تو خاک کیوں کی / اہل زمیں کے تابع سب آسمان والے
مجھکو عزیز تو ہے تجھکو عزیز ہیں ہوں / پھر کیوں ستاتے ہیں یہ درمیان والے
چاہے تو ڈال دے وہ دوزخ میں زاہدوں کو / کس وہم میں پڑے ہیں وہم و گمان والے

اک بات مختصر ہے عاشق ہے شوق تجھ پر
قصہ بنائیں اس کا اب داستان والے

ستنا اور لچھے گڈھ کے درمیان ایک ریاست پنّا کے نام سے ہے۔ ۲۵ اکتوبر کو میں لچھے گڈھ سے واپس ہوا۔ پنّا تک گھوڑے کی سواری تھی۔ وہاں سے شکرم گاڑی ستنا تک چلتی تھی۔ دو دن تک گاڑی نہ مل سکی۔ ۳۰ اکتوبر و ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے دو دن ہمیں گذارنے پڑے۔ یہ غزل وہیں کے قیام کی یادگار ہے۔

مے کشی سب چھوڑ بیٹھے سن کے بیزاری مری / کر گئی آزاد عالم کو گرفتاری مری
عزم تو تھا ملک عدم کا ہے یہ ناداری مری / ایک دنیا دیکھنے آئی ہے تیاری مری
ان کے دل میں ہے تماشا ہے عزاداری مری / منتہی ہو موت پر اے کاش بیماری مری
تم کو سجدہ نا سکے تکبر نے کیا رسوائے حشر / باعث بخشش مری ہے شرم گنہگاری مری
کیوں نہ اس نعمت پہ اکثر انھیں کر دوں نثار / ہے خوشی کا مشغلہ ان کو دل آزاری مری
مجھکو ترغیب محبت نفرت اس کو ہے مری / اس کو تحریک جفا کاری وفاداری مری
اور کیا ہو گا مری برگشتہ بختی کی زباں / غیر کو سرمایہ دولت ہے ناداری مری
میں نے سمجھا عشق میں تسلیم کو فرض عظیم / اس نے جانا کارگر ہو گی ہے عیاری مری
عمر بھر جس کے لیے میں جان فدا کرتا رہا / ایک دن بھی آہ اس نے کی نہ دلداری مری
سمت کعبہ سے کھنچے آئیں گے بادل زاہدو / جاذب باران رحمت ہو گی مے خواری مری

مضمر اس ریش خضابی میں ہے سودائے شباب
رنگ لائی فوق پیری میں سیہ کاری مری

(یکم نومبر ۱۹۰۵ء کو پنا اور ناگودے کے درمیان متحرک گاڑی کے اندر)

کب یاد خدا زاہد مکار کریگا | تسبیح ریائی پہ اظہار کرے گا
اک میں کہ پابند ہوں گا بیا وعدہ امیدیں | اک وہ ہے کہ اقرار پہ انکار کرے گا
اس وقت قیامت کی ہیں آئی ہیں نیندیں | کب دیکھیں زمانہ ہمیں بیدار کرے گا
جب ضبط کا یارا نہ رہے گا مرے دل کو | فریاد ترے ظلم کی ناچار کرے گا

اے فوق رہا خوف اگر مال کا جاں کا
پھر کاہے کو جاری کوئی اخبار کرے گا

۲۰ نومبر ۱۹۰۵ء کو میں اودے پور (میواڑ) میں تھا۔ لاہور اور دہلی وغیرہ کے مقامات کے اور بھی اصحاب وہاں موجود تھے۔ ۲۸ نومبر کو واپسی کے وقت ریل گاڑی ہی میں سید محمود عالم صاحب محمود دہلوی خلف سید میر عالم صاحب مالک خیر خواہ عالم دہلی نے ایک طرح بتائی ع گھر بھی اب گھر نہ رہا دامنِ صحرا ہو کر۔ اودے پور سے چتوڑ تک جو ساٹھ ستر میل کا فاصلہ ہے۔ ریل کی سڑک عجیب چکر کھاتی ہے۔ سبزہ زار اور پہاڑ کے نظارے نزول باران رحمت۔ کیفیتیں طبیعت کو جنبش دینے کے لئے کافی تھیں۔ مندرجہ ذیل چار شعر تیار ہو گئے۔

یوسفِ مصر بھی گر آئے زلیخا ہو کر | آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں ترا شیدا ہو کر
مدد اے جلوۂ نظارۂ محبوب خدا | آنکھیں بیکار ہوئی جاتی ہیں بینا ہو کر
بات وہ کر کہ ہو جس سے دلِ بیمار کو فرحت | دشمنِ زیست ہوا کیوں تو مسیحا ہو کر

ملتی ہے اس کو بدی خلق سے نیکی کے عوض
کیا بُرے پائے ہیں پھل فوق نے اچھا ہو کر

نالۂ دل خراش

۱۹۔ اگست ۱۹۰۶ء کی صبح کو نماز فجر کے وقت میری ہمشیرہ عزیزہ نے چار پانچ ماہ کی علالت کے بعد بعمر ۱۸ سال گھرتل ضلع سیالکوٹ میں انتقال کیا۔ اس سے پہلے گو بہت سے جوان عزیز سپرد خاک ہو چکے تھے لیکن اس موت کا صدمہ اس لئے زیادہ محسوس ہوا کہ آج تک کسی کو اپنی آنکھوں سے دم توڑتے اور دنیا سے رخصت ہوتے نہ دیکھا تھا۔ ہمشیرہ مرحومہ کی موت نے وہ کام کیا جو نشتر پھوڑے سے اور فصاد رگ سے کرتا ہے ۲۲۔ اگست کو وزیرآباد سے کلکتہ میل پر جب لاہور واپس آنے کے لئے سوار ہوا۔ تو چلتی ٹرین ہی میں درد دل سے بیتاب ہو کر مندرجہ ذیل شعر نکل گئے۔

یا الٰہی اس طرح کا دل کو لاحق غم نہ ہو ۔۔۔ نوجواں معصوم کا اس شور سے ماتم نہ ہو
عالم فانی میں ہے ہر چیز کی اک انتہا ۔۔۔ یہ کوئی انصاف ہے غم ہو کبھی وہ کم نہ ہو
ہم تو سر تا پا گنہ ہیں۔ ہمیں کوئی شک نہیں ۔۔۔ تو ہے آقا تجھکو زیبا ہے کہ تو برہم نہ ہو
ہم نے یہ مانا کہ ہے تخلیق انساں بہر غم ۔۔۔ ساتھ اس کے یہ بھی ہونا چاہئے پیہم نہ ہو
جی نہیں سکتا ہے تھوڑی دیر بھی کوئی بشر ۔۔۔ شادی و غم اس زمانے میں اگر توام نہ ہو
کچھ دنوں تو چاہئے اس کے لئے آخر بقا ۔۔۔ مانتے ہیں ہم بنائے عمر مستحکم نہ ہو

مصلحت سے موت بھی خالی نہیں تسلیم ہے[1]
نوجوانی میں مگر یہ قابل ترمیم ہے

[1] نمبر اول اور خصوصاً ٹیپ کے شعر کو مولوی اعتقاد دین صاحب بی اے ایل [illegible] تخلص وکیل راولپنڈی (حال ڈسکہ ضلع سیالکوٹ) نے اپنے خط کے ذریعہ بے حد پسند کیا تھا اور لکھا تھا یہ مضمون بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔ گوجرانوالہ کے اجلاس مسلم کشمیری کانفرنس منعقدہ ۲۴-۲۵ اپریل ۱۹۲۶ء (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵ پر)

مخزنِ گورِ غریباں روضۂ شاہِ مدار[1] — برکتیں نازل ہوں تجھ پر بےحساب و بےشمار
چشمِ ظاہر بیں میں تو ہے ایک ویرانہ زمین — چشمِ باطن کے لیے لیکن ہے پُرعبرت دیار
ہو چکی وابستہ کتنی خلق دامن سے ترے — اور ابھی باقی ہیں دنیا میں بہت امیدوار
زیرِ گردوں جو رہے بیتاب و مضطر عمر بھر — تیری آغوشِ محبت میں انہیں آیا قرار
عبرتوں کا آئینہ ہر ذرّہ تیری خاک کا — دیدۂ عبرت جو وا ہو تو ہو سب کچھ آشکار
وہ ترا دربار جس میں سینکڑوں پیر و فقیر — وہ تری سرکار جس میں ہیں ہزاروں زشتکار

نازِ تجھ سے کر نہیں سکتا کوئی اے بے نیاز
اس جگہ اچھے بُرے کا کچھ نہیں ہے امتیاز

خطۂ شاہِ مدار اے دافعِ رنج و محن — تجھ میں رکھتے ہی قدم جاتی رہی دل کی جلن
چار دیواری میں تیری لطف کچھ ایسا ملا — رنجِ غربت پر تصدق ہو گیا عیشِ وطن
رات دن اس فکر میں تھے کس طرح پہنچینگے ہم — موت نے آتے ہی کر دی سہل یہ منزل کٹھن
پاؤں پھیلا کر تری آغوش میں سب سو گئے — ڈھیر مٹی کا ہے تیری خاک یا صحنِ چمن
ہو گئے مٹی میں بلکہ آج کیڑوں کی غذا — جن کے سر پر چترِ شاہی تھا کبھی سایہ فگن
تیرے قدموں میں تو پہلے ہی سے اے شاہِ مدار — سو رہا تھا ایک بھائی اور اک پیاری بہن[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴) کی تقریب پر جب میں ہمراہ علامہ سیماب اکبرآبادی اور جناب ساغر۔ خان بہادر شیخ دین محمد صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ (حال ممبر پنجاب کونسل) کی کوٹھی پر گئے اور وہاں ان دونوں نامور شاعروں نے اپنے اپنے شعر سنائے تو شیخ صاحب اپنی بیاض لے آئے اور اس میں سے میری نظم نالۂ دلخراش کا پہلا بند انہوں نے پڑھ کر سنایا اور کہا یہ بند مجھے ایسا پسند آیا کہ میں نے اس کو اپنی بیاض میں جس میں چیدہ اور منتخب اشعار ہیں درج کر لیا ہے۔

[1] گکھڑ تل ضلع سیالکوٹ کی وہ خانقاہ جہاں مرحومہ دفن ہے۔

[2] اس احاطہ مزار میں میرا ایک چھوٹا بھائی چراغ دین نام عمر ۲ سال اور ایک چھوٹی بہن بعمر ۳ سال مدفون ہیں۔

اک بہن باقی تھی وہ بھی دل لئے قسمت چل بسی
بھائی۔ والد والدہ سے لیکے رخصت چل بسی

اے زمینِ قبر اے آرام گاہ بیکساں — عمر بھر دکھ ہی اٹھائے ہم نے زیرِ آسماں
اتنی موتیں ایک ہی کنبہ میں پھر ایسی جواں — تو ہوئی آباد۔ میرا لٹ گیا جب کارواں
آرزو پر آرزو تھی خواہشوں پر خواہشیں — بجھ گیا دل دیکھکر تیرے چراغوں کا دھواں
یاں سرہانہ ہے نہ تکیہ ہے نہ بستر ہے کوئی — میہمانوں کی یونہی ہوتی ہیں خاطرداریاں
اک امانت آج پھر سونپی ہے تجھکو اے لحد — غم میں جس کے ہو رہے ہیں نیم جاں پسماندگاں
گو وہ بیکس ہے مسافر ہے اکیلی ہے مگر — کلمۂ توحید رہتا ہے لبے وردِ زباں

اے بہن گھبرا نہ جانا گو اندھیری قبر ہے
تیرے سر پر رحمتِ باری کا چھایا ابر ہے

ستمبر ۱۹۰۶ء میں منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت مرحوم نے رسالہ اصلاح سخن لاہور سے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ ان ایام میں حاجی حافظ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی (حال پروفیسر علیگڈھ کالج) بھی جو استاد مرحوم حضرت داغ کے ارشد تلامذہ میں اور کئی شاگردوں کے استاد ہیں لاہور ہی میں مقیم تھے۔ وجاہت حسین صاحب نے اپنے رسالہ کے لئے یہ طرح مشتہر کی ع یہ زمین آسمان ہے گویا۔ لیکن رسالہ کا پہلا پرچہ بوجوہات چند جون ۱۹۰۷ء میں چھپ سکا۔ اور اسی میں میری یہ غزل ستمبر ۱۹۰۶ء کی کہی ہوئی بھی درج ہوئی۔

تو زمانے کی جان ہے گویا — جان ہے تو جہان ہے گویا
میری چپ سے ہے میرا حال عیاں — خامشی ہی زبان ہے گویا
دلِ عاشق کی کیا کہوں رفعت — لامکاں یہ مکان ہے گویا
ترا ملنا ہے آپ کا کھونا — نفع میں بھی زیان ہے گویا
حسن جادو ہو یا کہ ہو اعجاز — عاشقوں کی یہ جان ہے گویا

حُسن والوں نے مار ڈالا ہے　　عشق کا یہ بیان ہے گویا
چین سے سو گئے لحد میں ہم　　امن کا یہ مکان ہے گویا
تیری اُلفت کی وجہ سے اے دوست　　اپنا دشمن جہان ہے گویا

فوقؔ مہماں سرائے ہے دُنیا
ہر بشر میہمان ہے گویا

۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کی وجہ سے سودیشی تحریک کا بڑا زور تھا جگہ جگہ جلسے ہوتے تھے ستمبر ۱۹۰۶ء کے وسط میں لاہور بنگے منڈی کے میدان میں ایک صاحب نے سودیشی جلسہ میں ہارمونیم کے ساتھ نہایت سریلی لے میں ایک نظم پڑھی جس کا ردیف قافیہ "زندہ دلی ہماری چارہ گری ہماری" تھا۔ ۲۶ ستمبر کی شام کو ۹ بجے میری طبیعت بھی اس طرف متوجہ ہوئی ۔اس وقت ملک کی اضطراب انگیز حالت کے علاوہ ایک بیمار رشتہ دار کی حالت بھی جو قریباً لا علاج ہو چکا تھا (جس کا چند دنوں کے بعد انتقال ہو گیا) پیش نظر تھی۔

ممکن نہیں کسی سے چارہ گری ہماری　　اب بڑھ گئی ہے حد سے بے چارگی ہماری
نذرِ اجل ابھی سے ہے زندگی ہماری　　آخر کو رنگ لائی بد قسمتی ہماری
اے چرخ نام اس کا مٹتا نہیں ہے اچھا　　ہے یادگارِ عالم یہ بیکسی ہماری
اک وہ کہ ان کے بس میں ہیں عرش و فرش دونو　　اک ہم کہ دیکھتے ہیں سب بے بسی ہماری
اے موت کچھ مدد کر اے ضبط لاج رکھ لے　　ہونے کو ہے دگر نہ پردہ دری ہماری
اہلِ وطن کے غم میں ہے موت سے بھی بدتر　　کہنے کو زندگی ہے یہ زندگی ہماری
گو اب گھرے ہوئے ہیں تاریکیوں سے لیکن　　عالم کو جگمگاتی تھی روشنی ہماری
آ سورشتہ کے فرشتے آ کر گلے لگا لے　　اب ٹوٹتی ہے سب سے وابستگی ہماری
سب قصے بھول جاؤ اک گونہ لطف پاؤ　　تم داستاں سنو تو آکر کبھی ہماری
گھر بار سے چھڑایا جنگل میں لا بٹھایا　　اب دیکھیں کیا کرے گی دیوانگی ہماری

ہے فوق نام اپنا لیکن یہ لطف دیکھو
تذلیل کر رہا ہے ہر آدمی ہماری

(بمقام چھاؤنی ملتان جمعرات شام ۶ بجے ۲۲ نومبر ۱۹۰۶ء)

ایک اک ٹکڑے پہ سو سو شکر ہے ہم فقیروں کی بھلا اوقات کیا؟
فوق کھویا عشق نے حسب و نسب
کیا کہوں ہے خاندان کیا ذات کیا؟

ہم اور ہمارا حال

۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں بھارت ماتا کے نام سے لاہور میں ایک انجمن بھی قائم تھی۔ اور ایک ماہوار رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔ لالہ انبا پرشاد صوفی۔ سردار اجیت سنگھ لالہ ایشری پرشاد نیم سوپ والے۔ منشی منور خان ساغر اکبر آبادی۔ لالہ پنڈی داس۔ لالہ لال چند فلک۔ لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی (اس زمانہ میں اخبار ہندوستان کے مالک ایڈیٹر تھے) مہتہ نند کشور وغیرہ کئی احباب اس سبھا اور رسالہ کے کارکن تھے۔ ان میں سے چند احباب کے اصرار سے میں نے بھی ۵ مارچ ۱۹۰۷ء کو ایک نظم لکھی۔ صوفی صاحب اور سردار اجیت سنگھ کہتے تھے کہ یہ نظم معتدل پالیسی کا اظہار ہے۔ ہم انتہا پسند ہیں شراب دو آتشہ ملکہ سہ آتشہ ہونی چاہئے۔ ابھی نظم پڑھنے کا موقعہ نہیں آیا تھا کہ لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ گرفتار کر کے مانڈلے (برہما) بھیج دیئے گئے۔ ملک میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انجمن اور رسالہ درہم برہم اور ان کے کارکن سب منتشر ہو گئے۔ نظم کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

غیروں کے ملک میں اب اقبال ہے ہمارا امید کا خزانہ پامال ہے ہمارا
ہم ہندیں رہیں یا باہر کمانے جائیں اللہ جانتا ہے جو حال ہے ہمارا

اک زخم ہو تو کہدیں اک رنج ہو تو سہہ لیں — دل تیرہائے غم سے غربال ہے ہمارا
اک رہ گئی تھی دولت سو وہ بھی چل بسی ہے — افلاس اور فاقہ اب مال ہے ہمارا
پہلے تھے ہم سے لرزاں دنیا کے نامور سب — اب صرف اپنے گھر تک اجلال ہے ہمارا

اے داستان پُرغم ایسا اثر دکھادے
ہندوستان والوں کو خواب سے جگادے

حب وطن ہو جس میں اس دل کو ڈھونڈتے ہیں — کشت امید سے ہم حاصل کو ڈھونڈتے ہیں
ہے دست سعی کوتہ کاخ امید ارفع — ٹوٹے ہیں پائے کوشش منزل کو ڈھونڈتے ہیں
گرداب زندگی سے اب جانبری ہے مشکل — چکر میں آگئے ہیں ساحل کو ڈھونڈتے ہیں
غیروں کو شوق عشرت ہم طالبان عُسرت — سب لوگ اپنی اپنی محفل کو ڈھونڈتے ہیں
رفعت بغیر محنت پائی کہاں کسی نے — کب کام لینے والے کاہل کو ڈھونڈتے ہیں
ضبط فغاں ہو کیونکر چلتی نہیں ہماری — اے وائے ہم ہیں ناقص کامل کو ڈھونڈتے ہیں

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا را
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

خوش ہو کے کہہ رہا ہے ہر نوجواں ہمارا — ہندوستاں ہمارا ہندوستاں ہمارا
پھر کیوں طبیب سے ہم اپنا مرض چھپائیں — چہرے سے جب عیاں ہے درد نہاں ہمارا
حب وطن بھی اس میں تیری وفا بھی آمیں — کیا دل ٹٹولتا ہے اے حکمراں ہمارا
افلاس و قحط و نکبت ممکن نہیں کہ جائیں — یورپ کو ہو رہا ہے غلہ رواں ہمارا
کیونکر نہ شور سے ہم سر پر فلک اٹھالیں — اس آسماں کے اوپر ہے آسماں ہمارا
بھونچال نے بھی پیسا طاعون نے بھی مارا — فریاد کر رہا ہے ہر استخواں ہمارا
اے بیکسوں کے والی تو دستگیر ہوجا — دلی دل میں پھنس گیا ہے اب کارواں ہمارا

اے فوق حالِ دل ہم کس کو سنائیں جا کر
سنتا نہیں ہے کوئی دردِ نہاں ہمارا

شورش پنجاب کے متعلق چند خیالات

۳ مئی ۱۹۰۷ء سے جولائی ۱۹۰۷ء کے ہفتہ اول تک میں تحصیل کھنڈ کے سفر میں رہا ان دنوں پنجاب کے مطلع پر خوف وہراس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کی جلا وطنی نے سناٹے کا عالم پیدا کر رکھا تھا واپسی پر جب میں جھانسی پہنچا۔ تو وہاں ایک پنجابی کے پاس اخبار ہندوستان دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پہلے لالہ پنڈی داس ایڈیٹر اخبار انڈیا گوجرانوالہ اور ان کے چند دن کے بعد بابو دینا ناتھ ایڈیٹر و مالک اخبار ہندوستان لاہور بھی گرفتار ہو گئے ہیں مادر "انجمن بھارت ماتا" کے کئی "سپوت" جان بچا کر ادھر ادھر بھاگ گئے ہیں۔ اس حالت میں شورش پنجاب پر جھانسی ہی میں اپنے خیالات کا ذیل کے اشعار میں اظہار کیا۔

اب ان کے جاگنے کی توقع بھلا ہو کیا؟ — جو ملک شرط باندھ کے مُردوں سے سو چکے
"اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی" — اب اور کیا ملیگا کہ پچھلا بھی کھو چکے
امید تو بہت تھی پر اس بحرِ جوش میں — جو کچھ کیا کرایا تھا وہ بھی ڈبو چکے
ان خام طبع لڑکوں نے آخر کیا ذلیل — اب مال کیا کہ جان سے بھی ہاتھ دھو چکے
سختی جو ہو رہی ہے تو گھبرا رہے ہو کیوں؟ — اب پھل بھی اس کا کھائیے جو بیج بو چکے
گر وصلِ ادج ملک نہیں ہے تو ہو وصال — قسمت میں جو لکھا ہے کہیں جلد ہو چکے

خفیہ پولیس کا زور ہے اے فوق آجکل
تو لو تو جا بجا ماپئے بولو تو سوچ کے

(۱۶۔ اگست ۱۹۰۶ء بمقام سکیت ضلع کانگڑہ)

اب جو ہونا ہے یا خدا ہو جائے — میری قسمت کا فیصلہ ہو جائے
جاں بلب قوم ہے تغافل سے — اے مسیحا کوئی دوا ہو جائے

دام حرص و ہوا میں دل کو چھوڑ
کوئی تدبیر کر رہا ہو جائے

(۱۹۔ اگست ۱۹۰۶ء بمقام سکیت ضلع کانگڑہ)

بدل جائیں عشرت سے عسرت کے دن — الٰہی پلٹ میری قسمت کے دن
ابھی تک ہوں قرب خدا سے میں دور — قریب آ گئے میری رحلت کے دن
کہاں اب نصیبوں میں آزادیاں — بسر ہو گئے عیش و عشرت کے دن
جوانی کی اُلفت جوانی کا جوش — قیامت کی راتیں مصیبت کے دن
بتا یاد ہیں لے فراموش کار — وہ الفت کی راتیں محبت کے دن
غم و فکر کا گھر جوانی کا عہد — لڑکپن کے دن بادشاہت کے دن
غریبوں کی بھی تو خبر منعموا — ہمیشہ نہیں رہتے دولت کے دن

سفید و سیاہ کا خلاصہ ہیں فوق
ریاضت کی راتیں عبادت کے دن

پہلی سیاحت کشمیر کا کلام

کشمیر کی تعریف میں مغربی و مشرقی تمام مورخ و سیاح متفق الرائے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اچھا اور منتخب حصہ ہمالیہ ہے۔ اور ہمالیہ میں کشمیر ایک ایسی

دلفریب سرسبز اور شاداب وادی ہے۔ جو ۸۰ میل لمبی اور ۲۰ میل چوڑی ہونے کی وجہ سے دنیا میں لاثانی سمجھی جاتی ہے ع پہاڑوں میں یہ میدان وسیع اللہ کی قدرت۔ کشمیر میں ولی۔ بزرگ۔ مہاتما۔ خدا پرست۔ مصوّر صنّاع اور شاعر اس کثرت سے ہوئے ہیں۔ کہ کشمیر کی تاریخیں ان کے حالات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ اس چھوٹے سے ملک میں اس قدر ذہین وصنّاع اور شاعر پیدا ہوئے اور جو یہاں آیا وہ ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ ہی کہتا رہا۔ اس معمہ کا حل نہایت آسان ہے۔ یہاں ہرے بھرے کھیت آنکھوں کو تراوت بخشتے ہیں۔ قدرت کی گلکاریاں ہر پھول اور ہر کلی کے رنگ میں دماغ کو راحت پہنچاتی ہیں۔ سمندر جیسی بڑی بڑی لہروں والی جھیل ڈل عجیب ہولناک سین رکھتی ہے۔ پھر اس کے پہلو میں نسیم سے زیادہ صاف اور شفاف شیشہ سے زیادہ صاف پانی ڈل میں پہاڑوں کا عکس۔ کنارہ کے خوبصورت درختوں کے سایہ کا پانی کے اندر جھومنا۔ ڈل میں تیرنے والے کھیتوں کا جہاں تہاں لہرانا۔ سطح آب پر کنول کے پتوں اور پھولوں کا بہار دکھانا۔ نیلگوں آسمان کا سر پر شامیانہ۔ کشتیوں اور ہوس بوٹوں کی سیر اور دو رویہ ایسے خوبصورت نظارے ہیں کہ دل پر بغیر اثر کئے اور روح کو بغیر جنبش دیئے نہیں رہتے۔

جو لوگ سرد ملکوں کے پروردہ ہیں۔ اور ایسے دلفریب نظاروں کے دیکھنے والے ہیں ان سے بہتر باغبان حقیقی کی گلکاریاں کون دیکھ سکتا اور کون ظاہر کر سکتا ہے۔ وادی میں اکثر جگہ کریوہ یعنی اونچے اونچے میدان ہیں جن کے سرے بلند اور وسیع جنگل۔ شالی کے سرسبز کھیت۔ شیریں اور لطیف چشمے۔ ناشپاتی سیب بگوگوشہ اور دیگر مختلف قسم کے میوہ دار درختوں کی قطاریں ملک کی آب وہوا اور زیب وزینت کو دوبالا کر رہی ہیں۔ دریائے جہلم اننت ناگ کے چشمہ سے نکلکر وولر میں داخل ہوتا ہے۔ تو یہاں سے ایک نیا جنم لے کر اور بہاد ہو کر نکلتا ہے۔ اور بارہ مولا کے قریب خانپورہ کے تنگ درے کے ذریعہ ڈھلوان

پہاڑ کو کھودتا، کریدتا، چیرتا اور اس خوشی و مسرت میں ایک شور مچاتا ہوا پنجاب کو نکل جاتا ہے۔
جب کشمیر کے سفر اور قیام میں کسی شاعر اور مورخ اور مصنف کو قدرت کاملہ کے یہ دلفریب منظر ظہور شان ربوبیت کے یہ روح پرور نظارے متاثر کئے بغیر نہ رہے۔ تو بندۂ ناچیز (فوق) جو خاکپائے اہل ذوق بھی ہے، خطۂ کشمیر سے نسبت توطن بھی رکھتا ہے۔ آخر پہلو میں پتھر تو نہیں رکھتا تھا۔ ع دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔
ابھی میں رستہ ہی میں تھا کہ بھگواڑی کے پڑاؤ پر اس زمانہ میں موٹریں اور لاریاں نہ تھیں۔ ٹانگہ کا رواج تھا اور چار پانچ دن میں راولپنڈی سے سرینگر جا پہنچتے تھے ۲۴ ستمبر کی صبح کو کشمیر کے متعلق ہی ایک نظم لکھی گئی۔ دوسرے دن کی شام کو چناری کے پڑاؤ پر ایک غزل جس میں کشمیر کی پُر درد حالت ہی کا ذکر ہے کہی گئی۔

دہم ستمبر ۱۹۰۰ء بمقام بھگواڑی براستہ کشمیر جلسہ نصرت الاسلام سرینگر کے لئے)

یاد ہے کہ تھی کشمیر کی عالم میں دھوم   جانتے تھے لوگ اس کو ہند کا دارالعلوم
تھی فضیلت ساکنان خطۂ کشمیر کی   عالم و فاضل یہاں ہوتے تھے پیدا بالعموم
تھے ستارے علم کے روشن کبھی یاں اس طرح   رات کو جس طرح گردوں پر چمکتے ہیں نجوم
اٹھ چکے ہیں اس زمیں کی خاک سے وہ باکمال   جن کی شہرت ہو چکی ہے ہند تا شام و روم
نام باقی ہے مگر اب مٹ گیا ان کا نشاں   مل گئے ہیں خاک میں سب باکمال و ذی علوم
سچ تو یہ ہے آ گیا اس وقت سے ہم پر زوال   چھوڑ بیٹھے جب سے ہم اپنے بزرگوں کی رسوم
قوم کی خاطر اگر کچھ کام کی کوشش نہ ہو   فائدہ کیا ہے جو ہو ہر سال لوگوں کا ہجوم
نصرت الاسلام کا جلسہ ہے اس کیواسطے   چند سے چندہ وہ سو شیروں کا ہو بس ایک شوم
چاہیئے امداد تن من دھن سے اسکی ہر طرح   چاہیئے دل کھول کر دیں اہل دل اس میں رقوم
از سر نو بیٹھ جائے سکہ پھر کشمیر کا   علم کی اس کے پھر اگلی سی رہی مچ جائے دھوم

حق میں ہے اہل وطن کے فوق کی اب یہ دعا
اے خدا پیدا کر ان میں۔ شوق تحصیل علوم

(بمقام پڑاؤ چناری ۵ ستمبر ۱۹۰۶ء بوقت شام سڑک پر ٹہلتے ہوئے)

کہاں تک غیر کا شکوہ کہاں تک — عدوئے جاں ہے حب آرام جاں تک
جلائے برق شاخ آشیاں تک — اڑا لے باد۔ خاک استخواں تک
ترا مظہر مکاں سے لامکاں تک — ترا جلوہ زمیں سے آسماں تک
غریب و عاجز و ناچار ہیں ہم — ستا لو ہو سکے۔ تم سے جہاں تک
یہاں سب جاں بلب ہیں فاقہ کشی سے — وہاں مصروف عشرت پاسباں تک
کبھی ہو خندۂ گل بھی میسر — یہ شبنم کی طرح رونا کہاں تک
عدوئے سنگدل کا دل بھر آیا — ہوا ہے غیر حال اپنا یہاں تک
محل شیر گڈھ[1] کے رہنے والے — کبھی آ جا غریبوں کے مکاں تک
کہاں تک جستجوئے مقصد قوم — کہ رخصت ہو چکے تاب و تواں تک
نچوڑا خون غیروں نے ہمارا — نہیں تم کو مگر وہم و گماں تک
تو ہی اے بیکسی آنسو بہا دے — نہیں ملتا ہے کوئی نوحہ خواں تک
الٰہی ان کا کیا انجام ہوگا — نہیں جو سوچتے سود و زیاں تک
بڑی منت سے لائے تھے قضا کو — رہی وہ بھی نصیب دشمناں تک

---

[1] سرینگر کشمیر میں محلات شاہی کا نام شیر گڈھی ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ مہاراجہ رنبیر سنگھ مہاراجہ پرتاپ سنگھ انہی محلات میں رہتے تھے۔ موجودہ فرمانروائے کشمیر مہاراجہ سر ہری سنگھ نے اپنے علیحدہ محلات گپکار میں تعمیر کرالئے ہیں۔ وہ شیر گڈھی میں صرف دربار کے موقع پر آتے ہیں۔

بریدہ دست و پا گم کردہ رہ ہوں	کوئی پہنچا دے مجھکو کارواں تک
تمہاری جنبش ابرو ہے کافی	نہ جاؤ خنجر و تیغ و سناں تک
تہیں سو پردوں میں ہم دیکھ لینگے	کرو تم ہو سکے پردہ جہاں تک
کسی کی دوستی یہ رنگ لائی
عدوئے فوق ہے سب خاندان تک

(موضع ہردو شیوہ نزیل سوپور کشمیر منشی غلام محمد خادم کے باغ میں ۱۹ ستمبر ۱۹۰۷ء)

سنتا نہیں ہے کوئی فریاد ہو رہی ہے	اے موت آ کہ تیری اب یاد ہو رہی ہے
کرتے ہیں وہ عیادت ہمراہ غیر آکر	پردے میں لطف کے کیا بیداد ہو رہی ہے
صبر و قرار اپنا اک راہزن نے لوٹا	بستی ہمارے دل کی برباد ہو رہی ہے
کوہ الم ہے دل پر دے دیں گے جان شیریں
اب تو صلاح یہ اے فرہاد ہو رہی ہے

(۲۲ ستمبر ۱۹۰۷ء بمقام گوری پورہ نزیل سوپور صبح ۸ بجے گوہل (نالہ) کے کنارہ پر)

اے مرے خضر یم حسن پلا آب وصال	مانگتا دیر سے ہے دید کا پیاسا پانی
جل اٹھا سینہ مرا سوز غم پنہاں سے	لا کہیں جلد خدا کے لئے ٹھنڈا پانی
شادیئے تیر کے نغمے نے صدا دی اے فوق
آج لاہور سے اٹھا ترا دانا پانی

۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء کو میں منشی غلام محمد صاحب خادم کے ہمراہ لنگیٹ ہندواڑہ اور علاقہ راجوار کی سیر کو روانہ ہوا۔ صبح کے نو بج چکے تھے کہ بغیر کچھ سوچنے اور غور کرنے کے مقطع کا سالم شعر اس طرح خود بخود زبان پر آگیا۔ جیسے پہلے ہی کہا ہوا تھا۔ باقی غزل راستہ میں مقطع کے بعد کہی گئی۔

بند کر ناصح ناداں تو نصیحت اپنی	کھول جا کر کسی مسجد میں شریعت اپنی

آنکھ پھوٹے جو بری نظروں سے دیکھوں تجھکو ۔ دل ہو صد چاک جو بدلے کبھی نیت اپنی
یا جگہ دے مری الفت کو بھی اپنے دل میں ۔ یا مرے دل سے بھی لے جا تو محبت اپنی
یہ سلیقہ یہ ہنر اور یہ حسن اخلاص ۔ کچھ سمجھ سوچ کے آئی ہے طبیعت اپنی
تیری تاثیر کے منکر ہوئے جاتے ہیں تمام ۔ اب تو لے آہ دکھا کوئی کرامت اپنی
چودھویں سال میں آیا جو مہ چار دہم ۔ آئی اس سال کے آتے ہی مصیبت اپنی

ہم جو مرتے ہیں کسی پر تو کسی کو کیا فوق
جان اپنی ہے دل اپنا ہے طبیعت اپنی

کشمیر میں دخانی کشتیوں کا افتتاحی جلسہ

ڈریجر ایک قسم کی دخانی کشتی ہے۔ جو بڑے بڑے پتھر وغیرہ نکال کر دریاؤں کو گہرا اور عمیق کرتی ہے۔ اسی قسم کی چند ایک کشتیاں دریا کو گہرا کرنے کے لئے بارہ مولا میں کئی سالوں سے تعمیر ہو رہی تھیں۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کو بارہ مولا میں ان کا افتتاحی جلسہ تھا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ ریزیڈنٹ اور مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے علاوہ تمام امرا وزرا اور اعلےٰ عہدہ دار اس جلسہ میں موجود تھے۔ خواجہ عبد الصمد صاحب ککڑو (رئیس بارہ مولا مرحوم) کی تحریک سے مہاراجہ صاحب کے بنگلہ پر ہی چند شعر میں نے لکھے۔ جن کو سنکر پرائیویٹ سکرٹری (مہاراجہ) دیوان دیاکشن کول صاحب سی آئی ای نے جلسہ میں وقت دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن صاحب ریزیڈنٹ کی سپیچ (بجلی کے کارخانہ اور ڈریجر کے کام کے متعلق) اس قدر لمبی تھی۔ کہ وقت نہ نکل سکا۔ وہ نظم آج تک کہیں درج نہیں ہو سکی اب کلام فوق میں اس کو جگہ دی جاتی ہے۔

عہد میں تیرے یہاں تک ہے وفور اتحاد ۔ متحد باہم صلیب و سبحہ و زنار ہے
چشمۂ ساز نیں سا بہتے ہر سو رواں کشمیر میں ۔ مخزن نیچر ہے تیرا ملک یا کہسار ہے

آسماں پر جو کبھی رہتی تھی اے اہل زمیں — آج اس بجلی کا یہ کشمیر دعویدار ہے
فائدہ بجلی سے ہاتھوں ہاتھ پہنچیگا ہمیں — تیری جو تجویز و حکمت ہے وہ پائیدار ہے
جامۂ علم و ہنر ہر جسم کی زینت ہے آج — رشک دستار فضیلت ہر سر پہ ہر دستار ہے
اس سے بڑھکر اور کیا آسائشیں ہونگی کہیں — آگ ہے پل ہے سڑک ہے ہسپتل ہے تار ہے

گر یہی تیری توجہ ہے تو پھر کشمیر میں
مہمان چندروزہ نکبت و ادبار ہے

سوپور کے رئیس و وکیل خواجہ عبدالغنی یاروں کے یار تھے۔ سارا قصبہ ان کی عزت کرتا تھا۔ ان کے بعد سوپور میں ہندو مسلمانوں کا کوئی لیڈر نظر نہیں آتا۔ شائق تخلص کرتے تھے۔ اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ سوپور میں ان کے دیوان خانہ میں مجھے ہفتہ عشرہ تک ان کی میزبانیوں کا لطف اٹھانے کا موقعہ ملا۔ ۳۰ ستمبر کو بنڈپورہ میں ان کا ایک مقدمہ تھا۔ مجھے بھی اپنے "ڈونگا" میں ہمراہ لیگئے۔ بنڈپورہ گلگت کی سڑک پر وُلر کے پار واقع ہے۔ جھیل کے نظارے خوفناک بھی تھے اور دل خوش کن بھی جہانتک نگاہ کام کرتی تھی۔ پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ خواجہ صاحب نے شعر پڑھا۔ ؎

ہر مجلسے بگرم عالم آب است این جا — شیخ تشریف بہ بزم شراب است این جا

چند شعر اس حالت میں میری زبان پر بھی آگئے۔ رات کو نیند نہ آنے کے باعث مطلع حسب حال تھا۔ ؎

بے تابی و اضطراب کب تک — اے فوق یہ ترک خواب کبتک
اے عشق۔ عدوئے آبرو عشق — یہ طعنۂ شیخ و شاب کب تک
آخر کوئی حد بھی روٹھنے کی — من جایئے اب عتاب کب تک
تا چند یہاں قیام اے دل — گھر بار سے اجتناب کب تک
کب تک یہ مصیبتیں رہینگی؟ — اے چرخ یہ انقلاب کب تک

ہمت ہے تو کر کے کچھ دکھا بھی
اے فوق یہ پیچ و تاب کب تک

سوپور کے قیام میں سوانح عمری مولانا روم (مناقب العارفین) اور مثنوی شریف کا کچھ حصہ زیر مطالعہ تھا۔ ۴۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء کی رات کو دو بجے کے قریب آنکھ کھل گئی بہت کوشش کی کہ کسی طرح نیند آجائے۔ لیکن آنکھ نہ لگی۔ اسی اضطراب انگیز بیداری میں چند شعر بھی موزوں ہو گئے۔ ؎

توفیق اگر تجھے خدا دے — یہ پردۂ غیریت اٹھا دے
ہر بات میں خامشی یہ کب تک — کچھ اس کا سبب ہمیں بتا دے
وہ نام کھدے نگینِ دل پر — نقشِ من و تو کو جو مٹا دے
ہو جس میں ثنائے حسن مرقوم — اے عشق وہ مثنوی پڑھا دے
کہتے ہیں جسے خوشی کا آنسو — اے دیدۂ تر کبھی دکھا دے
تو بھی ہے بناوٹوں سے خالی — ہیں شعر ترے بھی سیدھے سادے
وابستۂ دامِ مصلحت ہوں — اس قید سے اب خدا چھڑا دے

ہے فوق کے فقر پر حسد کیوں؟
یہ دادِ جنوں اسے خدا دے

(بمقام سوپور کشمیر دس بجے رات ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء بر دیوان خانہ خواجہ عبدالغنی صاحب وکیل مرحوم)

اے فوق جانِ زار نہ کیوں ہو عذاب میں — دل سی عزیز شے ہے اگر پیچ و تاب میں
میلانِ طبع ان کی طرف ہے اسی لئے — مستی و سوز ہے جو شراب و کباب میں
اندیشۂ حسابِ قیامت بھی چاہیئے — اے دل نہ پھنس یہاں کے حساب کتاب میں
میری طرح ہو غیر بھی سرگشتہ اے فلک — گردش ہو کاش یہ بھی ترے انقلاب میں

منزل پہ بھی پہنچ گئے بیدار ہو کے لوگ
ہیں ساکنانِ خطۂ کشمیر خواب میں!

ماتم نواب محسن الملک

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو چہار شنبہ کے دن نواب محسن الملک بہادر مولوی سید مہدی علیخان شملہ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کر گئے۔ وہ سر سید احمد خان مرحوم بانی علیگڈھ کالج کی وفات کے بعد کالج کے سکرٹری اور مسلمانانِ ہند کے رہنما تھے۔ سارے ہندوستان میں ان کا ماتم منایا گیا۔ ۲۰۔ اکتوبر کو یہ خبر کشمیر پہنچی۔ ۲۱۔ اکتوبر کی سہ پہر کو خانصاحب منشی سراج الدین احمد میر منشی ریزیڈنسی۔ ماسٹر صادق علی خان صادق ہیڈ ماسٹر (مرحوم) خواجہ صمد جو ککرو (مرحوم) اور مولوی عتیق اللہ صاحب سیکرٹری انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کی سعی سے اسلامیہ ہائی سکول کے وسیع صحن میں ایک ماتمی جلسہ ہوا۔ ۲۱۔ اکتوبر کی صبح کو مجھے بھی اطلاع ملی کہ چلے آئیے اور نظم لے کر آئیے۔

بے ثباتیٔ دنیا کے متعلق ایک غزل کے چند شعر پہلے ہی زبان پر جاری تھے۔ نواب مرحوم کے انتقال سے دل کو اندرونی ٹھیس لگی جس سے چند شعروں کا ایک ترکیب بند تیار ہو گیا۔ جو ماتمی جلسہ میں پڑھا گیا۔ ؎

باغِ ہستی ایک دن اے فوق بن ہو جائیگا
بلبلیں اڑ جائینگی ویراں چمن ہو جائیگا

بند ہو جائے گی سوسن کی زباں نرگس کی آنکھ
خاک مل کر خاک میں ہر گلبدن ہو جائیگا

سنبلِ نسریں دہن پر مردنی چھا جائے گی
ایک دن خاموش ہر غنچہ دہن ہو جائیگا

اس تماشہ گاہ کے سب کھیل ہو جائینگے بند
خواب کی صورت خیالِ زیستن ہو جائیگا

اے دلِ نافہم آخر تا کجا مستی تری
موت جب آئے گی سب نشہ ہرن ہو جائیگا

تا بکے جور و آزار تیری بتا اے خود غرض
محو اک دن یہ خیالِ ما و من ہو جائے گا

جن کو خون مظلوماں سے دی تو نے غذا بعد مُردن طعمۂ زاغ و زغن ہو جائیگا
آج ہے زربفت جس نازک بدن کے زیب تن کل جنازہ اس کا محتاج کفن ہو جائیگا

نیستی ہستی میں ہے ہستی کا ساماں چھوڑ دے
اس سے بہتر ہے بیاباں یہ گلستاں چھوڑ دے

عالم رنج و الم اسلام کے عالم میں ہے آج پھر بزم مسلماناں صف ماتم میں ہے
آج پھر جور خزاں سے لُٹ گیا باغ امید عندلیب دل، گل مقصود کے پھر غم میں ہے
تھی جو بے پروا کبھی طوفان بیم موج سے آہ وہ کشتی وفور تلاطمہائے یم میں ہے
دل میں اب وہ درد ہے کہتے ہیں جس کو لا دوا شکل لخت دل ہر آنسو دیدۂ پُرنم میں ہے
اب زمیں پر کیوں جھکا جاتا ہے ظالم آسماں کیا ابھی کچھ کسر باقی صدمۂ پیہم میں ہے

لے گیا ہے زیست کا ساماں سارا چھین کر
کر دیا محزوں ہمیں محسن ہمارا چھین کر

آزمائش اب تری اے آسماں ہونیکو ہے آج قلب ناتواں محو فغاں ہونے کو ہے
یوں تو اک مدت سے ہم جلتے تھے اے سوز نہاں آج تنگ آ کر مگر ظاہر دھواں ہونے کو ہے
مٹ گیا جور فلک سے قوم کا محسن بھی آج آہ پھر گم کردہ رہ یہ کارواں ہونے کو ہے
قوم کا خادم بھی تھا سید بھی تھا مہدی بھی تھا رونق بزم جہاں زیب جناں ہونے کو ہے
یوں تو ہے وقت ظہور مہدی و احمد مگر آہ جو کچھ ہے عیاں وہ بھی نہاں ہونے کو ہے
مرگیا ہے گرچہ ظاہر میں، مگر در اصل تو لذت اندوز حیات جاوداں ہونے کو ہے
تیری ہمت نے بھلایا تھا غم سید ہمیں تیرے مرنے سے مگر دل پھر تپاں ہونیکو ہے
وقف تھا تو قوم کی خاطر مگر شملہ میں آہ کیا خبر تھی نذر مرگ ناگہاں ہونے کو ہے

کیا بتائیں ہم بقول داغ کیا جاتا رہا
جو بھروسہ تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا

مسلمانانِ کشمیر کی دردِ حالت

اس نظم کا پہلا حصہ ۲۴ ۔اکتوبر ۱۹۰۷ء کو بمقام سرینگر لکھا گیا ۲۸ نومبر کو میں بارہ مولا میں آیا ان ایام میں حکیم سید حسین صاحب رضوی[1] بارہ مولا کے تحصیلدار تھے میں نے یہ اشعار انکو سنائے تو آپ نے کہا بیشک ہم لوگوں میں بہت سے نقائص ہیں لیکن اپنی خاکساران جہان میں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ بھی ہے سب یکساں ہی نہیں ہیں ۔یہ ملک چونکہ سب سے زیادہ پس افتادہ ہے اس لئے سب سے زیادہ عیوب اسی میں پائے جاتے ہیں ۔یا سمجھے جاتے ہیں اس لئے دونوں رُخ دکھلانے چاہئیں چنانچہ جو کچھ مجھے بتایا گیا میں نے اس کو نظم میں ادا کر دیا نظم کے دونوں ٹکڑے حسب ذیل ہیں ۔نظم کا دوسرا حصہ ۴ نومبر کو (ماہ رمضان میں سحری کھل چکنے کے بعد) حاجی خواجہ عبدالصمد ککڑو مرحوم کے دیوان خانہ میں لکھا گیا تھا۔

کشمیر میں اسلام کا کچھ حال نہ پوچھو
غفلت ہے مسلمانوں میں غفلت سے زیادہ
بجتا ہی نہیں قوم کا ارگن کسی صورت
بگڑا ہوا ہے ساز کا سُر گت سے زیادہ
ہر چند نمازوں کا بہت جوش ہے لیکن
ہے جھوٹ کا چرچا بھی صداقت سے زیادہ
وہ پیر پرستی کہ خدا بھی ہے فراموش
کثرت کے پرستار ہیں وحدت سے زیادہ
خالی ہے مسلمانوں سے ہر صیغہ یہاں کا
حالانکہ مسلمان ہیں پنڈت سے زیادہ
تعلیم سے تہذیب سے تمیز سے نفرت
اُلفت ہے مگر ان کو جہالت سے زیادہ
محکوم ہیں معتوب ہیں مجہول ہیں یکسر
بدحال ہیں اندازۂ عبرت سے زیادہ
نظارہ ترا ہم نے بھی اے سادگیٔ حُسن
دیکھا لب دریا ہے ضرورت سے زیادہ
ہے چہرۂ زیبا وہ ترا نور کا ٹکڑا
روشن ہے جو خورشید کی طلعت سے زیادہ

---

[1] آپ تحصیلداری سے کئی منازل ترقی طے کرتے ہوئے ۱۹۳۲ء میں ہوم منسٹری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

لے دے کے یہاں تھا فقط اک حسنِ دل آویز
اس میں بھی "غرض" پائی محبت سے زیادہ

چپکے سے کہا دل نے خیالات یہ سُن کر — الزام جو کشمیریوں پر تم نے لگائے
ہر چند وہ سب ٹھیک بہت راست ہیں لیکن — دو ایک ذرا سخت ہیں ان میں نظر آئے
دیکھا ہے مگر تم نے کہیں طبقۂ ارذل — دل میں یہ خیالات اسی سے ہیں سمائے
اس قوم میں ایسے بھی ہنر رکھتے ہیں اکثر — جو چشم فلک نے بھی نہ دیکھے نہ دکھائے
کچھ ملک کی خدمت میں کمر بستہ کھڑے ہیں — بیٹھے ہیں غم قوم میں کچھ سر کو جھکائے
پیدا بہت ہو گئے اللہ کے بندے — جو خواب میں ہیں ان کو بھی اللہ جگائے
اشراف بہت قوم کے ہمدرد یہاں ہیں — اے کاش کہ اللہ تجھے ان سے ملائے
یہ سچ ہے کہ ہے جھوٹ کی کشمیر میں کثرت — للہ مگر کوئی مجھے یہ تو بتائے
سوداگروں اور ہانجیوں سے سچ کی توقع — بیوپار ہی کیا جھوٹ نہ جب سچ میں ملائے
غیروں کی حکومت کے اگر ظلم سُنو تم — ممکن نہیں یہ سنتے ہی دل کانپ نہ جائے
یہ جھوٹ بھی ہے ظلم نہ ہونے کی نشانی — اللہ کسی طور سے اس کو بھی مٹائے
تعلیم نہ ہونے سے ہدف سب کا ہے کشمیر — جو چاہے وہ اب تیر ملامت کے چلائے
کم علم بھی بے علم بھی نافہم بھی ہیں ہم — ہے دل سے دعا سب کو خدا علم پڑھائے

پر علم وہی جس سے کہ دنیا بھی ہو حاصل
تعلیم وہ کیا جس سے کہ دینداری بھی جائے

۵۔ نومبر ۱۹۰۷ء کو میں خانپور کی پہاڑی کی طرف وزارت اور تحصیل کے عقب سے روانہ ہوا۔ ایک کھیت میں پانی آ رہا تھا۔ اس خیال میں محو ہو کر کہ یہ پانی کہاں سے اور کتنی دور سے اور کس چشمے سے آتا ہے۔ اس کے دہانہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ قریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اونچائی پر جا کر جنگلی بوٹیاں اور جھاڑیاں دامنگیر ہونے لگیں

لیکن بچتا بچاتا چشمہ تک جا پہنچا۔ وہاں سے اس چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی کچھ بہت دور نہ تھی۔ "قدمے فاصلہ دارد" کی بات تھی لیکن معاملہ "مردی و نامردی" کا تھا۔ بہرحال بلندی کی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے جا پہنچا جہاں سے تحصیل۔ دریا۔ قصبہ۔ موضع خانپور۔ اور گرد و نواح اور نزدیک و دور کے گل و گلزار کا نظارہ تمام تکان کو دور کر گیا۔

کہیں میدان نظر آیا کہیں کریوہ (اونچی جگہ) پر آبادی اور مکانات۔ دریا میں پانی کی چادر اور اس چادر پر لکڑی کے بنگلے یعنی ہوس بوٹ۔ برفانی پہاڑوں کا سلسلہ اور اس پر سورج کی شعاعوں کا عکس۔ یہ سین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قلم ان کے بیان سے قاصر ہے۔ قریباً دو گھنٹہ تک اس پہاڑی کی سیر کرتا رہا۔ اسی اثنا میں مندرجہ ذیل خیالات بھی موزون ہو گئے۔

اہل دنیا چھوڑتے دنیا کو ہیں حسرت کے ساتھ — دم نکلنے کو نکلتا ہے مگر دقت کے ساتھ
دامن کہسار کے سایہ میں جا کر بیٹھ رہ — کاٹنی ہے زندگی اپنی اگر راحت کے ساتھ
ہندوؤں کا بھی رہا خادم مسلمانوں کا بھی — دوستی رکھتا ہوں میں ہر مذہب و ملت کے ساتھ
ڈھونڈھ دیکھا اک جہاں بہر بقائے نام و ننگ — پر نظر وابستہ آیا قوم کی خدمت کے ساتھ
جس محبت کے گماں کا غیر کو ہے آسرا — کاش وہ الفت تری بدلے کبھی نفرت کے ساتھ
کر اثر پیدا کوئی اے جذبۂ حب وطن — اب جگا اہل وطن کو آہ پر حسرت کے ساتھ
جو بری باتیں ہیں وہ تو ہیں بری رونا ہے یہ — نیک رسمیں بھی اگر جاری ہیں تو بدعت کے ساتھ
اس طرح کب پائیگی گرد و غبار کارواں — قوم کے اب پاؤں بھی اٹھتے ہیں تو غفلت کے ساتھ
کاش للتادت[1] ہو پیدا پھر کوئی کشمیر میں — زیست اپنی کاش ہو پھر صولت و سطوت کے ساتھ

---

[1] ۷۱۵ء سے ۷۶۲ء تک اس نامور راجہ نے کشمیر پر حکومت کی ہے۔ اس کے عہد میں کشمیر کی حدود تبت، دردستان، ترکستان، ماوراءالنہر، کاشغر، ختن، خطا تک پھیلی ہوئی تھیں۔

آہ اے سلطان زین العابدین[1] بڈشاہ ما
نوحہ کشمیر پڑھ بیٹھے تری میت کے ساتھ

کیا دکھاتے ہیں یہ نو دولت ہمیں جاہ و جلال
ہم بھی رہتے تھے کبھی اک حشمت و شوکت کے ساتھ

چشم بینا۔ گوش شنوا ہے تو سن بھی دیکھ بھی
نقشۂ عبرت ہے آویزاں ہری پربت[2] کے ساتھ

چشم گریاں سینہ بریاں آہ سوزاں دل اداس
میں چلا کشمیر سے پنجاب کو حسرت کے ساتھ

کس طرح جائے ترا در چھوڑ کر۔ جائے کہاں
فوقؔ وابستہ ہے تیرے دامن دولت کے ساتھ[3]

---

[1] یہ بادشاہ تخت کشمیر پر ۵۱ سال تین ماہ دو روز تک حکمران رہا ہے۔ اس کا عہد حکومت ۱۴۲۳ء سے ۱۴۷۴ء تک تھا۔ اس کی جوانمردی و شجاعت منصف مزاجی و عدالت پروری بے تعصبی اور وسیع القلبی کی وجہ سے کشمیر کے ہندو مسلمان اب تک اس کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں اس بادشاہ کی مفصل سوانح عمری میں نے کئی سالوں کی جد و جہد اور محنت کے بعد ۱۹۲۹ء میں شباب کشمیر کے نام سے شائع کی اور وہ ایسی مقبول ہوئی کہ ایک ہی سال میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔

[2] ہری پربت یا کوہ ماراں سرینگر سے شمال کی طرف ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ پہاڑ ۲۵۰ فٹ تک بلند ہے۔ اکبر کے حکم سے ۱۰۰۶ھ میں یہاں چاردیواری بنائی گئی۔ افغانوں کے زمانہ میں عطا محمد خان گورنر نے یہاں قلعہ تعمیر کیا۔ جو اب تک موجود ہے یہاں حکومت کا جھنڈا لہراتا ہے اور توپ بھی چلتی ہے۔ اکبری چاردیواری کا دور ۲½ کوس بتاتے ہیں مسجد و حمام ملا شاہ اور آستان حضرت مخدوم صاحب اور کئی عمارات قدیم اس احاطہ کے اندر واقع ہیں۔ مندر شارکا دیوی کی وجہ سے ہندوؤں کے نزدیک بھی کوہ ماراں متبرک جگہ ہے۔

[3] پہلی سیاحت کشمیر کی یہ آخری غزل ہے۔ یہ غزل ۵ نومبر کو کہی گئی۔ میں ۶ نومبر کو پنجاب روانہ ہو گیا۔

مشاعرہ دربار رامپور کی ایک غزل

یکم جنوری ۱۹۰۸ء کو ریاست رامپور (مراد آباد) میں ایک سرکاری مشاعرہ باہتمام صاحبزادہ مصطفیٰ علی خان پرائیویٹ سکرٹری نہایت دھوم دھام اور شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ ہز ہائینس نواب[1] حامد علیخان بہادر کہ رشک تخلص کرتے ہیں۔ بہ نفس نفیس مشاعرہ میں موجود تھے۔ تمام ہندوستان کے مشہور شعرا کو دعوت دی گئی۔ مجھے بھی یاد فرمایا گیا۔ غزل پڑھنے کا اس قدر شوق نہ تھا جس قدر اس بات سے خوشی محسوس ہوتی تھی کہ شاعری کے آخری دور کا نظارہ بھی عنقریب آنکھوں کو میسر ہوگا۔ منشی وجاہت حسین صاحب سے ملا انہوں نے کہا مجھے بھی دعوت آئی ہے ہم دونوں نے دربار رامپور میں اپنے آنے کی اطلاع دیدی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۷ء کو دعوتی رقعہ ملا تھا ۱۴ دسمبر کو مصرع طرح ع تیر سے تمہارے چرچے سب کی زبان پر ہیں۔ پر کچھ لکھنا چاہا طبیعت پر زور بھی ڈالا لیکن شاعری تو ایک ایسی چیز ہے جو کسی دباؤ اور جبر میں نہیں رہتی۔ بلاؤ تو آتی نہیں اور نہ بلاؤ تو اڑی چلی آتی ہے۔ ایک گھنٹہ تک بحر تفکر میں غرق رہا۔ دو چار شعر بھی ہوئے مگر وہ پسند نہ آئے۔

۱۶ دسمبر کی رات کو دو بجے کے بعد جبکہ اتفاقاً آنکھ کھل گئی طبیعت خود بخود اس طرف مائل ہوگئی لیکن افسوس کہ میں عین موقعہ پہ بیمار ہوگیا۔ اور میری وجہ سے وجاہت مرحوم بھی نہ جاسکے۔ غزل حسب ذیل ہے۔

پہلے جو تھے زمیں پر وہ آسماں پر ہیں　　یعنی مکان والے اب لامکان پر ہیں
تیر و کمان پر ہیں تیغ و سنان پر ہیں　　قاتل تری نگاہیں اونچی اڑان پر ہیں
مشہور ہیں بلائیں سب آسمان پر ہیں　　لیکن جو ہم سے پوچھو ہندوستان پر ہیں
طاعون و قحط سالی دوزخ کا ہیں نمونہ　　کیا کیا مصیبتیں اس جنت نشان پر ہیں

[1] ہز ہائنس جولائی ۱۹۳۰ء کے ابتدائی ہفتہ میں انتقال کر گئے۔

لے دے کے دو ہی تو ہیں اک ہندو اک مسلماں
لیکن یہ ہیں زمین پر وہ آسمان پر ہیں

انگلینڈ والوں کا اک چھوٹا سا ہے جزیرہ
چھائے ہوئے وہ لیکن سارے جہان پر ہیں

عیسیٰ بھی ہیں فلک پر امت بھی اوج پر ہے
پیر و مرید دونوں اب آسمان پر ہیں

رندوں پہ میکدہ میں واعظ ترا اجارہ؟
جو چاہیں گے کریں گے اپنے مکان پر ہیں

مدنظر ہے شاید آج امتحاں کسی کا
ان کی نگاہیں تیغ و تیر و کمان پر ہیں

یا سر نہیں ہمارا یا در نہیں تمہارا
یہ سوچ کر جبیں سا ہم آستان پر ہیں

حالات وصل دشمن پوشیدہ کب ہیں مجھ سے
لو تم کہو۔ تو کہہ دوں میری زبان پر ہیں

اے آب تیغ قاتل چھینٹا کوئی ادھر بھی
شدت سے تشنگی کی کانٹے زبان پر ہیں

کھاتے ہیں شیخ و زاہد اس کی گلی میں چکر
بوڑھے بھی اب تو لٹو اس نوجوان پر ہیں

اک میں کہ میرا قصہ سنتا نہیں ہے کوئی
اک تو کہ تیرے چرچے سب کی زبان پر ہیں

سرکار کو نہ کیونکر شوق مشاعرہ ہو
اردو زباں کو دعوے اس خاندان پر ہیں

دشمن یہ چاہتے ہیں اس کو مٹا کے چھوڑیں
چاروں طرف سے حملے اردو زبان پر ہیں

اس کی مخالفت میں صف بستہ ہیں رسالے
ہیں میگزین جتنے وہ سب کمان پر ہیں

کہتا ہے کوئی اس میں الفاظ کی کمی ہے
کچھ اعتراض اس کے طرز بیان پر ہیں

کہتا ہے کوئی اس کو تہذیب سے معرّا
بس جتنے منہ ہیں اتنی باتیں زبان پر ہیں

حامی کوئی زبردست اردو کا اب نہیں ہے
اس واسطے یہ دھاوے اس ناتوان پر ہیں

مائل ہوا ہے پھر کچھ دربار رامپور اب
جس کے قدیم احساں اردو زبان پر ہیں

اے فوقؔ یہ تخلص کیا خوب ہے ہمارا
اس سے ہے اوج ہمکو ہم آسمان پر ہیں۔



محمد دیٖی فوق بعمر 48 سال
(سنـه 1924)

انجمن سخن لاہور کے مشاعرے

وہ بھی کیا دن تھے کہ بھاٹی دروازہ کے اندر مجلس مشاعرہ قائم ہوتی تھی خان احمد حسین خان بی اے کی سرگرمیاں انہیں ایک دم چین نہ لینے دیتی تھیں کبھی شاعروں کی نشست کے انتظام کی فکر میں ہیں۔ کبھی سامان آرائش سجا رہے ہیں کہیں اشتہاروں کا بندوبست ہو رہا ہے اور خاص خاص شاعروں کو دعوتی رقعے جا رہے ہیں۔

لیجئے شعرا کی آمد شروع ہو گئی۔ نواب غلام محبوب سبحانی صاحب مرحوم بھی کہ میر مشاعرہ تھے تشریف لے آئے اہل بزم نے اٹھ کر تعظیم دی۔ اب مشاعرہ شروع ہے کہیں لالہ موہن لال مطلب گہر افشانی کر رہے ہیں منشی بہاری لال شفق آنجہانی بھی عجیب انداز سے پڑھتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ خوب پڑھتے تھے۔ شیخ محمد رفیع اختر رئیس تھے اور رئیس زادہ بھی تھے۔ مگر نظم خوب لکھتے تھے۔ نواب صاحب کا کلام فارسی میں ہوتا تھا انہوں نے اپنی غزل شروع کی۔ اور اہل مشاعرہ واہ واہ کے نعروں سے اچھل پڑے۔ سبحان اللہ۔ جزاک اللہ۔ کیا کہنا قلم توڑ دیئے حافظ کی روح پھڑک اٹھی۔ ان الفاظ میں داد سخن دی جا رہی ہے۔

خان احمد حسین خان عموماً اخلاقیات پر نظم لکھتے تھے۔ تاہم ایک مشاعرہ میں شداد جلاد کے قافیہ پر بقید قافیہ صیاد ایک غزل پڑھی۔ اور خوب پڑھی۔ اور مقطع میں تو سامنے نواب کے احمد نے ثابت کر دیا   باندھنا مشکل نہیں کچھ قافیہ صیاد کا
غرض عجیب عالم تھا۔ راقم الحروف بھی انہی بزرگوں کے گرد دامن سے لپٹا ہوا کسی کونے میں بیٹھا رہتا تھا۔

اب اس بزم میں انقلاب آتا ہے صف الٹتی ہے خان احمد حسین خان لاہور سے تبدیل ہو کر جہلم چلے جاتے ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے شفق اور اختر اور کئی اور شاعر رخصت ہو جاتے ہیں اور لاہور کی بزم سخن پر ڈراپ سین گر جاتا ہے۔

سات آٹھ سال کے بعد یہ علمی سوسائٹی انجمن سخن کے نام سے بھاٹی دروازہ کی بجائے دہلی دروازہ کے اندر جنم لیتی ہے۔ بزرگوں کے بچھڑے ہوئے گلے ملتے ہیں۔ قدردان ہاتھوں پر اچھالتے ہیں۔ شاعری کے نئے نئے شوقین وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی تشریف لے آتے ہیں۔ اور مشاعرہ کی طرح آسان ہو یا مشکل شعر غلط ہوں یا صحیح کچھ نہ کچھ ضرور لکھ لاتے ہیں۔ اس مرتبہ یہ مشاعرہ بالکل نئے ہاتھوں میں جاتا ہے۔ میر جالب[1] دہلوی۔ میر شہرت دہلوی[2] وجاہت[3] جھنجھانوی۔ ساغر اکبر آبادی[4]۔ گوہر دہلوی مرحوم (محمد حنیف مرحوم شیخ محمد رفیع اختر کے چھوٹے بھائی) مظفر[5] مرحوم (مزنگ نزیل لاہور) تاراچند تارا[6] آنجہانی۔ ستا پرشاد شاد میرٹھی۔ منشی اللہ یار خان جوگی مرحوم۔ پنڈت[7] سورج نرائن دہلوی۔ منشی دین[8] محمد مالک اخبار صدائے ہند (حال پیسہ[9] گزٹ) اور نیاز مند ذوق اس جدید انجمن سخن کی رونق کا باعث ہوئے ہیں۔

پہلا مشاعرہ ۹ مارچ ۱۹۰۶ء کو دفتر صدائے ہند میں ہوا۔ دوسرا ۲۶ اپریل کو جس کا مصرع طرح ع لے اہل بزم نشیم مروت کو کیا ہوا؟ استاد مرحوم (حضرت داغ) کے دیوان سے منتخب کیا گیا۔ ۳۱ مارچ کو مجھے کانگڑہ کا سفر درپیش آیا۔ اسی دن شام کو میں جالندھر پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں ہوشیار پور تک ریل نہ تھی۔ رات کے ۹ بجے تانگہ پر سوار ہو کر ہوشیار پور کی طرف روانہ ہوا۔ آدم پور سے دو چار میل آگے تک تو نہایت سرد ہوا چلتی اور بجلی چمکتی رہی۔ لیکن بارہ بجے کے بعد بارش اور آندھی کا وہ زور ہو گیا کہ مجبوراً ایک جگہ ٹھہر جانا پڑا۔ ہوا کے سرد جھونکے۔ اندھیری رات میں بجلی کی تڑپ۔ ادھر مصرع طرح پر غزل لکھنے کا خیال۔ ان سب باتوں نے ہوشیار پور تک پہنچنے سے پہلے ہی چند شعروں کی ایک غزل مکمل کرا دی۔

۲۶ اپریل کے مشاعرہ سے پہلے ہی میں لاہور پہنچ گیا۔ مشاعرہ میں غزل پڑھی خیالات ملمع پردازی سے محروم تھے لیکن ملکی معاملات کے متعلق چونکہ غزل میں درد دل کا اظہار تھا

---

[1] و [2] و [3] و [4] و [5] و [6] و [7] وفات پا چکے ہیں ؎

ہوش و حواس و تاب و توان و عقل و خرد جا چکے ہیں سب — اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو ہو گیا

اس لئے سامعین نے کئی شعر بار بار سُنے۔ اور منشی وجاہت حسین صاحب مرحوم نے تو اپنے رسالہ اصلاح سخن میں مندرجہ ذیل سطور لکھکر اسے خاص طور پر جگہ دی " مکرمی فوق صاحب نے یہ غزل ۲۰ اپریل کے مشاعرہ انجمن سخن میں پڑھی تھی۔ اس کے مضامین مجھے اور عام لوگوں کو پسند آئے۔ اس لئے میں نے یہ غزل اصلاح سخن میں چھاپنے کے لئے ان سے لے لی۔ امید ہے ناظرین بھی اسے پڑھکر خوش ہونگے " اصلاح سخن میں چھپنے کے بعد یہ غزل اور بھی کئی اخباروں میں چھپی۔ غزل حسب ذیل ہے۔

اہل وطن تمہاری تجارت کو کیا ہوا؟ | غربت ہی ہر طرف ہے امارت کو کیا ہوا؟
دیکھی ہے جس نے عہد گذشتہ کی کچھ جھلک | کہتا ہے وہ کہ حال کے بھارت کو کیا ہوا؟
تھا صانع ازل کو بھی تیرے ہنر پہ ناز | اے کان علم و فن تری صنعت کو کیا ہوا؟
دوزخ کی طرح جل رہے ہیں غم کی آگ میں | یہ ساکنانِ خطۂ جنت کو کیا ہوا؟
کالے کی طرح ڈستے ہیں دشمن ہوں یا کہ دوست | اس تیرہ بخت قوم کی قسمت کو کیا ہوا؟
اے روشنی مطلع خورشید اوج قوم | ظلمت ہے چار سو تری طلعت کو کیا ہوا؟
اے دل نہ پست ہو تو ارادہ بلند رکھ | نصرت قریب ہے تری ہمت کو کیا ہوا؟
اب زور و زر کے دیکھ کے کہنا پڑا ہمیں | ایمان و عدل و رحم و صداقت کو کیا ہوا؟
مذہب برائے نام ہے ملت برائے نام | آخر عروج مذہب و ملت کو کیا ہوا؟
ملتی نہیں ہے جنس وفا کی طرح کہیں | اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا؟
پانی سے آگ مل کے اسے خضر رہ کرے | اہل وطن تمہاری اخوت کو کیا ہوا؟
جو آشنا ہے آج وہ ہے مطلب آشنا | یا رب لحاظ و پاس و مروت کو کیا ہوا؟
مے خانہ اور شیخ یہ ریش و فش چہ خوش | ہم تو بھلا تھے خیر! یہ حضرت کو کیا ہوا؟

اغیار کیا کہ یار بھی نالاں ہیں تجھ سے فوق
صورت تو خیر تھی ہی یہ سیرت کو کیا ہوا؟

انجمن سخن لاہور کے مشاعرہ منعقدہ ۲۶ اپریل ۱۹۰۸ء میں آیندہ مشاعرہ کے لیے ع جگر رہتا ہے دل کو دل جگر کو مصرع طرح دیا گیا تھا۔ ۲۹ اپریل کو تیسرے دن شام کی گاڑی پر مجھے اپنے بھائی صاحب بابو رحیم بخش صاحب ہیڈ لیبر ریونیو[1] کے پاس بمقام سانگلہ جانا پڑا۔ ۳ مئی کو وہاں سے واپس آیا مطلع سے گیارھویں شعر تک سانگلہ جاتے ہوئے رات کی خاموشی میں کہے گئے۔ آخری پانچ شعر اور مقطع ۳ مئی کی شب کو ابر کی بوندوں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے وصل ہو گئے۔

ڈبوتی کیوں نہیں اب بحر بر کو　　الٰہی ہو گیا کیا چشم تر کو
وہ بے پر کی اڑاتے ہیں اُدھر روز　　ترستے ہیں ادھر ہم بال و پر کو
نکل آیا وہ آخر خون ہو کر　　بہت روکا کئے ہم اشک تر کو
غریبوں کا کوئی پرساں نہیں ہے　　اجل ہی بھیج دے یارب خبر کو
الٰہی مل گئے بچھڑے ہوئے سب　　دعا سے بھی ملا دے اب اثر کو
ملاؤ آنکھ کچھ دل کا پتہ دو　　ذرا اونچی کرو نیچی نظر کو
وہ وسعت آنکھ میں ہے بحر عالم　　نظر آیا حباب آسا نظر کو
بنانا زلف کا تم کو سکھایا　　دُعائیں دو مرے دود جگر کو
ترا جلوہ تو ہر شے سے عیاں ہے　　نظر آتا ہے پر اہل نظر کو
جسے چاہا اسے سانچے میں ڈھالا　　نہیں کچھ روک دست کاسہ گر کو
محبت سے نہ دیکھو سوئے دشمن　　نہ لگ جائے نظر ذوق نظر کو
یہ قوت رکھ کے بچتا ہے گناہ سے　　فرشتے پر فضیلت ہے بشر کو
یہ سودائے وطن کیا جائے سر سے　　خرید اے کے سر اس درد سر کو
اُدھر وہ میوہ کیا جڑ تک نہ چھوڑیں　　ادھر سمجھیں غنیمت ہم شجر کو
اِدھر تم سے ہے ہر تار گل پوش　　ادھر تم سے کھٹک ہے ہر نظر کو

[1] حال پنشنر بمقام سیالکوٹ۔

زبانیں ماتوں سے سوکھی ہوئی ہیں   کریں کیا قحط میں ہر شعر تر کو

مصیبت ساتھ ساتھ اپنے ہے اے فوقؔ

رہیں ہم گھر میں یا جائیں سفر کو

ہندوستان میں بم کا پہلا واقعہ

مئی ۱۹۰۸ء کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی۔ کہ مظفر پور (بہار و اڑیسہ) میں دھنیش چندر رائے اور خودی رام بوس دو بنگالی لڑکوں نے بم چلا کر ہندوستان کی تاریخ کا ورق ہی الٹ دیا جس گاڑی پر بم پھینکا گیا تھا اس میں دو لیڈیاں سوار تھیں۔ وہ دونوں ملیامیٹ ہو گئیں۔ بم کا یہ واقعہ ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی بات تھی اس لئے لوگ حیران و ششدر رہ گئے میں نے بھی پرانی انار کلی کے ایک مشاعرہ میں اس پر ایک نظم پڑھی میری پالیسی ملکی معاملات میں شروع ہی سے معتدل رہی ہے اسی پالیسی کے ماتحت یہ نظم بھی تھی لیکن اس زمانہ میں اس قسم کی نظمیں بھی گورنمنٹ کی نظر میں کھٹکتی تھیں چنانچہ اسی نظم کی وجہ سے وہ مشاعرہ پولیس نے بند کر دیا۔

مانا کہ سلطنت کے بگڑے ہوئے ہیں تیور   مانا کہ آج کل ہے تکلیف میں رعایا

بے اعتدالیوں نے ملکر تمہاری لیکن   ان مشکلوں کو اب تو کچھ اور بھی بڑھایا

جو مانگنا ہے مانگو حد ادب کے اندر   گستاخ ہو کے ناحق نقصان کیوں اٹھایا

قانون سے لڑو تم۔ آئین پر چلو تم   لیکن نہ بم کے گولوں سے یوں کرو صفایا

ہر چند اس میں شامل بجلی کی بھی کڑک ہے   برطانیہ سہے پھر بھی ابر کرم کا سایا

ہم متفق نہیں ہیں پورا ہو کام کیونکر   نا اتفاقیوں نے یہ روز بد دکھایا

ساری بلائیں نازل ہوتی ہیں اب ہمیں پر   افلاس ہم میں آیا اور قحط ہم پہ چھایا

پنچایتوں سے نفرت جا کر عدالتوں میں   جو کچھ کمایا ہم نے وہ رائیگاں گنوایا

چغلی شعار اپنا ذلت وقار اپنا — لے ہند والو سوچو یہ حال کیا بنایا
اپنے ہی بھائیوں سے لڑ لڑ کے مر رہے ہو — تم خود ہی گھٹ رہے ہو کس نے تمہیں گھٹایا

اے فوق دل سے اپنی فرقت یہ دعا ہے
ہندوستانیوں پر تو رحم کر خدایا

انجمن سخن لاہور کا چوتھا مشاعرہ پنڈت رام بھجدت بی اے ایل ایل بی وکیل لاہور کی کوٹھی میں ۲۹ جون ۱۹۰۸ء کی شام کو بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کالجوں کے ہندو مسلمان اور سکھ طلبا مشاعرہ میں کثیر تعداد میں شامل ہوئے۔ حاضرین کی تعداد دو ہزار سے کم نہ تھی۔ میں نے یہ غزل بیماری کی حالت میں لکھی چنانچہ سترھویں شعر میں اپنی صحت کا اشارہ بھی کر دیا ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ وجاہت صاحب کے ہاتھ اپنی غزل بھیجدونگا لیکن دوستوں کا اصرار میرے انکار پر غالب آگیا۔ میرے علاوہ وجاہت مرحوم ایڈیٹر اصلاح سخن۔ منشی سجاد حسین کیف میرٹھی۔ منشی منور خاں ساغر اکبر آبادی۔ منشی اد یار خان جوگی (مرحوم)، پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی۔ منشی مقبول احمد شاعر کاسگنج ضلع اٹیہ۔ منشی عبدالحمید ازل (لاہور) اور دیگر شعرا نے بھی غزلیں پڑھیں۔ مصرع طرح یہ تھا۔ ع جان لینے کو دلہن بن کے قضا آئی ہے۔ مطلع اس اصرار سے۔ بار بار سنا گیا۔ کہ میں نے تنگ آکر سنانے سے انکار کر دیا۔

رخ روشن پہ ترے زلف دوتا آئی ہے — گوروں پر دوڑ کے یا کالی بلا آئی ہے
" " " " — خانہ کعبہ پہ یا کالی گھٹا آئی ہے
دل تو کیا جان کا رونا ہے وفاداروں کو — کہ ادا آج تری شکل قضا آئی ہے
چاند سورج بھی چھپے جاتے ہیں اے ابر محیط — ہند پر کیسی نحوست کی گھٹا آئی ہے
جس سے انجمن پر بھی سب آرزوئیں ٹوٹ گئیں — ق تاریں ایسی خبر شملہ سے کیا آئی ہے
دب گئے اہل خبر کٹ گئے ارباب پریس — یہ نئی تیغ ہے جو صورت لا آئی ہے

لے پولٹیکل تحریکوں کو دبانے اور اخبارات کی آزادی کا گلا گھونٹنے کیلئے سرلارڈ منٹو کی تحریک سے یہ قانون انہی ایام میں پاس ہوا تھا اور سول ملٹری گزٹ نے یہ تار بڑے فخر و مباہات سے چھاپا تھا۔

وہ گئے دن کہ تھی رفتار قلم کی آزاد
اب ایڈیٹر ہو وہی جس کی قضا آئی ہے

کام لے جا ہیں عمل بد ہیں خیالات خراب
جو دبا آئی ہے ہم پر وہ بجا آئی ہے

آگے چل کر ابھی دیکھو گے جو ہیں فعل یہی
دہر پر فتنہ میں آفت ابھی کیا آئی ہے

لاغری نے مجھے محروم اجل ہی رکھا
یوں تو سو بار وہ ہنگام دعا آئی ہے

پھول تو پھول ہیں کانٹوں میں بھی خوشبو دیکھی
جب تری نکہت گیسوئے دوتا آئی ہے

کیا عجب پھوٹے اگر شاخ ہرن میں کونپل
گلشن دہر میں وہ نشو و نما آئی ہے

قاتل آجا کہ ترے دل کے بڑھانے کیلئے
مرحبا کہتی ہوئی میری قضا آئی ہے

وار کچھ ایسے کئے تیغ ادا سے تو نے
لب ہر زخم پہ لے شوخ دعا آئی ہے

اک عدو ہے کہ وہ ہے مورد لطف بیحد
ایک میں ہوں کہ مرے حصے جفا آئی ہے

فضل خالق ہی نے بخشی ہے تپ غم سے نجات
نہ دوا آئی موافق نہ دعا آئی ہے

دہر میں صنعت صانع ہوئی میری رہبر
دیکھکر حسن بتاں یاد خدا آئی ہے

واعظ و رند کی تکرار الٰہی توبہ
دوزخ و خلد کو باہم یہ لڑا آئی ہے

ترچھی فوق نہ بدمست ہو توبہ توبہ
ابر ہے باغ ہے ساقی ہے گھٹا آئی ہے

دوسری سیاحت کشمیر کا کلام

اہل کشمیر سے خطاب

۷ ستمبر ۱۹۰۸ء کو میں پھر کشمیر روانہ ہوا۔ چلتی گاڑی ہی میں یہ "اہل کشمیر سے خطاب" کے عنوان سے چند شعر راولپنڈی تک تیار ہو گئے۔ یہ نظم انجمن نصرت الاسلام کے جلسے میں پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن میں دیہاتی سیر کی وجہ سے سری نگر نہ جا سکا۔

اے اہلِ وطن شوق سے بچوں کو پڑھاؤ — میدان ترقی میں قدم جلد بڑھاؤ
جیتے ہو تو جینے کے کچھ آثار دکھاؤ — بس راہ روی چھوڑ دو۔ راہ راست پہ آؤ
عزت سے اگر جینا ہے تو علم پڑھو تم
ہاں تاکہ مرو بھی تو اسی دھن میں مرو تم

ایماں مرا اے حبِ وطن تجھ میں نہاں ہے — فردوس کا اے خاکِ وطن تجھ پہ گماں ہے
پھر کھینچ کے ہاں شوق ترا لایا یہاں ہے — لاہور کہاں ورنہ یہ کشمیر کہاں ہے
پنجاب میں برسوں سے ہے گو اپنی سکونت
نزدیک رگِ جاں ہے مگر تیری محبت

نادار ہے تو پر ترا اللہ غنی ہے — واقف ہے وہ حالت سے بری ہے کہ بھلی ہے
مدنظر اے قوم اگر امر بنی ہے — پھر شاخ تمنا بھی سمجھ لے کہ ہری ہے

۱؎ مہاراجہ امر سنگھ، مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے چھوٹے بھائی۔ تاریخ وفات ۲۶ مارچ ۱۹۰۹ء۔ ۲؎ مہاراجہ ہری سنگھ والئے جموں و کشمیر مہاراجہ امر سنگھ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ اس زمانہ میں ولیعہد تھے۔

کیوں صبر تجھے اے دل بے تاب نہیں ہے
کیا سر پہ ترے سایۂ پرتاب[1] نہیں ہے

راولپنڈی کے رستے کشمیر کی پہلی منزل چھتر کے بعد چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ چھتر میں ذرا آرام کر کے ایک بجے رات کے قریب تانگے[2] اور یکے والے پھر روانہ ہو جاتے ہیں ابھی مسافت دو تین منزل ہی طے ہوئی تھی کہ ابر کرم نے جس کے آثار پہلے سے پائے جاتے تھے۔ جل تھل ایک کر دیا۔ بارش کا زور آندھی کا طوفان۔ رعد کی کڑک۔ تاریکی کی شدت۔ غربت کا عالم۔ تانگہ کی چھت بارش کی کثرت سے چھلنی کے موافق ہو رہی تھی۔ باوجود ان مصیبتوں کے نیند۔ ہاں وہ نیند جس کی نسبت کہتے ہیں کہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ ہمارے ساتھ تھی تعجب ہے کہ بعض مصرعے بلکہ پانچ چھ شعر عالم خواب ہی میں موزوں ہو گئے۔ صبح جب آنکھ کھلی تو بارش ختم ہو چکی تھی۔ تانگہ روانہ ہوا میں دو تین میل تک پیدل گیا ٹھنڈی ہوا سبزہ زار کا نظارہ طبیعت کی یکسوئی طیوران خوش نوا کی طرح طرح کی بولیاں۔ درختوں اور جنگل کی بوٹیوں کا لہلہانا کھرنا ندی نالوں میں بارش کے پانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہنا ایک عجیب دل آویز منظر تھا۔ اس غزل کے آخری پانچ شعر اسی کیف و نظارہ کی یادگار ہیں۔

دل تصور سے ترے معمور ہے — آنکھ میں جلوہ ترا مستور ہے
دولت دنیا پہ اے غافل گھمنڈ — چلتی پھرتی چھاؤں پر مغرور ہے
رحم کر اے ژالہ باری رحم کر — شیشۂ دل خود ہی چکنا چور ہے
بس خموش اے رعد اس غربت میں ہوں — دور اے ظلمت کہ منزل دور ہے
آج دھل جائے مری فرد عمل — تجھ سے اے ابر کرم کیا دور ہے

---

[1] مہاراجہ سر پرتاب سنگھ وفات ۱۹۲۵ء۔ اصل لفظ پرتاپ ہے
[2] اس زمانہ میں تانگہ اور یکہ ہی کا رواج تھا موٹریں اور لاریاں ابھی ناپید تھیں۔

لاکھ منصوبے کرو ہوگا وہی قادر مطلق کو جو منظور ہے
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے اُسے خطۂ گلمرگ رشک طور ہے
اے دل مغرور سوچ انجام کو وقف پامالی سر فغفور ہے
پھینک تیشہ ہوش میں آ کوہکن تو ہے عاشق یا کوئی مزدور ہے
نشۂ عشق بتِ کشمیر میں
ذوق سا ہشیار بھی مخمور ہے

۱۱ ستمبر ۱۹۰۸ء کی شام کو ہمارا ٹانگہ رام پور کے پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ رات کی نکھری ہوئی خوبصورت چاندنی میں ہم یہاں سے روانہ ہو گئے۔ اور ساڑھے چار بجے صبح بارہ مولا پہنچ گئے۔ چاندنی رات۔ ہوا کے سناٹے۔ ہو کا عالم۔ اور اس عالم میں دریا کا شور طبیعت میں پھر ایک لہر اٹھی اور یہ تین شعر نکل گئے۔

کامیابی کے لئے ہمت ہے شرط آ گئے جو اللہ کو منظور ہو
آمری امید۔ میری جاں نواز اے خیالِ ناامیدی دور ہو
سچ جو بولے گا وہ مارا جائیگا
ذوق ہو سرمد ہو یا منصور ہو

کشمیر کے ایک جنگل کا نظارہ

یہ نظم ۱۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کی رات کے نو بجے بمقام "بڈ مقام" لکھی گئی۔ اس وسیع اور سرسبز و شاداب جنگل میں جو موضع شوہ سے تین میل کی سخت دشوار گذار چڑھائی پر موضع چیڑ ہار کے اوپر واقع ہے میرا کئی دن تک قیام رہا۔ جو کچھ مجھے وہاں نظر آیا اور جیسی کچھ کیفیت میرے دل نے وہاں کی سیریوں اور سبزہ زاروں سے محسوس کی اور جو کچھ اثر اس کیفیت کا میرے دل پر ہوا۔ وہ خیالات موزوں کی صورت میں

۲۷-۲۸ ستمبر تک مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا رہا۔

جنگل میں زندگی کا کیا لطف آرہا ہے — سبزہ ہر ایک جانب مخمل بچھا رہا ہے
اے سرزمین صحرا رونق ہو کیوں نہ تجھ میں — خود باغبان قدرت تجھ کو سجا رہا ہے
یہ منظر دل افزا دلچسپ ہے کچھ ایسا — سارے جہاں کے جھگڑے دل سے بھلا رہا ہے
ہے کوہ پر الاؤ یا ژدنگ کی جھلک ہے — یا چرخ پر ستارہ یہ جھلملا رہا ہے
میداں بھی بستیاں بھی دریا بھی اور رول بھی — یہ پُر مقام منظر ہر اک دکھا رہا ہے
چھائی ہے گو خموشی ساری فضا میں لیکن — دلکش سی ایک سیٹی کوئی بجا رہا ہے
گو ہر ہے بزم شہ میں ہم ہیں غریب ہم کو — ہر طائر خوش الحاں گانا سنا رہا ہے
بستی کا بسنے والا خالی نہیں ہے غم سے — جنگل کا رہنے والا خوشیاں منا رہا ہے
یہ آگ سینکتا ہے غربت زدہ بدیسی — یا کوئی جوگی آکر دھونی رما رہا ہے
کیا لطف دے رہی ہیں ابر کرم کی بوندیں — ہر برگ گل نکھر کر جوبن دکھا رہا ہے
شاہوں کو بھی نہیں یہ بے فکریاں میسر — چرواہا جس مزے سے بھیڑیں چرا رہا ہے
پانی کے مٹکے سر پر ان لڑکیوں کے دیکھے — جوبن پری بنا کر جن کو اڑا رہا ہے
میلے لباس میں بھی کیا حسن کا ہے جلوہ — گدڑی میں لعل دیکھو کیا جگمگا رہا ہے
مستی میں جھومنا وہ کاہرو کی ٹہنیوں کا — کیا وجد کر رہا ہے کیا رنگ لا رہا ہے

یہ عالم خموشی یہ وقت اور یہ منظر
لو فوق دل ہی دل میں کچھ گنگنا رہا ہے

تہذیب نو کا سکہ جس ملک میں ہے جاری — وہ عیش کر رہا ہے جو جی اڑا رہا ہے
آزاد ہے قلم بھی آزاد ہے زباں بھی — لکھنے کا بولنے کا کچھ لطف آرہا ہے

ﮯ کشمیری زبان میں الاؤ روشنی اور ژدنگ دیئے (چراغ) کو کہتے ہیں۔

دن رات مدرسوں میں ہے علم و فن کا چرچا
مزدور تک بھی جن میں تعلیم پا رہا ہے

اخبار ویکلی[۱] بھی ڈیلی[۲] بھی منتھلی[۳] بھی
ہر درد مند قومی شائع کرا رہا ہے

لیکن نہ پوچھو حالت ویسی ریاستوں کی
بادل ہے ایک غم کا جو سر پہ چھا رہا ہے

جس نے شکایتوں پر کھولی زبان اپنی
گویا اجل کے منہ میں وہ خود ہی جا رہا ہے

اخبار یا رسالہ رکھتا ہے حکم عنقا[۴]
اے دل خیال تیرا کس سمت جا رہا ہے

دنیا میں کاشتکاروں پر ہو رہے ہیں احساں[۵]
لیکن یہاں یہ فرقہ ایذا اٹھا رہا ہے

گو پک چکی ہیں فصلیں کاٹے گا کون آکر
مالک ہے جو بچارا بیگار[۶] جا رہا ہے

ہوتی ہے سال بھر کی برباد اب کمائی
افسوس مرشوں کو ظالم ستا رہا ہے

افلاس اس قدر ہے کپڑا نہیں بدن پر
عریاں تنی کا جامہ بس ٹھیک آ رہا ہے

کشتہ ہے علم تیرا۔ لے اب خدا نگہباں
ہے بادباں نہ کوئی اب ناخدا رہا ہے

یہ حال جس جگہ ہو کیا زندگی وہاں کی
پھر اس پہ آہ بھائی بھائی کو کھا رہا ہے

---

۱ ہفتہ وار ۲ روزانہ ۳ ماہوار ۴ اس زمانہ میں ریاست جموں و کشمیر میں سوائے سرکاری گزٹ کے کسی اور اخبار یا رسالہ کے اجرا کی اجازت نہ تھی۔ راقم نے خود ۱۹۰۶ء میں درخواست دی تھی جو نامنظور ہوئی تھی اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں پھر درخواست دی وہ بھی نامنظور ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف بی اے کو کڑی شرائط کے ساتھ رنبیر کی اجازت ملی اب جموں خاص میں رنبیر کے علاوہ امر، سدرشن، پاسبان، آفتاب اور ترجمان کشمیر ہفتہ وار اخبار جاری ہیں اور کشمیر کے صدر مقام میں بھی صداقت، رہبر، حقیقت، خالصہ گزٹ اور فتح جاری ہیں۔ پربھات اور کشمیر جدید کے نام سے چند اور اخبار جاری ہونے والے ہیں ۵ اس وقت ریاست میں نہ قانون انتقال اراضی تھا نہ اتحادی سوسائٹیاں تھیں نہ قانون تحفظ زمینداری کا نفاذ تھا ۶ موجودہ مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر کے عہد میں جبری بیگار قطعاً موقوف ہے قلیوں کو ۷ یا ۸ یومیہ مزدوری ملتی ہے۔ گو اس میں ترقی و اضافہ کی بڑی ضرورت ہے۔

دلچسپ منظروں کو یہ اوڑھیں یا بچھائیں   ان کی بلا سے سبزہ گر رنگ لا رہا ہے

اے مہر علم و حکمت ہاں اک جھلک ادھر بھی
پرتو سے تیرے سارا جگ جگمگا رہا ہے

۱۹۰۸ء کے آخری چار مہینے پنجاب میں موسمی بخار کا بڑا زور رہا۔ کوئی گاؤں کوئی قصبہ اور کوئی شہر اس وبائے عام سے خالی نہ تھا۔ میں بھی ان افسوسناک اور تشویش انگیز خبروں کے سننے سے کشمیر میں پریشان ہو رہا تھا۔ کہ اتنے میں چچازاد بھائی (منشی غلام محمد صاحب خادم کے لڑکے منظفر محمود) کے انتقال کا خط ملا۔ مجبوراً ۶۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کی صبح کو وطن کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ اسی دن سوپور میں ستمبر ۱۹۰۸ء کا رسالہ اصلاح سخن ملا جس کی آئیندہ طرح ع کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔ بے ثباتئے دنیا کے متعلق تھی۔ اس لئے طبیعت کی بے اختیاری سے چند شعر نکل گئے

ہے عجب رنگ نوجوانی کا   پھول ہے باغ زندگانی کا

آہ بھی لب تک آ نہیں سکتی   زور ایسا ہے ناتوانی کا

جل بسی بیکسی میں۔ اے پیری   مرثیہ پڑھ مری جوانی کا

مہرباں ہو کے قتل بھی کر لو   میں تو بندہ ہوں مہربانی کا

لب خاموش کو نہ سمجھو بند   ہے بیاں میری بے زبانی کا

رنج ہی سے ہے قدر راحت کی   لطف کیا عیش جاودانی کا

حسرتوں نے اٹھائی ہے میت   ہائے ماتم مری جوانی کا

نہیں ملتا کوئی زمانے میں   سننے والا مری کہانی کا

فوق اب شاعری کا لطف نہیں
اُٹھ گیا دور قدر دانی کا

دسمبر ۱۹۰۸ء کے اصلاح سخن کے لئے یہ طرح تھی ع چاندنی رات میں اندھیرا ہے میں بارہ مولا میں ٹانگہ کے انتظار میں تھا ۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کی رات کے آخری حصہ میں آنکھ کھل گئی ۔ لیٹے ہی لیٹے اندھیرے میں چودہ پندرہ شعر موزوں ہو گئے ۔ صبح کو بمشکل مندرجہ ذیل سات شعر یاد رہ سکے ۔

تیرہ بختی نے سخت گھیرا ہے آہ چاروں طرف اندھیرا ہے
رخ پہ زلفوں کو یہ بکھیرا ہے یا شب ماہ میں اندھیرا ہے
مہرباں ہو حسیں یہ ناممکن کوئی ڈاکو کوئی لٹیرا ہے
چھپ گیا ہے ترا تصور بھی وہ شب ہجر کا اندھیرا ہے
یاس و حسرت جہاں برستی ہے ترے ناکام کا وہ ڈیرا ہے
جس طرح ہو گذار دے بلبل چار دن باغ میں بسیرا ہے

مار گیسو کو رام کر ہی لیا
فوق تو بھی کوئی سپیرا ہے

ایک واقعہ کا اثر

لاہور کے مشہور نقاش میاں میراں بخش مرحوم (اندرون مسجد وزیر خان) کو ایک کتاب کا ٹائٹل نقاشی کے لئے دیا تھا ۔ میں ان کے وعدے کے مطابق تیسرے دن ان کے پاس گیا ۔ دیکھا کہ وہ غمگین بیٹھے ہیں ۔ سبب پوچھا ۔ کہا کہ کل شیرخوار پوتے کو سپرد خاک کر چکا ہوں ۔ اور پیٹ ظالم نے آج پھر کام پر لگا دیا ہے ۔ اتنا کہنے کے بعد ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔ میرے دل پر بہت اثر ہوا ۔ تین بجے دوپہر کا وقت تھا ۔ مندرجہ ذیل شعر وہیں بیٹھے ہوئے موزوں ہو گئے ۔

چشم گریاں ہے لب خنداں پہ پردے کیلئے گوہر دل بحر غم میں غرق ہونے کے لئے

جسم تھا اک کوزۂ گل ٹوٹ کر گل ہو گیا
خاک سے پیدا ہوئے ہم خاک ہونے کیلئے

بود میں نابود ہے اور نیستی ہستی میں ہے
جاگتے ہیں ہم جہاں میں آہ سونے کے لئے

عیش میرا رنج و غم، اور موت میری زندگی
اس جہاں میں ہے مرا ہونا نہ ہونے کے لئے

قبر میں بھی ساتھ کیا لیجاؤ گے اے غافلو
آہ! یہ جھگڑے زمیں کے ایک کونے کیلئے

ہو چکی ہے وقت اب لے فوقؔ اپنی شاعری
در در ارباب وطن پر رونے دھونے کیلئے

ایک کشمیری اور پنجابی کا مکالمہ

۷ ستمبر ۱۹۰۹ء کی شام کو چھ بجے کے قریب ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم اے کا لکھا ہوا تبصرہ داغ پڑھ رہا تھا جب اس شعر پر پہنچا ؎

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

تو واقعی دل دردمند کو خلش تیر کی لذت ملی۔ بار بار پڑھا اور جتنی بار پڑھا ایک عجیب ہی کیفیت محسوس ہوتی رہی۔ اسی عالم میں یہ خاکپائے اہل ذوق سٹیشن (لاہور) کی طرف چلا گیا۔ ابتدائی پچیس شعر عالم سیر وکیفیت ہی میں رات کے دس بجے تک کہہ لئے گئے۔ باقی نظم ۱۲ ستمبر تک مختلف اوقات میں ختم ہو گئی۔

گھر سے باہر لے گئی کل لذت ذوق نظر
پھرتے پھرتے ہو گیا میرا سٹیشن پر گذر

شام کا وہ وقت وہ سیر چراغاں کا مزا
ہو گئی تھی محو دل سے الفت ما و شما

مست اپنے حال میں تھا گنگناتا جا رہا
دل سے کچھ سنتا تھا کچھ دل کو سناتا جا رہا

ذوق نظارہ مجھے لیکر وہاں پہنچا۔ جہاں
لے رہے تھے ہم کلامی کا مزا۔ دو نوجواں

ایک پنجابی تھا ان میں ایک کشمیری نژاد
گفتگو ان کی سنی تو آگئی جنت کی یاد

پنجابی کس شوق سے سیر کشمیر کی تمنا ظاہر کرتا ہے

کھینچکر اک آہ پنجابی نے حسرت سے کہا   کاش ہو میرے مقدر میں بھی جنت کی ہوا
ہر طرف نہریں رواں ہیں ہر طرف چشمے رواں   رشکِ فصلِ گُل وہاں کی سنتے ہیں فصلِ خزاں
جاں بلب ہوتے ہیں جب گرمی سے ہم پنجاب میں   چلتی ہیں ٹھنڈی ہوائیں خطۂ نایاب میں
سیر ڈل کی اور وہ نظارہ ہائے دلفریب   جن کو سُنکر ہاتھ سے جاتا ہے صبر و شکیب
جنت ارضی کی حسرت ہے دلِ دلگیر کو   اے ہوائے شوق اڑا لے چل مجھے کشمیر کو

کشمیری کس حسرتناک لہجہ میں جواب دیتا ہے

چھیڑ کر غربت میں ذکر خطۂ کشمیر کیوں؟   بھیٹا مارا ہے پردیسی کے دل پر تیر کیوں؟
آئے گا منہ کو کلیجہ اب وطن کی یاد میں   چشمِ بلبل خون روئے گی چمن کی یاد میں
آہ وہ "بے پہہ نٹنزن" کی روانی ہر طرف   ڈل کا دریا کا ڈلر کا صاف پانی ہر طرف
وہ ہوائے روح پرور اور اثمار لذیذ   ہے کھٹک خارِ وطن کی مجھکو آزار لذیذ
غیر کی ہر چیز نظروں میں مری ۔ ناچیز ہے   ہاں وطن کیا چیز ہے حبِ وطن کیا چیز ہے
حسن ہے موجود پر ہے بند دکانِ وطن   نذر ہے جورِ خزاں کی آہ بستانِ وطن
تیرا کیا کہنا ہے اے دنیا کے فردوسِ بریں   تیری شہرت ہے تا روس و روم و شام و چیں

تو نے بھی جو کچھ کہا اور میں نے بھی جو کچھ کیا   اس سے تو آگاہ ہے اے دست ہر جو باڑا
روشنی کے ساتھ ہی اک پہلوئے ظلمت بھی ہے   بوئے گل ہے جس جگہ واں خار کی زحمت بھی ہے

خاک پاک خطۂ کشمیر ہے جنت ۔ مگر   قہر دوزخ کا نمونہ ہے یہاں بیگار بھی
خلد ہے کشمیر تو اس میں عذاب نار کیوں   کیا ہوا کرتا ہے جنت میں کہیں آزار بھی
ایک تو بیگار لیں پھر اس پہ مزدوری نہ دیں   مارتے ہیں آہ ظالم تیر بھی تلوار بھی

اس بہانے سے بہت ظلم و ستم ہے ملک پر — کھا گئے ظالم زمینداروں کی پیداوار بھی
عام لوگوں کا وہاں کیا حال ہوگا سوچ تو — خوف حاکم سے جہاں لرزاں ہوں نمبردار بھی
یہ تشدد کاش پہنچائے کوئی مہر آج تک — باخبر حالِ رعیت سے تو ہو سرکار بھی

ساکنانِ خطۂ پنجاب کا کیا پوچھنا؟ — چشمۂ علم و ہنر سے ملک ہے سب فیضیاب
جاگ اُٹھے خوابِ گراں سے آج سب سوئے ہوئے — بہرہ ور تعلیم کی نعمت سے ہے ہر شیخ و شاب
پھیل جائے روشنی تعلیم کی چاروں طرف — کاش ہو کشمیر سے بھی دُور ظلمت کا حجاب
کاش کشمیری بھی ہوں شیدا علوم دہر کے — کاش اہل علم و فن ہو جائے ان کا بھی خطاب
ہیں جواں کشمیر کے لہو و لعب میں مبتلا — مل گیا مٹی میں اپنے ملک کا عہدِ شباب
قومیت کا یاں نشاں تک بھی نہیں احساس کیا — ڈال دوں میں بچوں اور بوڑھوں کے جوش و اضطراب
روز افزوں ہے یہاں اخبار خوانی کا مذاق — اور وہاں ہر بزم میں ہنگامۂ چنگ و رباب
شومئ قسمت کہ خود عیسیٰ بھی ہے بیمار و زار — اور اس پر یہ ستم بیمار بھی ہے مستِ خواب

آپ ہی فرمائیے ہے رنج میں راحت میں کون — جانیے میں کون ہے مسکن گزیں جنت میں کون
کیا ہوا چشمے اگر چلتے رہے بہتے رہے — ملک کے افراد تو رنج و الم سہتے رہے
جس جگہ تعلیم و تہذیب اور آزادی نہ ہو — اس جگہ یارب کبھی انساں کی آبادی نہ ہو

پنجابی اس جواب سے متاثر ہو کر کشمیری کو تسلی دیتا ہے۔ اور پنجاب میں ہندو مسلمانوں کے بگاڑ کا رونا روتا ہے

دردِ دل سے اے مخاطب تو نے جو تقریر کی — اس سے تو حالت مرے دل کی بہت تغیر کی
جاہلیت اس قدر جنت کے باشندوں میں ہو — ہاں تفو اے دورِ چرخِ چنبری بر تو تفو
حال یہ کشمیر پر لیکن نہیں کچھ منحصر — ہر جگہ بیگار کا ظلم و ستم آیا نظر

ہے تشدد سے کہیں نرمی سے جاری ہے کہیں
لیکن اس سے سرزمین ہند بھی خالی نہیں

حال مزدوروں کا دیکھو تم نگینے[۱] میں ہے کیا
ان سے پوچھو تو ذرا اب لطف جینے میں ہے کیا

جب[۲] یہاں سے ہو فراغت جاؤ گورکھپور میں
ڈر وہاں بیگار کا ہے ہر بشر معذور ہیں

ہے مظفرگڑھ میں اک قصبہ ستاناواں[۳] نامور
ظلم سے بیگار کے نالاں ہے واں ہر اک بشر

سانگلہ[۴] کا شہر تو یاں سے بہت نزدیک ہے
جا کے دیکھو گے تو بول اٹھو گے بیشک ٹھیک ہے

تودہانہ[۵] کے علاقہ میں بھی ہیں کچھ کچھ عیاں
روشنئ عہد انگریزی کی یہ تاریکیاں

اس عملداری میں بھی بیگار کا یہ حال ہے
جو سراسر علم کے جوہر سے مالا مال ہے

علم ہے بیشک ہمارے ملک میں پھیلا ہوا
یہ بھی اک اللہ کی نعمت ہے گر سوچیں ذرا

اس کا پڑھنا اور پڑھانا ہے سراسر فائدہ
ہم تہیدستوں پہ اس کا پر اثر الٹا ہوا

پہلے تو ان پڑھ تھے جاہل اور اب لکھے پڑھے
یعنی ہیں جنگ و جدل میں محو سب لکھے پڑھے

تھی امید اصلاح کی اخبار والوں سے۔ مگر
خود انہوں نے باندھ لی لڑنے لڑانے پر کمر

اب عداوت بیشتر ہندو مسلمانوں میں ہے
آہ نا انسانیت کس درجہ انسانوں میں ہے

ہے[۶] بس کشمیر میں بے جا طرفداری نہیں
واں تعصب اور حسد کی گرم بازاری نہیں

۱؎ نگینہ ضلع بجنور میں بیگار کے ظلم۔ ۲۰ اگست ۱۹۰۹ء کے اخبار مشرق گورکھپور میں چھپے تھے۔
۲؎ اخبار مشرق ۲۰ اگست ۱۹۰۹ء
۳؎ اخبار جھنگ سیال ۱۰ اسوج سمت ۱۹۶۶ / اخبار بیداری لاہور ۵ اکتوبر ۱۹۰۹ء
۴؎ اخبار ہندوستان لاہور ۷ ستمبر ۱۹۰۹ء
۶؎ " " " " " "

ہیں معاون نصرت الاسلام کے ہندو بہت
ہندوؤں کے کام میں مسلم ہیں ہم پہلو بہت
ہیں ہم شیر و شکر دونوں کی بس ہے ایک بات
خطۂ کشمیر میں سنتے ہیں کم ہے چھوت چھات

کشمیری کا آخری جواب

شکر ہے اب تک تعصب کا نہیں نام و نشاں
دیکھیے آگے دکھائے کیا خدائے دو جہاں
زندگی اپنی بسر ہوگی وطن میں بے ضرر
بچ گئے ہم اجنبی لوگوں کی نظروں سے اگر
غیر ملکی جب جگہ جائیں گے آفت لائیں گے
آئیں گے خود اور اپنے ہم وطن بلوائیں گے
ہو رہی ہے ایسی باتوں کی یہاں بھی ابتدا
اب خدا حافظ مآل خطۂ کشمیر کا
کب پڑے گی ان کی اوروں کی بھلائی پر نظر
خود تماشا بن گئے گھر بار کو جو پھونک کر
پنڈتوں کو یہ مسلمانوں سے اب لڑوائیں گے
خطۂ کشمیر کو بس لوٹ کر کھا جائیں گے

آپ نے بیگار کی جتنی مثالیں پیش کیں
آپ کے کہنے سے پہلے سب مجھے معلوم تھیں
یہ تو حکام مقامی کے ہیں ظلم ناروا
ان میں ہاں سرکار انگریزی کی ہے تقصیر کیا؟
کون کہتا ہے یہ ناجائز جفائیں خوب ہیں
سخت گیروں کو ملا کرتی سزائیں خوب ہیں
پوچھنے والا نہیں کوئی ریاست میں مگر
رہتی ہے بیگاریوں کی آہ و زاری بے اثر
داد ملتی ہے ریاست میں کسے فریاد کی
اور الٹی چڑھ بنی ہے ہر ستم ایجاد کی
رہتی ہے بارہ مہینے تازہ یہ آفت یہاں
پاتے ہیں مظلوم دستِ ظلم سے راحت کہاں

ہاں ہمارا راجہ بھی رحمدل ہے نیک ہے
سینکڑوں فرمانرواؤں میں وہ بیشک ایک ہے
ہائنس کو ہے رعایا کی انہیں ہر دم خیال
ظلم سے اب ہونے والی ہے جہالت پائمال
یہ بشارت عنقریب آنے کو ہے تحریر میں
آج سے موقوف ہے بیگار بھی کشمیر میں

جھگڑے سب مٹ جائینگے تکرار کم ہو جائے گی
رفتہ رفتہ ایک دن بیگار کم ہو جائے گی

۹۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء کی رات کو دس بجے ایک عزیز کے انتقال کی خبر ملی۔ بارہ بجے گاڑی گوجرانوالہ جاتی تھی اس پر سوار ہوا۔ اور لاہور سے شاہدرہ کے درمیان (۱۲ بجے شب سے ایک بجے تک) جبکہ ہمراہیوں میں سے کچھ لیٹے ہوئے اور کچھ سوئے ہوئے تھے میں بقول آزاد

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں — آزاد سے جگائے خدا کی جناب میں

اشک خونیں کو نوحہ کی شکل میں کاغذ پر لکھ رہا تھا۔

"تا چند خوں رلاؤں بھلا چشم تر کو میں — کروں شریک حال کسی نوحہ گر کو میں
وہ غم نصیب ہوں کہ نمک پاشیاں کرے — مرہم دکھاؤں گر کبھی زخم جگر کو میں
کردیگا چور شیشۂ خاطر کو سنگ غم — کس طرح خار و خس میں رکھوں اس شرر کو میں
تم ہو وہاں جہاں سے نہ واپس کوئی ہوا! — بھیجوں کسے بتاؤ۔ تمہاری خبر کو میں"

اے موت تیری یاد نے سب کچھ بھلا دیا — اک نقش بیخودی تھا اسے بھی مٹا دیا
ہاں نوک غم کی چھیڑ سے یہ دل کے آبلے — وہ پھوٹ پھوٹ روئے کہ دریا بہا دیا
دی ہوتی ناتوانوں کو تسکیں کچھ اے سپہر — یہ کیا کیا؟ کہ گرتے ہوؤں کو گرا دیا
مدھم سی روشنی تھی چراغ حیات میں — اے باد مرگ تو نے اسے بھی بجھا دیا

وہ لوگ جو کہ تیری ترازو پہ تل گئے — اے موت سوئے ملک عدم کُل کے کُل گئے
یہ راہ وہ ہے جس سے گذرتا ہے ہر کوئی — خاموش کچھ۔ تو بعض بصد شور و غل گئے
کیا کیا کتاب زیست میں نقش و نگار تھے — ابر سیاہ مرگ سے افسوس دھل گئے
اچھا ہوا علاج دل دردِ آشنا — ٹانکے لگے تھے زخم میں جتنے وہ کھل گئے

رسالہ اصلاح سخن لاہور کا مصرع طرح تھا ع اس سمجھ بوجھ کا انسان نہ دیکھا نہ سنا
۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کی سحری کے بعد نیند نہ آئی مصرع طرح پر غور کیا۔ تو یہ چھ شعر تیار ہو گئے۔

آنکھ سے بڑھ کے سمندر کوئی آیا نہ نظر — دل سا ویران بیاباں نہ دیکھا نہ سنا
ہائے پھر اس ستم ایجاد کے دم میں آیا — تجھ سا اے دل کوئی نادان نہ دیکھا نہ سنا
ہائے رے ولولۂ خواہش اصلاح وطن — کوئی تجھ سا بھی پُر ارمان نہ دیکھا نہ سنا
ہم نے وحشی تو بہت عشق میں دیکھے لیکن — فوق سا چاک گریباں نہ دیکھا نہ سنا
صبح مسجد میں ہے اور شام کو میخانے میں — شیخ سا کوئی مسلمان نہ دیکھا نہ سنا

فوق صاحب ہیں خدا جانے کہاں کے شاعر
ہم نے تو آپ کا دیوان نہ دیکھا نہ سنا

(۲۴ نومبر ۱۹۰۹ء چاند کے شام ایک دوست کے مکان پر)

مہیب ہے مری فرد گناہ کی صورت — سواد نامہ ہے ابر سیاہ کی صورت
ترے فراق میں یہ حال ہے امیدوں کا — بغیر شاہ ہو جیسے سپاہ کی صورت
ہمارے مٹنے میں بھی ہے نمود کی اک شان — کہ پائمال ہوئے ہم گیاہ کی صورت
ملا تو ہے ترے جوہر سے میرا آئینہ — خدا کرے کہ ہو پیدا نباہ کی صورت
مجھے خراب کریگا یہ حسن کا چسکا — کنوئیں جھکائیگی مجھکو یہ چاہ کی صورت
بشر کو خیر سے شر میں ہے ڈالنے والی — یہ مال و دولت و اعزاز و جاہ کی صورت
یہ اختیار ہے تیرا کہ رحم کر یا ظلم — تو دیکھ لے مرے حال تباہ کی صورت

عذاب روز جزا سے ملے پناہ مجھے
نظر جو آئے رسالت پناہ کی صورت

ایک صاحب نے بہشت کے دوزخی یعنی باشندگان کشمیر پر جو نکتہ چینی کی تو تمام دنیا جہان کے عیب سب انہی میں پیدا کر دیئے۔ ان کے سوا ہندوستان کا ہر ملک اور اس کا ہر باشندہ انکی نگاہوں میں معصوم تھا۔ وہ اظہار خیالات میں اصلاح و ہمدردی کی بجائے طعن و تشنیع سے زیادہ کام لیتے تھے۔ ان کی سب باتوں کے جواب میں میری زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا ؎

کیا ہو رونق ان کے کاروبار میں | رات دن رہتے ہوں جو بیگار میں

اسی دن ۴ دسمبر ۱۹۰۵ء کو ہفتہ کے دن شام کے پانچ بجے اس شعر کے ساتھ مندرجہ ذیل اور شعر شامل ہو گئے۔

بار یابی غیر کو دربار میں | میری آنکھیں حسرت دیدار میں
اشک خونیں دیدۂ خونبار میں | روح فرسا غم۔ دل غمخوار میں
کیا ہو رونق ان کے کاروبار میں | رات دن رہتے ہوں جو بیگار میں
قوم کا رونا سرے اخبار میں | قوم کا نوحہ مرے اشعار میں
مثل دوزخ جنت کشمیر ہے | ہے صبا۔ صرصر۔ مرے گلزار میں
دربدر ہوں یوں عزیزان وطن | یوسف آوارہ ہو ہر بازار میں
دوزخی خوش اور محزون جنتی | خار میں گلشن ہے گلشن خار میں
اوجلانیوالے تو بھی جل نہ جائے | شعلہ ہائے آہ آتش بار میں
قوم کا غم اپنا غم دنیا کا غم | دن گذرتا ہے انہیں دوچار میں
سر پہ شوق تعلم کو کبھی | ڈال لے دل دیدۂ بیدار میں
غیر کا اب زور ہے پر تھا کبھی | جمگھٹا یاروں کا بزم یار میں

شہر والوں سے تو اب نفرت سی ہے
فوق چل رہیئے کسی کہسار میں

نظم ارتحال بانئے اخبار زمیندار

۱۰- دسمبر ۱۹۰۹ء کو جمعہ کے دن ۶ دسمبر کا اخبار زمیندار ملا۔ جو اس زمانہ میں کرم آباد نزیل وزیر آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے بانی منشی سراج الدین احمد مولانا ظفر علی خاں بی اے کے والد بزرگوار تھے۔ اور میرے کرم فرماؤں میں تھے۔ زمیندار میں ان کی وفات کی خبر پڑھکر بڑا صدمہ پہنچا۔ ان کا اخبار جسم ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی یعنی غریب زمینداروں کی خدمات و ترجمانی کے لئے وقف تھا۔ خبر وفات پڑھتے ہی مجھے مولوی نذیر احمد دہلوی کا یہ شعر جو انہوں نے سر سید احمد خان مرحوم کے مرثیہ میں لکھا تھا یاد آگیا۔ ؎

تجھے روئیگی سر پر ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت — اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

اخبار پڑھ چکنے کے بعد مجھے ایک کام کے لئے انارکلی جانا پڑا۔ رستہ میں یہ پُر درد شعر بار بار زبان پر آتا تھا۔ واپسی پر شاہ عالمی اور موچی دروازہ کے درمیانی باغ میں طبیعت کو اس طرف رجوع کیا۔ پندرہ مصرع گرہ سے لگائے تھے کہ ایک دوست آگئے۔ اور خیالات منتشر ہو گئے۔ اس سے زیادہ پھر کچھ نہیں کہہ سکا۔

قیامت کا نمونہ کر گئی پیدا تری رحلت — کہاں ریش سفید اب وہ کہاں وہ نور کی صورت
کہاں ڈھونڈھیں کدھر جائیں بتا دو حامئے ملت — تجھے روئے گی سر پر ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت
اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

نہ تھی فکر زمینداران سے تجھکو ایکدم فرصت — نمایاں تھی ترے اخبار سے سرگرمئ خدمت
لہو رولائے گی برسوں تری رحلت تری فرقت — تجھے روئے گی سر پر ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت
اور اس کو دیکھ لے گا جو کوئی جیتا رہا باقی

لگی تھی کچھ نہ کچھ اب بارور ہونے تری محنت — مگر افسوس ہے دست اجل نے دی نہ کچھ مہلت
ہوئیں سب خواہشیں رخصت سنی جسدم تری رخصت — تجھے روئے گی سر پر ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت

اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

چمن میں گل تو ہے جو لیکن اب نہیں نکہت
مرے پہلو میں دل تو ہے مگر دل میں نہیں فرحت
گیا زیر زمیں تو اور زمیں پر چھا گئی ظلمت
تجھے رو دیگی سر پہ ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت
اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

خسارہ گو رہا اخبار میں ہاری نہ پر ہمت
زمانہ ضعف و بیماری کا اس پر اس قدر محنت
کہاں سے لائیں گے اے مرنیوالے ہم تری جرأت
تجھے رو دیگی سر پہ ہاتھ رکھکر قوم بدقسمت
اور اس کو دیکھ لیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

جنوری ۱۹۱۰ء کے رسالہ اصلاح سخن کے لئے دسمبر ۱۹۰۹ء کے اصلاح سخن میں یہ طرح دی گئی تھی ع گرہ جو پڑ گئی رنجش کی وہ مشکل سے نکلیگی ۔ ۱۰ دسمبر کو اس پر ایک دو شعر لکھے۔ چند ۱۱ دسمبر کو۔ اسی طرح ۱۴ دسمبر تک یہ غزل جو ۱۹۰۹ء کا آخری کلام ہے مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر مکمل کر لی گئی۔

تمنا تیری دل میں آئیگی اور دل سے نکلیگی
یہ طلعت چاند سی آخر اسی منزل سے نکلیگی
نہ گھبرا اس قدر اے قیس رکھلے لاج الفت کی
تحمل کر کہ لیلیٰ پردہ محمل سے نکلیگی
ہماری بیکلی ہی اب اسے بے چین رکھتی ہے
پشیمانی نہ یہ ہرگز دل قاتل سے نکلیگی
مسافر جب کنار گور پہنچا یہ صدا آئی
تیرے آرام کی صورت اسی منزل سے نکلیگی
تمہاری یاد ہے دل میں جہاں دل ہے وہیں تم ہو
یہ لیلیٰ بعد مردن بھی نہ اس محمل سے نکلیگی
کسی نے سچ کہا ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے
وہ ان کے دل میں اتریگی جو میرے دل سے نکلیگی
ادھر آ ڈوبنے والے کہ تیرا ناخدا ہوں میں
کبھی تو یہ صدا آخر لب ساحل سے نکلیگی
روانی ہے تری تیغ ستم کی گر یہی قاتل
تڑپنے کی تمنا کب دل بسمل سے نکلیگی
کہاں تک دختِ رز کی بڑھتی جائیگی یہ بدمستی
کہ آخر ہو کے وہ رسوا تری محفل سے نکلیگی
ہزاروں نعمتیں دیگا یہ منگتا بھیک کا منعم
دعا تاثیر میں ڈوبی لب سائل سے نکلیگی

شکست و فتح ہو تو ہو مگر ہے صلح ناممکن
کوئی تو بات اب جنگِ حق و باطل سے نکلیگی

کسی بیدرد کے دل میں نہ رحم آیا نہ آئے گا
نہ شکل امید کی کچھ سعیٔ بے حاصل سے نکلیگی

تمنا ہے کہ ہوں شیر و شکر ہندو مسلماں بھی
مری وہ آرزو ہے جو بڑی مشکل سے نکلیگی

کبھی ہشیار تو ہوگا کبھی بیدار تو ہوگا
یہ غفلت ہاں کسی دن دیدۂ غافل سے نکلیگی

بظاہر اتفاقِ ہندو و مسلم ہے ناممکن
"گرہ جو پڑ گئی رنجش کی وہ مشکل سے نکلیگی"

غزل گوئی بھی نوحہ قوم کا اب ہوتی جاتی ہے
کہا جب بات کو حالیؔ[1] نے وہ ہزل سے نکلیگی

چلو سیدؔ[2] سے پوچھیں منزلِ مقصود کی راہیں
کہ صورت رہبری کی سالکِ کامل سے نکلیگی

وہ حسرت ذوقؔ کی سن کر ہنسے اور ہنس کے فرمایا
نکل تو جائے گی لیکن بڑی مشکل سے نکلیگی

---

[1] شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالیؔ پانی پتی مرحوم
[2] سر سید احمد خان مغفور بانیٔ علیگڈھ کالج۔

کلامِ فوق

حصہ سوم

نظم اخیر

از سنہ ۱۹۱۰ء تا اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

اس حصہ میں چند نظموں کے سوا باقی تمام نظمیں سفر کشمیر کشمیر اور اہل کشمیر سے متعلق ہیں۔ اور کشمیر اور اہالیان کشمیر اور بالخصوص مسلمانان کشمیر میں تنظیم و تعلیم خود شناسی و خودداری اور احساس و بیداری کی جن توقعات اور مستقبل کشمیر کے متعلق جن امید افزا خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ اس خواب پریشاں کی روح پرور تعبیر اس خادم ملک وملت نے ۲۸ سال کی مسلسل خدمات کے بعد اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی ہے۔

(۲۸ فروری ۱۹۱۰ء صبح آٹھ بجے بہ دوران سیر بمقام لاہور)

سارے نغموں کا مزا دل سے بھلایا تو نے ۔۔۔ بنسری والے عجب راگ سنایا تو نے
باغ عالم میں عجب رنگ دکھایا تو نے ۔۔۔ درس عرفاں ورق گل میں پڑھایا تو نے
طور پر حضرت موسےٰ کو جو آیا تھا نظر ۔۔۔ مجکو ہر رنگ میں وہ جلوہ دکھایا تو نے
پردۂ برق میں رہ رہ کے چمکنے والے ۔۔۔ ابر باراں کی طرح مجکو رلایا تو نے
مسلم و ہندو و ترسا میں ہے تیرا ہی ظہور ۔۔۔ کعبہ و دیر و کلیسا کو بسایا تو نے
پست ہمت کو شکایت ہے عبث گھٹنے کی ۔۔۔ جو کوئی آگے بڑھا اس کو بڑھایا تو نے
فتنۂ دہر سے دو دل بھی نہ ملنے پائے ۔۔۔ ہائے ان آنکھوں کو کیا کیا نہ دکھایا تو نے

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر مے بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر مے بینم

بڑھتی دولت کی دُعا

(۷ مارچ ۱۹۱۱ء بوقت شام بیرون دہلی دروازہ کے باغ میں)

مرثیہ قوم کا شاعر جو سنا دیتے ہیں ۔۔۔ دل پُر درد کو اک ٹھیس لگا دیتے ہیں
دنیا وہ دنیا ہے جس میں نہ غرض ہو کوئی ۔۔۔ اہل ہمت جو ہیں وہ بہر خدا دیتے ہیں
زندگی لہو و لعب میں نہ گذارو ہرگز ۔۔۔ سانس قاصد ہیں جو پیغام قضا دیتے ہیں
بیٹھتے اٹھتے رکھا قوم کے غم میں بیتاب ۔۔۔ اضطراب دل مضطر کو دعا دیتے ہیں
پوچھتے کیا ہو دبیران قضا کی بخشش ۔۔۔ مانگنے والے کو حاجت سے سوا دیتے ہیں
دل کو اب صاف کئے دیتے ہیں آلائش سے ۔۔۔ آج ہم پھولوں سے کانٹوں کو ہٹا دیتے ہیں
جو جری رکھتے ہیں میدان غم دیں میں قدم ۔۔۔ مال کیا چیز ہے وہ جاں بھی لڑا دیتے ہیں
ایک وہ ہیں کہ جو اجداد کو دیتے ہیں فروغ ۔۔۔ ایک ہم نام سلف کو جو مٹا دیتے ہیں

ایک وہ کرتے ہیں تاریکی میں پیدا تنویر — ایک ہم نور کو ظلمت میں چھپا دیتے ہیں
قوم پر بھی تو نظر ہو کبھی دولت والو! — بڑھتی دولت کی تمہیں آج دعا دیتے ہیں
دے چکا ہیں انہیں پیغام وفا کا اے فوقؔ — دیکھنا ہے کہ اب وہ مجھے کیا دیتے ہیں

دن عید کا اور توسیہ پوش

(۲ مارچ ۱۹۱۱ء ۸ بجے شام لوہاری دروازہ سے اپنے مکان اندرون دہلی دروازہ تک آتے ہوئے)

غیروں کو سمجھ رہا ہے تو دوست — او دشمن عقل و دانش و ہوش
نظارۂ ہیبتِ قیامت — کر یاد کبھی تو خود فراموش
اے خوگر رنج و غم سبب کیا؟ — دن عید کا اور تو سیہ پوش
انساں ہوں خمیر میں ہے نسیاں — رسوا تو نہ کر اب اے خطا پوش
آیا بھی گیا بھی دم زدن میں — جھونکا تھا کہ تھا شباب کا جوش
اے شرم گنہ نہ کر کنارہ — اے رحمت خاص کھول آغوش
تو جلوہ دکھا کے آزما لے — موسیٰ کی طرح نہ کھوؤں گا ہوش

لب شکوے سے آشنا نہ ہوں فوقؔ
اے خوگر صبر و ضبط خاموش

صدائے فوق

ینگ مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ۱۹۱۱ء میں ایک انجمن سیالکوٹ میں قائم تھی۔ شبان المسلمین بھی اسی انجمن کا نام تھا مجھے کارکنان انجمن نے اپنے پہلے سالانہ جلسہ کے لئے مدعو کیا میں طویل نظم لکھنے کا عادی نہیں ہوں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ یہ نظم میرے خیال اور اندازہ سے بہت طویل ہو گئی۔ اور باوجود طوالت کے حاضرین نے جن کی تعداد

چار پانچ ہزار سے کم نہ تھی بہت پسند کی۔ اس نظم کے بند سلسلہ وار نہیں لکھے گئے بلکہ دوسرا بند ۲۳ فروری کو پہلا بند ۲۳ مارچ کو چوتھا ۱۷۔ اپریل اور تیسرا ۲۶۔ اپریل کو دوپہر کے بعد لکھا گیا۔ اس جلسہ میں مولانا سلیمان ندوی بھی تشریف لائے تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کی قابلیت علمی شہرت کے پر پرزے نکال کر عالم آشنا ہونے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی

بزم مسلم ایسوسی ایشن تجھے صد آفریں ۔۔۔ تجھ پہ نازل ہوں مدام الطاف رب العالمیں
ناتوانوں کو وہ دی تاب و تواں تو نے کہ اب ۔۔۔ مائل پرواز ہے سوئے فلک قلب حزیں
تو نے ملکر کام کرنے کا بتایا گر ہمیں ۔۔۔ از سر نو تو نے پھر رکھی بنائے قصر دیں
کاش ایسا اتحاد آتا نظر ہر سو ہمیں ۔۔۔ فرقہ بندی کا نہ دنیا میں نشاں ہوتا کہیں
لکھنؤ تک ہی نہیں سنی و شیعہ کا فساد ۔۔۔ خونچکاں دیکھی گئی بلخ و بخارا کی زمیں
مٹنے والوں فسادوں کے ہیں خود محو فساد ۔۔۔ اب بجائے حسن ظن ہے مومنوں میں بغض و کیں
اختلاف اخلاق سے دست و گریباں ہو گیا
ملت بیضا کا شیرازہ پریشان ہو گیا

جو عصائے پیر ہو وہ نوجوانی چاہیئے ۔۔۔ جو مفید خلق ہو وہ زندگانی چاہیئے
آرزو ہے گر ثمر چننے کی تو اے باغباں ۔۔۔ نونہالان چمن پر گل فشانی چاہیئے
چل بسا علم و ہنر اور مٹ گیا نام سلف ۔۔۔ اور ملے دست تاسف کیا نشانی چاہیئے
وہ بھی کیا قصہ کہ جس کو سن کے نیند آنے لگے ۔۔۔ جس سے غفلت دور ہو ایسی کہانی چاہیئے
منزل مقصود تک دم میں پہنچ جائیں گے وہ ۔۔۔ نوجوانوں کی ذرا ہمت بڑھانی چاہیئے
قوم ہو عسرت میں اور عشرت میں ہوں افراد قوم ۔۔۔ ایسے جینے پر ہمیشہ نوحہ خوانی چاہیئے
قوم کی حالت سے جو دائم رہی ہو بےخبر ۔۔۔ زندگی وہ نذر مرگ ناگہانی چاہیئے
یاد ایام کہ روشن اختر اسلام تھا
اس طرح دشمن نہ اپنا چرخ نیلی فام تھا

چشم مست دہر کا اے دل تو مستانہ نہ ہو — دشمن جاں یہ پری ہے اس کا دیوانہ نہ ہو
کوشش آتش گریہ پہ بھی آنکھیں ہیں خالی اشک سے — آہ اپنی عمر کا لبریز پیمانہ نہ ہو
دل ہے گھر اللہ کا اس میں نہ بت آباد ہوں — دیکھ اے غافل کہیں کعبہ صنم خانہ نہ ہو
خون پانی سے ہوا کرتا ہے گاڑھا بالیقیں — اے دل وارفتہ اپنوں سے تو بیگانہ نہ ہو
مٹ چکی تھی ثروت دنیا۔ گیا اب دین بھی — دونوں عالم میں تباہی کا یہ بیعانہ نہ ہو
راکھ کر ڈالیگا شعلہ تجھکو حب جاہ کا — شمع حرص و آز کا اے دل تو پروانہ نہ ہو
جان ہے لب پر تقاضا یہ مگر غیرت کا ہے — حلقۂ زلف مرض منت کش شانہ نہ ہو
غیر کی عشرت سرا تک بھی پہنچ لے برق آہ — پھونک دینے کے لئے میرا ہی کاشانہ نہ ہو
چھپ گیا جاکر جہاں روشن ستارہ علم کا — ظلمت جہل وطن کا وہ سیہ خانہ نہ ہو
خندۂ گل کو نثار گریۂ شبنم نہ کر — قصۂ عیش و طرب ہاں غم کا افسانہ نہ ہو
ہے شعاعوں سے ظہور جلوۂ شمس و قمر — شرط خرمن ہے کہ دانے سے جدا دانہ نہ ہو

اتفاق و اتحاد آپس میں ہونا چاہیئے
آفتاب آیا ہے سر پر اب نہ سونا چاہیئے

حال زار قوم بڑھکر ہے لب اظہار سے — درد دل ظاہر ہے اپنے دیدۂ خوں بار سے
علم و فن حاصل کرو۔ حاصل کرو۔ حاصل کرو — چین سے انگلینڈ سے جاپان سے تاتار سے
ہاں دکھا دے جلوۂ رخ اے امید اوج قوم — بے رخی آخر کہاں تک طالب دیدار سے
بے زر و مفلس کیا اسراف بے جا نے ہمیں — زور چل سکتا نہیں اب کچھ کسی زردار سے
ہاں اگر کچھ قوم میں ہو جائے اصلاح رسوم — عیش کے نغمے سنائی دیں در و دیوار سے
وہ بھی شادی کوئی شادی ہے کہ جس کی وجہ سے — بن کے سارے کارکن بیٹھے ہوں ماتم دار سے
کر دیئے اپنے مکانوں کے قبالے تک سپرد — قرض جب شادی کی خاطر لائے ساہوکار سے
ماتمی ہموں کا شادی سے بھی بدتر حال ہے — پوچھ لو بیشک تم اس کو یار سے اغیار سے

خواہش شادی ہے یا غم کی طلبگاری ہے یہ
بک گیا گھر بار سب۔ اچھی عزا داری ہے یہ

غیر اپنا حال ہے اپنوں کو رسوا دیکھکر — خود تماشا ہو گئے ہم یہ تماشہ دیکھکر
اس تماشہ گاہ عالم میں جو ہیں دلچسپیاں — دیکھ لے اے دل مگر بچنے کا رستا دیکھکر
اڑ گیا خاکہ مٹے نقش و نگار آرزو — اپنے ملک و قوم کی حالت کا نقشا دیکھکر
خانہ جنگی سے ہمیں فرصت نہیں ملتی کبھی — جی الجھ جاتا ہے آپس کا یہ جھگڑا دیکھکر
دل کی ویرانی کے غم سے ہے جگر اپنا کباب — میں ہوا برباد ہمسایوں کو اجڑا دیکھکر
چاہیئے کھوٹے کھرے کی کچھ پرکھ ہم کو ضرور — لیتے ہیں بازار میں سب مال اچھا دیکھکر
خرچ کا پلہ نہ جھکنے پائے آمد سے کبھی — کام جو کرنا ہے کر اے مرد دانا دیکھکر
ہو گئی امید کچھ بہبود ملک و قوم کی — ہم کو اے تعلیم نسواں تیرا چرچا دیکھکر
منحصر ہر ملک کا اقبال ہے تعلیم پر — گھر میں رکھتا ہے قدم مہماں اجالا دیکھکر
آج ہے تعلیم یورپ باعث اعزاز ملک — تو بھی چل اے راہرو نقش کف پا دیکھکر

علم وہ دولت ہے جو بڑھکر کبھی گھٹتی نہیں
علم وہ طاقت ہے جو میدان سے ہٹتی نہیں

میں کون ہوں؟

۹ مئی ۱۹۱۰ء کو دوشنبہ (سوموار) کے دن چھ بجے شام کے قریب میں حجامت بنوا رہا تھا۔ کہ مندرجہ ذیل شعر بے اختیار زبان پر آگیا؎

میں غلام صاحب لولاک ہوں — فوق شان اعظم الشانی ہوں میں

ابھی حجامت ختم نہ ہوئی تھی۔ کہ ایک اور شعر ہو گیا؎

نقشہ تصویر اول میٹ دے — انتظار جلوہ ثانی ہوں میں

حجامت سے فارغ ہونے کے بعد اس غزل کو مکمل کرنے کا خیال آیا۔ رات کو کچھ بارش بھی ہوگئی تھی۔ غزل کی محویت میں رات کا ایک بجگیا۔ اس دوران میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری بلند پروازیاں مجھے کسی ایسے مقام پر لئے پھرتی ہیں۔ جہاں دنیا اور دنیا والوں کا گذر نہیں ہے۔ آسمان اور زمین اور مکان اور مکین سب ایچ نظر آتے تھے۔ بس وہ سماں تھا ع ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے۔ تین چار گھنٹے کو ٹھے پر ٹہلتا رہا۔ یہ شعر ؎ نقشۂ تصویر اول میٹ دے۔ انتظار جلوۂ ثانی ہوں میں۔ بار بار زبان پر آتا تھا۔ اور اس کی حقیقت اور وجہ اس وقت معلوم ہوئی جب میری اہلیہ صرف دو تین دن کی بیماری کے بعد اسی مہینے انتقال کر گئی۔

وجاہت مرحوم اور ڈاکٹر اقبال نے (اُس زمانہ میں وہ سر اقبال نہیں تھے) اس غزل کو سنا اور پسند فرمایا۔ وجاہت صاحب نے انجمن سخن لاہور کے مشاعرہ میں اسی زمین میں طرح بھی دیدی۔ چنانچہ جون ۱۹۱۰ء کے آخری ہفتہ میں اسی ردیف قافیہ میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ وجاہت صاحب اور ڈاکٹر عبدالحکیم بسمل ہوشیارپوری اور بعض اور اصحاب نے طرح پر غزلیں پڑھیں۔ وجاہت صاحب نے جو جلسہ کے صدر بھی تھے۔ اپنی غزل پڑھنے سے پیشتر فرمایا "اس زمین میں تصوف کا رنگ زیادہ موزون معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فوق صاحب کی غزل سننے کے بعد اس رنگ میں لکھنے کی جرات نہ ہوسکی۔ ان کی غزل تصوف کا نچوڑ ہے۔ اس لئے دوسرا رنگ اختیار کیا گیا" یہ غزل اصلاح سخن، طریقت لاہور اور رسالہ کمال دہلی اور بعض اور رسالوں میں تمہیدی و تعریفی سطور کے ساتھ اسی زمانہ میں چھپ چکی ہے۔

مصدرِ فکر و پریشانی ہوں میں   مرجعِ تشویش و حیرانی ہوں میں
نقشۂ تصویر اول میٹ دے   انتظار جلوۂ ثانی ہوں میں
کیا ہوں میں ؟ برقِ تجلی کی چمک   کون ہوں ؟ موسیٰ عمرانی ہوں میں

دل مرا ہے رازدانِ رمزِ حق | محرمِ اسرارِ ربانی ہوں میں
کفرِ گیسوئے بتاں سے خوف کیا؟ | پیروِ دینِ مسلمانی ہوں میں
سجدہ کرتے ہیں مرے در پر ملک | گو بظاہر شکلِ انسانی ہوں میں
میں نے جو مانگا وہی مجھکو ملا | مظہرِ تائیدِ یزدانی ہوں میں
فیضِ قدس، عالمِ بالا نہ پوچھ | دہر کی تصویر کا بانی ہوں میں
گاہ میں ہوں مخزنِ انوارِ عقل | گاہ وقفِ جہل و نادانی ہوں میں
گاہ میرا نام عیشِ جاوداں | گاہ درد و رنجِ روحانی ہوں میں
روح بن کر ہیں کہیں محوِ بقا | جسم کی صورت کہیں فانی ہوں میں
گہ مکاں میرا فضائے لامکاں | گاہ زیبِ بزمِ امکانی ہوں میں
گاہ ہیں معمورۂ کشتِ چمن | گہ بیابانوں کی ویرانی ہوں میں
ذرۂ خاکِ لبِ ساحل کہیں | گہ موجِ بحرِ عمانی ہوں میں
گاہ ہوں انبار کا سرمایہ دار | گاہ مستِ حظِ نفسانی ہوں میں
گاہ میری آفرینش کا عدم | گہ خضر کی عمرِ طولانی ہوں میں
گاہ میرا نام رحمان و رحیم | گاہ جبر و قہر کا بانی ہوں میں
تختۂ گورِ غریباں ہوں کبھی | گاہ تخت و تاجِ سلطانی ہوں میں
ہے مری صورت گدایانہ مگر | واقفِ رمزِ جہانبانی ہوں میں
وہ مقدر ہوں کہ ٹل سکتا نہیں | جو ہو پیش آئی وہ پیشانی ہوں میں
سنگریزوں کی طرح سمجھا ہے تو | قدر کر لعلِ بدخشانی ہوں میں

میں غلامِ صاحبِ لولاک ہوں
فوق شانِ اعظم الشانی ہوں میں

تھی ایٹر کا تماشا

۱۵ امئی ۱۹۱۰ء کو اتوار کے دن منڈوہ رائے میلارام میں "زہری سانپ" کا کھیل تھا چند دوستوں کے ساتھ میں بھی "زہری سانپ" دیکھنے کے لئے گیا۔ چند منظر نہایت موثر تھے۔ واپس آیا۔ تورات کو مندرجہ ذیل شعر تیار ہو گئے۔

عالم ہستی کا تھی ایٹر ہوں میں
شادی وغم کا عجب منظر ہوں میں
دیکھ کر اسٹیج پر حیرت ہے کیوں؟
اس تماشہ گاہ کا ایکٹر ہوں میں
رقص بسمل کا تماشہ ہوں کہیں
دست قاتل میں کہیں خنجر ہوں میں
سور بنیت کا کہیں آئینہ دار
کان عصمت کا کہیں جوہر ہوں میں
سرگروہ گمرہاں ہوں میں کہیں
خضر کی صورت کہیں رہبر ہوں میں
وامق و عذرا کا ہم صورت کہیں
قیس ولیلیٰ کا کہیں مظہر ہوں میں
بزم موسیقی میں ہوں ذوق سرور
بزم رنداں میں مئے احمر ہوں میں
غور سے دیکھو تو ہوں عبرت نما
گو بظاہر "کھیل" سرتا سر ہوں میں

گھر کی ویرانی

۲۸ مئی ۱۹۱۰ء کو ہفتہ کے دن صرف تین دن کی بیماری (ہیضہ) کے بعد جب میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ تو ۱۹ مئی ۱۹۱۰ء کے اس شعر سے

نقشہ تصویر اول مٹ دے
انتظار جلوہ ثانی ہوں میں

کی تفسیر خود بخود میری سمجھ میں آگئی۔

میر تقی میر نے گھر کی ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی اصلی کیفیت اور اس کے حقیقی معنے رفیق دیرینہ کی فرقت دائمی کے بعد ہی سمجھ میں آتے۔

یکم جون کی صبح کو گھر کے در و دیوار پر نظر ڈالی تو پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔ اسی حالت میں مندرجہ ذیل شعر زبان پر آگئے۔

خانۂ دل میں مرے چھا گئی کیسی ظلمت — بجھ گیا آہ چراغ شب رنج و راحت
آج آزاد ہے اٹھارہ برس کا ساتھی — قید میں چھوڑ گیا مجھکو قفس کا ساتھی
ہمصفیر اڑ گیا گلزار کو ویراں کر کے — موت نے چھوڑا مرے گھر کو بیاباں کر کے
دل کی امید اب ائے زخم جگر ٹوٹ گئی — وہ کڑا صدمہ ہے یہ جس سے کمر ٹوٹ گئی

اس کے بعد "اصلاح سخن" میں ایک طرح ہوئی جس کا قافیہ ردیف "بیہوش ہے خاموش ہے" تھا۔ اس پر صرف دو شعر لکھے گئے اور وہی دونوں درج رسالہ ہوئے ؎

تازگی تھی روح کو جن سے کہاں باتیں وہ اب — یعنی تقریر جان بخش اب خاموش ہے

فوق اب وہ دن کہاں وہ سن کہاں کہتے تھے جب
آج کل طبع رواں میں کس بلا کا جوش ہے

۲۲ جولائی ۱۹۱۷ء کو شام کے وقت یہ دردناک خبر سُنی کہ ایک عورت بچہ جننے کے بعد انتقال کر گئی ہے۔ بچہ زندہ ہے اور ماں چارپائی پر مردہ پڑی ہے۔ اسی وقت مرزا انیس مرحوم کا یہ مصرع زبان پر آیا ع کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس مصرع پر چند شعروں کی مندرجہ ذیل غزل ہوگئی۔ ؎

"غرض" کے بندے کو جب اپنا کام ہوتا ہے — ہزار دشمنی پر بھی سلام ہوتا ہے
مرے سرہانے یہ کیوں اژدحام ہوتا ہے — ادب ادب کہ خدا سے کلام ہوتا ہے
بلا لو نزع میں اپنے پرائے ہر اک کو — کہ آج آخری سب سے سلام ہوتا ہے

ہے قبر وہ رہِ عقبیٰ کا اک مقام جہاں — مسافرانِ عدم کا قیام ہوتا ہے
نہیں ہے تاب و توان و شباب کی رخصت — اجل کے آنے کا یہ اہتمام ہوتا ہے
نہ زندگی میں کبھی جس کا اختتام ہوا — سنو کہ آج وہ قصہ تمام ہوتا ہے
یہ بعد مرنے کے معلوم ہوگا اے غافل! — کہ بادشاہ اک ادنیٰ غلام ہوتا ہے
بھلائی کر جو ہے مقصود نام کی خواہش — کہ نیک کام ہی سے نیک نام ہوتا ہے
کہیں بنا ہے ملا اوج پست ہمت کو — کہیں رذیل بھی عالی مقام ہوتا ہے
غضب غضب کہ جو دنیا کے بھی نہیں قابل — ستم ستم کہ وہ دیں کا امام ہوتا ہے

سلام کرتے ہیں سب کو وہ بیگنہ اے فوق
نہ کیجے غصہ اگر غصہ حرام ہوتا ہے

(۱۷ دسمبر ۱۹۱۰ء بوقت صبح پانچ بجے مطابق ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ)

یہ سب مطلب کے داؤ ہیں غرضمندی کی گھاتیں ہیں
یہ باتیں قومی ہمدردی کی سب کہنے کی باتیں ہیں
کبھی تو راہ پر آجائے گا تقدیر کا چکر
ابھی دن ہیں مصیبت کے ابھی گردش کی راتیں ہیں
تقرب کی ہے گر خواہش تو کچھ اعمال صالح کر
وہاں مذہب کے جھگڑے ہیں نہ قومیں ہیں نہ ذاتیں ہیں

کشمیری کشمیر سے باہر

(یکم جنوری ۱۹۱۱ء تین بجے بعد دوپہر سے چار بجے شام تک)

یاد آیا مجھے کہ ہم ۔ تھے خطۂ کشمیر میں   عیش کرتے تھے کبھی ملک ارم تاثیر میں
شامت اعمال سے اغیار حاکم ہو گئے   آئے وہ اور طالع بیدار اپنے سو گئے
کسر کوئی گو انہوں نے ظلم میں رکھی نہ تھی   کیں جفائیں اپنی بدبختی نے لیکن اور بھی
مشورے کرنے لگے باہم زمین و آسماں   یعنی قحط آیا ۔ وبا نے سر اٹھایا ناگہاں

بدلی پھیلی ہوئی یکسر تھی شیخ و شاب میں   ہم "مہاجر" آ گئے کشمیر سے پنجاب میں
آہ کیسا تفرقہ تھا ۔ اے سپہر بدگہر   جتنے موتی تھے لڑی میں ہو گئے سب منتشر
گو ذکاوت اور فہانت کا خزانہ پاس تھا   لاکھ عیبوں کا مگر اک عیب یا افلاس تھا
ایسی بدحالی میں گو اپنا پرایا ہو گیا   صبر و اطمینان کا بالکل صفایا ہو گیا
گو کیا اغیار نے ہم سے سلوک ناروا   ہم مگر ہر حال میں کرتے رہے شکر خدا
عار اس روزی کو ہم سمجھے جو بے دقت ملی   ہاں خوشی سے بے تکلف کی جہاں محنت ملی

باوجود اس حال کے دل پر نہ آیا کچھ ملال   بے پر و بالی میں حاصل کر لیا اوج کمال
جوش قومی ہے جو شیخ و شاب میں وہ ہم سے ہے   آج جو رونق ہے کچھ پنجاب میں وہ ہم سے ہے
دیکھ لو بزم قومی کو اگر باور نہ ہو   انجمن وہ کیا جہاں کشمیر کا عنصر نہ ہو
اہل علم و فضل بھی ہم میں ہیں سوداگر بھی ہیں   زور میں ہم رستم ثانی بھی اہل زر بھی ہیں
آنریبل بھی ہیں نواب بھی ہم میں بہت   ہیں گرانمایہ جواہر ابن آدم میں بہت
ہم شفاء الملک بھی ہیں سربلند قوم بھی   وقف خلق اللہ ۔ پابند صلوٰۃ و صوم بھی

دلیٔ مرحوم کے گلشن میں رشکِ گل بنے — اور پہنچے لکھنؤ میں تو "وزیرِ گل" بنے
آستینِ علم میں جبتک عمل کا ہاتھ ہے — عہدِ انگلش میں بھی ہر ممکن ترقی ساتھ ہے

ایک قومی غزل

۳۱ جنوری ۱۹۱۱ئ بوقتِ شام بمقام لاہور لکھی گئی۔ اور انجمن شبان المسلمین سیالکوٹ کے جلسہ میں پڑھی گئی

ہے چھپے پردوں میں پوشیدہ پریشانیٔ قوم — دل حیران ہے آئینۂ حیرانیٔ قوم
چشمِ عبرت سے نظر عیشِ گذشتہ پہ جو کی — دیکھ لی تختِ ہوائی پہ سلیمانیٔ قوم
تیرگیٔ چشمِ تمنا کو نظر آئے نہ کیوں؟ — بجھ گئی بجھ گئی افسوس درخشانیٔ قوم
رہ گیا نام زبانوں پہ فقط کہنے کو — چھپ گئی جا کے کتابوں میں مسلمانیٔ قوم
لاج ہے پردۂ ناموس کی ستار کے ہاتھ — ننگِ اسلام ہوئی جاتی ہے عریانیٔ قوم
کوئی سامان نظر میں نہیں بہبودی کا — بڑھ گئی حد سے سوا بے سر و سامانیٔ قوم
چاک ہو جاتا ہے سینہ بھی گریباں کی طرح — دیکھتا ہوں جو کبھی چاک گریبانیٔ قوم
کچھ نہیں اپنے بھلے اور برے کی پروا — کس قدر قابلِ افسوس ہے نادانیٔ قوم
اب فقیروں سے بھی بدتر ہوئی اس کی حالت — کبھی مشہور تھی دنیا میں جہانبانیٔ قوم
ایسے بگڑے ہوئے مشکل سے بنا کرتے ہیں — سخت مشکل میں ہے افسوس اب آسانیٔ قوم

خوابِ غفلت میں ہیں مدہوش جگانیوالے
خود تلاطم میں ہیں طوفاں سے بچانیوالے

مسلم یونیورسٹی

۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی تحریک کا بڑا چرچا تھا۔ سر آغا خان، علامہ شبلی نواب وقار الملک اور دیگر مسلمان لیڈر چندہ کے لئے صوبہ وار دورہ کر رہے تھے۔ ۱۷۔ فروری ۱۹۱۱ء کو بزم اردو لاہور نے بھی مسلم یونیورسٹی کی تحریک و تائید میں بصدارت ڈاکٹر (حال سر) محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا عظیم پیمانہ پر ایک جلسہ منعقد کیا۔ محمڈن ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کئی شعراء نے یونیورسٹی کے موضوع پر نظمیں پڑھیں میں نے بھی جلسہ کے دن ہی ایک نظم لکھی۔ اور شام کو پڑھی اس نظم کے اکثر اشعار بار بار سنے گئے۔

عبرت انجام ہو جس کا وہ زوال اچھا ہے
عیش ہو جس کا نتیجہ وہ ملال اچھا ہے

تم بھی اس سال میں کچھ کر لو نمایاں خدمت
"اک نجومی نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"

قوم کی یونیورسٹی کا کوئی مال نہیں
ہم یہ کس طرح کہیں قوم کا حال اچھا ہے

گو گنہ گار ہوں لیکن ہوں فدائے اسلام
گو برا ہوں میں مگر میرا خیال اچھا ہے

کیوں نہ ہو دست کرم حسن طلب کے صدقے
جس سے محبوب ہو سائل وہ سوال اچھا ہے

ہم مسلمان ہیں بے حال اب اے محرم حال
حال ہو جائے اگر اپنا بحال اچھا ہے

دل صفا کیش اگر ہے تو کدورت سے بچا
کون کہتا ہے کہ آئینہ میں بال اچھا ہے

دل ہے پہلو میں تو وہ درد سے خالی نہ رہے
پھولتا پھلتا جو رہتا ہے نہال اچھا ہے

سچ ہے کرنے ہی سے کچھ کام ہوا کرتا ہے
دہر میں کام ہی سے نام ہوا کرتا ہے

حور اچھی نہ کوئی حور جمال اچھا ہے
اب بجز یونیورسٹی کا خیال اچھا ہے

کیوں نہ محبوب ہو یہ یوسف مصر دانش
چیز بے مثل ہے۔ شے خوب ہے۔ مال اچھا ہے"

چندہ ہی روز میں لاکھوں کا ہوا ہے چندہ — ہے یہ آغاز کا ایما کہ مآل اچھا ہے
مانگنے کے لئے اب قوم کا سردار آیا — سائل اچھا ہے تو بے شبہ سوال اچھا ہے
جس سے کچھ قوم کی بہبود نہ ہو مد نظر — ایسی دولت ہو اگر وقف زوال اچھا ہے
ہم بھی اب ہونے کو ہیں شاہ دیار تسلیم — ہم بھی کہنے کو ہیں اب قوم کا حال اچھا ہے
جمع ہیں مال میں سب جوش ہے سب کے دل میں — اب ہے جس حال میں کل قوم وہ حال اچھا ہے
للہ الحمد مسلمانوں میں احساس ہے اب — شکر صد شکر کہ بیمار کا حال اچھا ہے

قوم مردہ کے مسیحا بنے سر آغا خان
لائے اب نسخۂ اعجاز اثر آغا خان

چہرۂ قوم سے ہے جوش مسرت ظاہر — روئے بیمار سے ہے جلوۂ صحت ظاہر
اب مسلمانوں میں پھر چھائی ہے بھائی پہ فدا — ہو گیا از سر نو راز اخوت ظاہر
آج پھر قوم میں کچھ جان سی آتی ہے نظر — کیوں نہ ہو شوخیٔ انداز طبیعت ظاہر
قوم کی شکل میں دیکھا ہے خدا کا جلوہ — اے مجاز آج ہوئی تیری حقیقت ظاہر
گرد کی طرح بہت بیٹھے ہیں دامن سے امیر — ہو گئی قومی گداؤں کی کرامت ظاہر
عقدے سب قوم کے کھل جائیں کہ غیرت ہو — راز واماندگیِ ناخن ہمت ظاہر

شامل حال ترا فضل اگر ہو جائے
یاس کی شام ترقی کی سحر ہو جائے

(۲۰ مارچ ۱۹۱۱ء کی رات کو خواب میں)

اقربا نے قبر میں شاہ علی کو رکھ دیا
گور میں راز خفی ستر جلی کو رکھ دیا

قومی ترکیب بند

۲۷ مارچ ۱۹۱۱ء کی رات کو تین چار بجے کے درمیان آنکھ کھلی تو یہ شعر وردِ زبان تھا۔

واقف تو ہو رموزِ دعا و ثنا سے تو
ممکن نہیں کہ ہو کبھی بابِ قبول بند

بار بار خیال آتا تھا کہ عالمِ خواب میں اس کے ساتھ ایک اور شعر بھی کہا گیا ہے لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی وہ یاد نہ آیا۔

صبح ہوئی تو اس پر پہلا بند لکھا گیا۔ ۳۰ مارچ کی صبح کو ہوا خوری کے وقت دوسرا بند۔ اور ۲ اپریل ۱۹۱۱ء کی صبح کو تیسرا بند اور چوتھا بند ۳ مئی کو لکھا گیا۔

قرآں پڑھو نہیں رہا بابِ قبول بند
ہوگی نہ حشر تک یہ کتابِ قبول بند

رندوں کو اعتراف ہے اپنے گناہ کا
ان پر ہو کس لئے مئے نابِ قبول بند

واقف تو ہو رموزِ دعا و ثنا سے تو
ممکن نہیں کہ ہو کبھی بابِ قبول بند

ناصح اڑائیں جام مئے انفعال کے
جب تک نہ ہو دکانِ شرابِ قبول بند

بندوں کی التجاؤں کو سنتا ہے وہ سمیع
ہوتا نہیں سوال و جوابِ قبول بند

اے چاہ برقرار رہیں چشمہائے یم
کشتِ مراد پر نہ ہو آبِ قبول بند

اک موجِ مشک گئی ہے جوانانِ قوم میں
آنے کو ہے بہار گلستانِ قوم میں

اے دردِ قوم تو ہے مگر دل کے واسطے
لیلیٰ ہو جیسے پردۂ محمل کے واسطے

اے مرد تو عزم مصمم کا قرب ڈھونڈ کر
بے چین ہو نہ دوریِ منزل کے واسطے

سوز و گداز تجھ میں بھی ایسا ہو بہرِ قوم
جس طرح شمع جلتی ہے محفل کے واسطے

اے ناخدا پہنچ کہ مری کشتیِ امید
بیتاب و بیقرار ہے ساحل کے واسطے

"مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے"
"زندہ ہے وہ جو مر چکا ہے قوم کیلئے"

کہتا ہوا یہ کفر سے اسلام آ گیا — اے جہل دور ہو کہ اب اعلام آ گیا
یہ علم ہے کلیدِ درِ مخزنِ حکیم — دربارِ حق سے آخری پیغام آ گیا
غفلت کے کیف خواب کی ہاں کوئی حد بھی ہے — اے قوم آفتاب لبِ بام آ گیا
پستی ہماری دفترِ عبرت کا ہے ورق — ناکامیاب رہنا بھی کچھ کام آ گیا
مشکل کی بھی بساط ہے کوئی کہ فکر ہو — آساں ہوئی جو لب پہ ترا نام آ گیا
احساس قومیت بھی ترقی کا ہے نشاں — آغاز دیکھ کر نظر انجام آ گیا

روشن ہے ایک نور دلِ داغدار میں
پنہاں ہے آفتاب ہمارے غبار میں

جو بات لوحِ دل پہ ہے تقریر میں بھی ہو — تقدیر میں جو ہے مری تدبیر میں بھی ہو
پنجاب جس کے نور سے فوراً چمک اٹھا — یارب وہ روشنی کبھی کشمیر میں بھی ہو
یہ اور بات ہے کہ دکھائے اثر خدا — اک گونج سی تو نالۂ شبگیر میں بھی ہو
ناظر کو گو غشی کا بہانہ ہی چاہیے — کچھ تو کشش مگر تری تصویر میں بھی ہو
خود صید تیرے دام میں آئیں گے سربکف — صیاد کچھ اڑان ترے تیر میں بھی ہو
زر کیا ہے سر بھی دینگے مریدانِ باصفا — علم و عمل کا وصف کسی پیر میں بھی ہو

مولانا ظہیرؔ دہلوی

اپریل ۱۹۱۱ء میں سید ظہیر الدین حسین ظہیرؔ دہلوی یادگار ذوقؔ نے بعمر پچاسی سال حیدر آباد دکن میں وفات پائی۔ پرانی تہذیب، پرانی شاعری اور قدیم وضعداری کی یہ آخری جھلک تھی۔ جو نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاگردان داغؔ مقیم لاہور نے بتحریک وجاہت مرحوم برکت علی محمڈن ہال میں ۲۲ اپریل کو ایک ماتمی جلسہ منعقد کیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر (حال سر) محمد اقبال صاحب تھے۔ ۲۲ اپریل کو علی الصبح سیر کرتا ہوا اپنے دریا نالہ سے پار موضع کھوکھر تک چلا گیا۔ اسی دوران میں مرثیہ ظہیر مکمل کر کے واپس آگیا۔ ۵ بجے شام جلسہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی۔ اور شاگردان داغ اور بعض اور اصحاب نے نظمیں پڑھیں میری نظم حسب ذیل ہے۔

یہاں تو جیتے ہیں اہل دست موت ہی کیلئے — وہ کون ہیں کہ جو مرتے ہیں زندگی کیلئے
بقائے نام ہو جس سے تلاش کر وہ شغل — کہ اس جہان کی خوشیاں ہیں دو گھڑی کیلئے
یہ جان تن میں نہیں ہے پہاڑ ہے غم کا — یہ ہے خیمۂ کلفت ہے آدمی کیلئے
خزاں کا جھونکا نشاں ہے نسیم کی خاطر — ضرور ہے کہ اندھیرا ہو چاندنی کیلئے

۱؎ منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی (۲) میر بشارت علی غالب دہلوی جو اس زمانہ میں روزانہ پیسہ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اور لکھنؤ میں ہمدم کی برسوں تک ایڈیٹری کرنے کے بعد اپنے ذاتی اخبار روزانہ ہمت کے ایڈیٹر رہے ہیں (۳) ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا پی ایچ ڈی (۴) پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی (۵) نیازمند محمد الدین فوق۔ داغ اور ظہیر ہم وطن ہونے کے علاوہ حضرت ذوق دہلوی کے شاگرد تھے اور ان دونوں کے استاد بھائی ہونے کی بنا پر شاگردان داغ نے یہ ماتمی جلسہ کیا تھا۔

جو آیا ہے اسے اک دن ضرور جانا ہے
قیام بزم جہاں میں نہیں کسی کے لئے
دکن میں وقف رہا تاج و تخت ملک سخن
ظہیر دہلوی اور داغ دہلوی کے لئے
ہزار حیف کہ اب وہ بھی چھن گئی ہم سے
بچی کھچی جو تھی عزت سخنوری کے لئے

جناب داغ تو برسوں سے خلد میں ہیں مکیں
ظہیر بھی اسی خاتم کے اب بنے ہیں نگیں

ظہیر کیا نہ رہے اک شاعری نہ رہی
چمن میں شعر و سخن کے شگفتگی نہ رہی
وہ حسن روئے تکلم میں دلبری نہ رہی
وہ چشمہ سلطنت سخن میں فسوں گری نہ رہی
یہ ایک عہد کہن کی تھی یادگار افسوس
رہی سہی نہ رہی وہ بُری بھلی نہ رہی
بنے ہیں زاغ و زغن آج عندلیب چمن
ہر شاخ شاخ کے مہکتی تھی جو کلی نہ رہی
مکان شعر ہے پھر آج تیرہ و تار یکہ
کہ شمع بزم سخن میں وہ روشنی نہ رہی
ہوئے ہیں داغ و امیر و جلال پھر رخصت
جو رنگتی تھی وہ رسم نشاں وہی نہ رہی
کبھی وہ دن تھے کہ باغ سخن میں تھے بہار
اور آج پھول کجا کوئی ایک پنکھڑی نہ رہی
بنی ہے مدفن اہل سخن زمین دکن
زبان والوں کو اب کوئی برتری نہ رہی

شرف ملا ہے دکن کو ولی سے تا بہ ظہیر
وہ ابتدا تھی تو اب شاعری کی ہے یہ اخیر

نعت سرور کائنات صلعم

میں ۲۵ اپریل ۱۹۱۱ء کو ایک کام کے لئے ادھا نہ گیا۔ الندوہ کا ایک رسالہ میرے پاس تھا جس میں بھوپال کے کسی عالم بزرگ کا ایک عربی قصیدہ آنحضرت صلعم کی شان میں مع ترجمہ (اردو نثر) درج تھا۔ اسی تاریخ کو میں واپس لاہور آگیا۔ جالندھر چھاؤنی کے سٹیشن پر اس قصیدہ اردو نظم کے قالب میں ڈھالنے کا خیال آیا چنانچہ سٹیشن لاہور

تک چلتی ٹرین ہی میں آٹھ ابتدائی بند لکھ لئے گئے۔ پھر کئی دنوں تک اس طرف توجہ نہ ہو سکی۔ بابو غلام حسن صاحب رئیس وزیرآباد آنکھوں کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی دوا لینے کے لئے اے۔ اچ۔ پلومر کمپنی کی دوکان پر ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کو گیا۔ وہاں کافی دیر لگ گئی۔ الندوہ کا ورق پاس ہی تھا۔ چار بند اور وہاں لکھے۔ پھر ۳ جون ۲۳ء تک اس طرف خیال نہ آیا۔ اس کے بعد ورق تلاش کیا۔ تو وہ بھی نہ مل سکا۔ چنانچہ نظم نامکمل ہی رہ گئی ہے

خواب نے مجھ ناتواں پر ایک شب غلبہ کیا ۔۔۔ خواب وہ جس سے خیال و خواب دنیا محو تھا
بند تھی گو آنکھ لیکن تھا مقدر جاگتا ۔۔۔ سامنے نظروں کے تھا اک منظر فرحت فزا
گلشن یثرب سے آئی اک ہوائے خوشگوار
خارزار دل کو یکسر کر گئی باغ و بہار

اک تصور نے مری قسمت وہاں بیدار کی ۔۔۔ وہ تصور تھا کہ تھی رخشندگی انوار کی
اصل کیا ہے اس کے آگے گوہر شہوار کی ۔۔۔ از سر نو اس نے کر دی رسم جاری پیار کی
وہ تصور ایک جلوہ آیۂ رحمت کا تھا
یار اسلام اور دشمن کفر کی ظلمت کا تھا

وہ تصور مجھ سے جب ملنے کو آمادہ ہوا ۔۔۔ بن گئی برسوں کی منزل ایک دم کا راستا
ہو گیا طے دم میں ناہموار کیا ہموار کیا ۔۔۔ ندی نالوں کو چٹانوں کو برابر کر دیا
اونٹ وال کوئی نہ تھا گھوڑا وہاں کوئی نہ تھا
طے سمندر بھی کئے گو بادباں کوئی نہ تھا

مرحبا صد مرحبا اے طالع بیدار فوق ۔۔۔ قابل جنت ہوئے جاتے ہیں اب کردار فوق
راحت جاں سے مبدل ہو گئے آزار فوق ۔۔۔ مغتنم کیونکر نہ سمجھا جائے اب دیدار فوق
مجھ سے عاصی کو مثال طور سینا کر دیا
اس تصور نے مرے دل کو مدینا کر دیا

ہجر گل میں جس طرح بلبل ہو محو انتظار   جس طرح بیتاب دل کو آ نہیں سکتا قرار
جس طرح ہو چشم خواب آلود کو حرص خمار   جس طرح اجڑے ہوئے گلشن کو ہو شوق بہار

اس طرح ہوں اے تصور میں بھی متوالا ترا
چاہ میں یہ مر مٹا ہے چاہنے والا ترا

اے تصور لے مرے دیں اے مرے ایمان آ   اے خیال ہاشمی مکی ترے قربان آ
بے تکلف آنکھ میں دل میں مرے مہمان آ   میں بھی بے ساماں ہوں تو بھی بے سر و سامان آ

بہر استقبال پہلو سے دل مضطر نکل
پائے بوسی کے لئے اے اشک چشم تر نکل

اے معزز میہماں اے زینت ایوان دل   راحت جان حزیں آرام و اطمینان دل
بڑھ گئی ہے دم قدم سے تیرے ایسی شان دل   رشک جنت بنا ہے اب مرا بستان دل

ایسے شاہد کے لئے ایسی اقامت گاہ ہو
بگڑی بن جائے نہ کیوں جب مہرباں اللہ ہو

جل اٹھا اے آتش نور تصور کے شرار   ہاتھ سے میرے دل اب جاتا رہا بے اختیار
کر دیئے اپنے جواہر خانہ کے موتی نثار   لٹ گیا مہماں کی خاطر گنج چشم اشکبار

وہ خیال پاک میری اشکباری دیکھ کر
یوں لگا کہنے کہ رونے کا سبب ظاہر تو کر

کثرت جرم و گناہ سے ہے اگر تو شرمسار   اپنی غفلت کے سبب سے ہے اگر زار و نزار
آیہ لا تقنطوا کا پڑھ وظیفہ بار بار   دور کر خوف مکافات عمل کا اضطرار

تو بڑا عاصی ہے تو وہ بھی بڑا غفار ہے
بحر رحمت جوش پر آئے تو بیڑا پار ہے

گبر ہو یا دہریہ اہل حرم یا اہل دیر   بندہ پرور کو نہیں ممکن کہ ہو بندوں سے بیر

آفرینش جن کی وجہِ عشق ہو کب ہوں وغیر — کرتے ہیں جی بھر کے اس کے گلشن قدرت کی سیر
ہاں مگر بندوں کو بندے بن کے رہنا چاہیے
ورنہ آقا ہو اور یوں تن کے رہنا چاہیے

عرض کی میں نے کہ ہاں اے صبح فرخندہ فال — کیا کہوں شرم گنہ سے کس قدر ہوں خستہ حال
جاں ہے صرف رنج و غم اور قلب ہے اندر ملال — ہو رہا ہوں کثرت عصیاں سے وقف انفعال
میں کٹا جاتا ہوں دل میں شکل دکھلاتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اس کے سامنے جاتے ہوئے

کوئے قرب حق کا کوئی رہنما ملتا نہیں — ڈھونڈھتا ہوں جس کو میں اس کا پتا ملتا نہیں
تشنہ لب ہوں چشمۂ آب بقا ملتا نہیں — سخت مشکل ہے کوئی مشکل کشا ملتا نہیں
کیا رسائی ہو مقدر ہی نہ ہو جب تک رسا
بے وسیلہ رہ گیا دربان کا منہ دیکھتا

(ناتمام)

۱۹۱۱ء کی سیاحت کشمیر کا کلام

۱۹ جولائی ۱۹۱۱ء کو میں کشمیر روانہ ہوا۔ ۲۱ جولائی کو دن کے گیارہ بجے جب مری کے دلفریب منظر دکھائی دیئے۔ تو دل و دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا ہونے لگی۔ ریگہ کا پڑاؤ ابھی کچھ فاصلہ پر تھا کہ مندرجہ ذیل شعر موزوں ہو گئے۔

ہے یہ قرباں گہ تسلیم پہ قرباں ہونا — "لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا"
تا کجا باعث آبادیٔ امکاں ہونا — اے دل ارباب ادب وہ شہر خموشاں ہونا
زندگی بخش کچھ ایسا ہے مری کا منظر — چاہتا ہے دل مردہ بھی غزل خواں ہونا
ہو کے انساں نہیں انس کسی سے تجھ کو — ہے نہ ہونے کے برابر ترا انساں ہونا
آج ہوش آیا تو ہم بھی بجا سمجھے — یاد ہے ہم سے کبھی دست و گریباں ہونا

کون ہوتا ہے نمک ریز کریدھر چاہتے ہیں　　داغ ہائے دل پُر داغ نمایاں ہونا

فوق ہرچند نہیں عامل روزہ و نماز
سیکھ لے اس سے مگر کوئی مسلماں ہونا

۲۴ جولائی کو ہمارا تانگہ رام پور کے سرد ترین پڑاؤ پر پہنچا۔ سبز دھانوں کے کھیت اور ان کھیتوں کے نشیب میں دریائے جہلم کی خوفناک لہریں اپنی ہیبت ناک بہار دکھا رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ پر سبزہ زار جنگل "بہ خط سبز مرا کرد اسیر" کا مضمون پیدا کر رہا تھا۔ ایک گھنٹہ وہاں قیام کیا۔ گیارہ بجے قبل دوپہر روانہ ہو گئے۔ مندرجہ ذیل چند اشعار اس قیام کی یادگار ہیں ؎

علم کی دوربین سے بھی تری　　کچھ حقیقت نظر نہیں آئی
یوں تو معمور ہے دکانِ عشق　　جنس الفت نظر نہیں آئی
دونوں عالم کی سیر کی ناصح!　　تیری جنت نظر نہیں آئی
یوں تو دیکھا تمام عالم کو　　تیری صورت نظر نہیں آئی
تو نے جو شے جہاں میں پیدا کی　　بے حقیقت نظر نہیں آئی

فوق کہنے کو آدمی ہے مگر
آدمیت نظر نہیں آئی

۲۴ جولائی ۱۹۱۱ء کو بارہ بجے دوپہر سے ۲ ½ بجے بعد دوپہر تک
رام پور سے نوشہرہ کے سفر کے درمیان

دیکھ کشمیر کی بہاروں کو　　گل و گلشن کو گلعذاروں کو
چشمے ہیں چشمہائے آبِ حیات　　پوچھ لے جا کے راہگذاروں کو
ایسی گل ریزیاں کہاں ہونگی　　غور سے دیکھ مرغزاروں کو
رشکِ صد حور سینکڑوں کو کہو　　غیرتِ گل کہو ہزاروں کو

پاک باطن کو ڈر نہیں کوئی
فوق دیکھا کرو نظاہروں کو

اسی تاریخ یعنی ۲۴-جولائی ۱۹۱۱ء کو پانچ بجے شام کے بارہ مولا پہنچ گیا۔ تھوڑی دور ٹھہر کر سیر و تفریح کے لئے وزارت و تحصیل کے عقب میں جو چشمہ ہے اس طرف سیر کو نکل گیا۔ وہاں مندرجہ ذیل نظم تیار ہوگئی۔

فوق سے کل ایک واعظ نے کہا
نام تیرا نازش اسلام ہے
تیری صورت سے ہے یہ ظاہر تجھے
نیوفیشن سے نہیں کچھ کام ہے
تجھکو سگرٹ تک سے کچھ رغبت نہیں
جام سے تجھکو لہو کا جام ہے
جانتے ہیں سب ملنساری تیری
تیری خوش طبعی کی شہرت عام ہے
تو نے لکھی ہیں کتابیں بھی بہت
شاعر خوش گو بھی تیرا نام ہے
قرب مسجد ہے رہائش بھی تیری
غیرت صد صبح تیری شام ہے
بات لیکن تجھ سے اک کہتا ہوں میں
اور وہ قول شارع اسلام ہے
جو کوئی ہے تارک صوم و صلوٰۃ
ہے مسلماں پر برائے نام ہے
گھر میں مسجد اور تو اس میں نہ جائے
سوچ غافل اس کا کیا انجام ہے
سنتے ہیں روزے بھی تو رکھتا نہیں
دین کو سمجھے ہوئے اوہام ہے
جہل سے بدتر تری شائستگی
کفر سے بدتر ترا اسلام ہے

ان دنوں دہلی دروازہ کے اندر ایک چھوٹی سی تنگ گلی میں قیام تھا اس گلی کے اندر مکان سے متصل ایک مسجد بھی ہے اسی گلی کو دیکھکر وجاہت مرحوم نے ایک مصرع طرح دیا تھا ع فوق صاحب گلی میں رہتے ہیں۔ اسی مکان اور گلی کی یادگار ایک اور شعر ہے ؎

دلی دروازے رہا کرتا ہے فوق خستہ جاں
اس قدر کیوں جستجو میں اے اجل حیراں ہے تو

ماضی و حال

گوری پورہ دنزیل سوپور امیں میرے چچا منشی غلام محمد صاحب خادم کا قیام دھلہ دہیں
انجمن جناب بابو غلام حسن صاحب رئیس وزیر آباد معہ بال
بچوں کے ایک خیمہ میں تھا۔ ان کے خوشگوار سایہ کے نیچے امانت گزین تھے۔ میں بھی انہی کے پاس سوا دو مہینہ تک رہا۔ اسی جگہ انجمن نصرت الاسلام سرینگر کی طرف سے شمولیت جلسہ اور نظم لکھنے کا دعوت نامہ آیا۔ میں نے بابو صاحب کے صاحبزادہ عزیز محمد مظفر کو جو دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ۵۔ اگست کو گوری پورہ ہی میں ایک نظم جلسہ کے لئے لکھ دی۔ ۱۹۔ ۲۰۔ اگست ۱۹۱۱ء کو جلسہ تھا۔ محمد مظفر نے اس خوش الحانی سے نظم پڑھی کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ افسوس ہے عزیز مذکور ۲۳۔ اپریل ۱۹۱۲ء کو تین ماہ کی علالت کے بعد ۱۷½ سال کی عمر میں بمقام وزیر آباد انتقال کر گیا۔ نظم حسب ذیل ہے:-

ہے نمایاں آج افسردہ دلی بھی جوش بھی ۔۔۔ بیہوشی بھی ہے عیاں چہرے سے اپنے ہوش بھی
شورِ محشر بھی ہے برپا اور لب خاموش بھی ۔۔۔ چشم دریا بار بھی ہے اور دل غم کوش بھی

آج پھر تڑپا رہی ہے یاد ایام سلف
لوح دل پر نقش ہے پھر عظمت نام سلف

آج پھر اسلام کی وہ ابتدا یاد آگئی ۔۔۔ چیز اک بھولی ہوئی تھی برملا یاد آگئی
آج پھر گلزار یثرب کی فضا یاد آگئی ۔۔۔ آج پھر وہ خوئے ارباب وفا یاد آگئی

پھر وہی احوال قرن اولیں آنکھوں میں ہے
آج پھر تمثال ختم المرسلیں آنکھوں میں ہے

اے فلک کچھ یاد ہے رہتے تھے ہم کس آن میں ۔۔۔ شیر تھے کہسار میں ضرغام تھے میدان میں
بوئے گل بن کر رہے برسوں بہارستان میں ۔۔۔ آیۂ تطہیر اتری تھی ہماری شان میں

برکتیں نازل ہوا کرتی تھیں کیا ایام تھے
طائران قدس بھی اک صید زیر دام تھے

جب لڑائی کے لئے نکلے کبھی میدان میں — ڈھیر لاکھوں دشمنوں کے کر دیئے اک آن میں
جوش قومی سے تھی جاں تازہ تن بیجان میں — ہم رہے ثابت قدم ہر سیل ہر طوفان میں

تھے مقاصد سب سے اعلیٰ اس لئے عالی بنے
مصر کے ہندوستاں کے روم کے والی بنے

علم و حکمت کی نہ کچھ پوچھو کہ اک دریا تھے ہم — ہم امام وقت تھے ہاں بوعلی سینا تھے ہم
دین میں تھے برگزیدہ رونق دنیا تھے ہم — محو حیرت ہوں کہ اب کیا ہو گئے اور کیا تھے ہم

علم کا پڑھنا ہمیں نے فرض سب پر کر دیا
علم کے پھولوں سے دامن مرد و زن کا بھر دیا

ہم وہی ہیں دل وہی ہے تن وہی ہے جاں وہی — اپنا پیغمبر وہی خالق وہی قرآں وہی
گل وہی خوشبو وہی بلبل وہی بستاں وہی — دیں وہی مذہب وہی مشرب وہی ایماں وہی

سوچئے آخر کہ پھر تذلیل کا باعث ہے کیا
امت مرحوم کی ترحیل کا باعث ہے کیا

ہر جگہ یوں تو مسلمانوں کا ابتر حال ہے — باہمی الفت کے چہرے پر حسد کا خال ہے
دن سے بدتر ماہ ہے اور ماہ سے بدتر سال ہے — بے سمجھ لاکھوں سمجھ والوں کا ان میں کال ہے

لیکن ان کشمیر والوں کی نہ حالت پوچھئے
بے حقیقت ہیں سراسر گر حقیقت پوچھئے

کیا یہ وہ کشمیر ہے عالم میں جو مشہور ہے — حضرت مخدوم جس کی خاک میں مستور ہے
شیخ نور الدین ولی کا کیا اسی میں نور ہے — کیا یہیں تخت سلیماں مثل کوہ طور ہے

خانقاہ شاہ ہمداں کیا اسی کشمیر میں ہے
دیکھنے کی جس کے خواہش چشم ہر ناظر میں ہے

کیا نہیں شہ شاہ زین العابدین پیدا ہوا　　کیا غنی سا شاعر یکتا نہیں پیدا ہوا
ہاں نہیں پیدا ہوا ہرگز نہیں پیدا ہوا　　کیا رسل شاہ میر واعظ سا کہیں پیدا ہوا

ایسے ایسے لوگ جب ان میں ہی پیدا ہو گئے
آج پھر کیوں خطہ کشمیر والے سو گئے

جو کوئی منزل پہ پہنچا دیگا رہبر ہے وہی　　جو جگا دیگا انہیں مرد دلاور ہے وہی
دل جو اس میں ہار دے اپنا مظفر ہے وہی　　جس میں سودا قوم کی الفت کا ہے سر ہے وہی

پانچ مصرعوں کا چھٹے مصرع میں یہ مفہوم ہے
جو کرے گا قوم کی خدمت وہی مخدوم ہے

ہم انجمن نصرت الاسلام کے جلسہ اور شہر (سرینگر) کے قابل دید مقامات کی سیر کے لئے قریباً بارہ دن تک سرینگر میں رہے۔ قیام ایک ہوس بوٹ میں تھا۔ ایک دن ہم سب لوگ باغات و مزارات کی سیر کو چلے گئے۔ ہوس بوٹ پر ہمارا ملازم تھا یا ہانجی (ملاح) لوگ۔ واپسی شام کو ہوئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ زیور جو ایک صندوقچہ میں مقفل تھا کہیں غائب ہے۔ ہانجیوں اور ملازم کو حوالہ پولیس کیا گیا۔ مگر کچھ سراغ نہ ملا۔ اسی حالت میں یہ شعر زبان سے نکل گیا ؎

اندھیرے کر کے لوٹا گیا دن کو قافلہ　　ہر گام پر ہے راہ میں بخت سیاہ ساتھ

ستمبر کی چوتھی یا پانچویں تاریخ کو ہمارا قافلہ سوپور کی طرف واپس آیا۔ ہم نے ہوس بوٹ کو جھیل ڈلر کے گھاٹ وٹلیت پر چھوڑا۔ اور وہاں سے گھوڑے لیکر بند مقام میں گئے۔ جو رام پور راجہ جھور کے وسیع و سرسبز جنگل میں ایک فرحت افزا مقام ہے۔ اسی جگہ ۵ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو پانچ بجے شام کے قریب مندرجہ ذیل اشعار اسی ردیف و قافیہ میں تیار ہو گئے۔ ؎

جود و سخا و لطف و کرم کا تو ساتھ ڈھونڈھ　　کیا دیں گے مال و ثروت و اعزاز و جاہ ساتھ

کشتِ عمل میں تخمِ نکوئی کو بوئیے | انساں کو چاہیے کہ رکھے زادِ راہ ساتھ
آخر یہ کس غرور پہ شاہانہ نخوتیں | غافل سمجھ کہ لے گئے کیا بادشاہ ساتھ
اندھیر ہے کہ لوٹا گیا دن کو قافلہ | ہر گام پر ہے راہ میں بختِ سیاہ ساتھ
اک وہ کہ ساتھ دیتے ہیں اُن کا تمام لوگ
اے فوقؔ ایک ہم ہیں نہیں کوئی آہ ساتھ

(۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء بروز جمعرات ۵½ بجے صبح بمقام بارہ مولا کشمیر)

تو دلِ مرحوم کا دشمن سدا اے غم رہا | ہم رہے ہمدم ترے جب تک کہ دم میں دم رہا
یادِ اقبالِ گذشتہ پر عجب عالم رہا | غم رہا نالہ رہا شیون رہا ماتم رہا
شادی و غم میں رہے بے چین دردِ قوم سے | ہم رہے جس حال میں یہ فکر بیش و کم رہا
آج اس ساغر کے ٹکڑے بھی نہیں ملتے کہیں | بزمِ شاہاں میں جو برسوں رشکِ جامِ جم رہا
ٹھیں رہِ ہستی کے طے کرنے میں صدہا ٹھوکریں
فوقؔ اس منزل میں وقتِ لغزشِ پیہم رہا

(کشمیر سے واپسی پر بمقام راولپنڈی ۲۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء بوقت شام)

گو بہت عرصہ ہوا کشمیر کو چھوڑے ہوئے | پر دلِ پُر درد سے یادِ وطن جاتی نہیں
باغ میں صیاد تو نے کیا کھلائے گل نئے | عندلیبِ زار کیوں سوئے چمن جاتی نہیں
جانتے بھی ہیں کہ جو کچھ ہے یہیں رہ جائیگا
فوقؔ لیکن پھر بھی حرصِ ما و من جاتی نہیں

ہندوؤں اور مسلمانوں کا آئینہ

مجھے ۱۹۱۱ء کے سفرِ کشمیر سے آئے ہوئے ابھی تین ہی ہفتے گذرے تھے کہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کا تار سرینگر سے عمو صاحب منشی غلام محمد صاحب

خادم کی سخت علالت کا ملا۔ ۲۵ اکتوبر کو میں پھر کشمیر روانہ ہو گیا۔ روزانہ پیسہ اخبار کا ایک تازہ پرچہ جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) کا ایک لکچر ہندوؤں اور مسلمانوں کے موازنہ کے متعلق درج تھا۔ ملا ۲۶ کی شام کو ٹانگہ راولپنڈی سے روانہ ہوا جب دن کے اُجالے نے پہاڑی سلسلوں کی دلفریبیوں اور سبزہ زار اور گل و گلزار کی سحر آفرینیوں سے ظلمت شب کا پردہ اٹھا دیا۔ تو لکچر کا مضمون نالۂ موزون کی صورت میں دماغ سے دل اور دل سے زبان پر آنے لگا ؎

ہے ہندوستان میں اک قوم ہندو
کوئی اس جیسا فرزانہ نہیں ہے
بڑے سیانے بڑے زیرک ہیں یہ لوگ
نہیں پھنستے جہاں دانہ نہیں ہے
نہ کیوں ہوں آشنائے بحر تدریس
کہ بے علمی سے یارانہ نہیں ہے
زمانہ کو انہوں نے خوب تاڑا
کسی نے ایسا پہچانا نہیں ہے
بہت سے بادشہ دیکھے انہوں نے
نہ ہو گر تاج شاہانہ نہیں ہے
جہاں دیکھا وہاں سے فیض پایا
"غرض" پر غیر بیگانہ نہیں ہے
ہوئے عہدوں کے مالک علم پڑھ کر
کہ یہ کار غلامانہ نہیں ہے
دل ہندو نہیں اب تیرہ و تار
سیہ خانہ سیہ خانہ نہیں ہے
فزوں ہے علم میں زریں اثر میں
سخن یہ چاپلوسانہ نہیں ہے
جو حاصل روز ہو جاتا ہے ان کو
وہ حاصل ہم کو سالانہ نہیں ہے
ہوا جو اتحاد اب ان میں قائم
نہ ٹوٹے گا کہ پیمانہ نہیں ہے
ہے ان کی زندگی کا خاص مقصد
حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے
غرض برطانیہ کی سلطنت میں
کوئی اس قوم سا دانا نہیں ہے
کہیں کیا اب مسلمانوں کی حالت
خبر ہے پیر کی ان کو نہ سر کی

نظر آتی تو ہے تصویر لیکن — یہ ہے کیا امت خیر البشر کی
پیمبر ایک قرآن و خدا ایک — ہے پھر کیا وجہ حال منتشر کی
شکستِ شیشۂ دل نے بھلا دی — گئیں اب لذتیں شیر و شکر کی
بہت شاداں ہیں فاقہ مستیوں پہ — خبر کچھ ان کو باہر کی نہ گھر کی

مگر تقریب شادی کی جو آ جائے
لٹا دیں گے کمائی عمر بھر کی

اگر اس عہد میں بھی تم نہ سنبھلے — غذا بن جاؤ گے نار سقر کی
ترقی غیر کرتے ہیں تو کر جائیں — تمہارے مبتدا کو کیا خبر کی؟
غضب ہے مٹھی بھر انگریز آئیں — طنابیں کھینچ کر ہر بحر و بر کی
نہیں متضاد قوموں کے شہنشاہ — بہا دیں ندیاں علم و ہنر کی
کریں جاری کہیں ریلیں کہیں تار — دکھائیں عقل اور طاقت بشر کی
ہزاروں مشکلوں پر آئیں غالب — کبھی ان باتوں پر بھی کچھ نظر کی
یہی سب باتیں ہیں اب ہندوؤں میں — ہوا ان میں ہے مغرب کے اثر کی

انہیں سب گر ترقی کے ہیں ازبر
خبر ہے سب انہیں نفع و ضرر کی

تعجب ہے مسلمانوں میں کیا اب — اثر کے جذب کی طاقت نہیں ہے
مسلماں خود مسیحائے زماں تھے — مگر اب ان میں خود صحت نہیں ہے
ہمیں نے عرش کے توڑے ہیں تارے — ہمیں کو آج کچھ رفعت نہیں ہے
ہمیں نے متحد ہونا سکھایا — ہمیں میں آج جمعیت نہیں ہے

کرو۔ اے قوم والو حل یہ عقدہ
کہ اس مشکل میں کچھ دقت نہیں ہے

سنور جائے کے ہیں ساماں نظر میں — ابھی اتنا ایسا کچھ بگڑا نہیں ہے
سلامت رہ رہا اسلام دائم — کسی سے کچھ اسے جھگڑا نہیں ہے
نہیں ہے تیغ تیموری تو کیا ڈر — ضرورت اسکی اب اصلا نہیں ہے
مگر وہ عزم و استقلال تو ہے — کہ جس کا کوئی بھی ہمتا نہیں ہے
جہاں علم و عمل مل جائے لیلو — کہ ان باتوں میں کچھ کھٹکا نہیں ہے
ارادہ ہو تو پھر ہے کوہ کیا چیز — کسی نے آگے کیا چیرا نہیں ہے
کرو ہمت دکھاؤ کارنامے — کہ تم سا کوئی دل والا نہیں ہے

نہ بڑھ بڑھکر کرو باتیں اب اے فوق
زمانہ آجکل اچھا نہیں ہے

۲۸ اکتوبر ۱۹۱۱ء کی شام کو پڑاؤ دو میل سے گڑھی تک تاریکی، بارش اور ہوائے تیز و تند کے جوش و خروش سے بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں چند شعر زبان سے نکل گئے ؎

یارب یہ نظر آتے ہیں کیوں خواب پریشاں — کچھ آج نئی اور مصیبت تو نہیں ہے
یہ جان حزیں اور الم ہائے فراواں — اس بوجھ کے قابل مری ہمت تو نہیں ہے
کیوں دشت و جبل کی ہیں مجھے اس ہوائیں — کچھ قیس سے ملتی ہوئی قسمت تو نہیں ہے

در کھلتے ہی توبہ کا ہوئیں عفو خطائیں
یہ باب کہیں باب اجابت تو نہیں ہے

اتحاد ثلاثہ اور دنیائے اسلام

۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو جب اٹلی نے یکایک ٹرکی کو اعلان جنگ دیکر دنیا کو متحیر و ششدر کر دیا۔ تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اضطراب عظیم پیدا ہوا ۹ نومبر ۱۹۱۱ء

کو قیام سرینگر کے دوران میں اسی اضطراب سے متاثر ہو کر عنوان بالا پر ایک نظم لکھی جو ۱۱۔ نومبر ۱۹۱۱ء کے اخبار زمیندار میں چھپ گئی۔

چھائی ہیں کالی گھٹائیں عالم اسلام پر — اس میں ایراں ہو مراکو ہو کہ ترکستان ہو
نوچ کھایا حرص یورپ نے ہمارے جسم کو — کیوں نہ وقفِ کاہشِ اندوہ دل و جان ہو
اپنی کوتاہی سے پھر بڑھنے کو ہے دستِ دراز — اب بھی مسلم بچ رہیں۔ قائم اگر ایمان ہو
جرمنی کی اے مثلث طاقتو سچ سچ بتاؤ — آدمی ہو یا بہ شکل آدمی شیطان ہو

کیا ہوئے حفظ مساواتِ اخوت کے اصول
کیا تمہیں آزادی و تہذیب کی پہچان ہو

المدد اے شوکت دینِ محمد المدد — آفتوں میں ہیں مسلمان گردشِ ایام سے
المدد اے سطوتِ فاروقِ اعظم المدد — ترک ہیں الجھے ہوئے اٹلی نافرجام سے
المدد اے صولتِ فتاحِ خیبر المدد — مسلموں کو سرخرو کر چرخِ نیلی فام سے
اے شجاعانِ عرب پیدا ہو پھر خالد کوئی — کفر نے جھگڑا لیا ہے دل پھر اسلام سے
برق بن کر راکھ کر دے خرمنِ اٹلی کو تو — جرمنی کا طشت پھینکا ہے چرخ اسکے بام سے
اے عروسِ فتح آ بہر خدا آغوش میں — ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں سب مسلماں شام سے

حشر تک ترکی رہیگا دشمنوں پر کامیاب
متفق ہیں سب مسلماں میرے اس الہام سے

نام لیوا تیرے مٹ جائیں نہ اے پروردگار — پنجۂ تثلیث سے توحید کو آزاد کر
چالبازی اور مکاری ہے معمولی سی بات — اور اے تہذیب یورپ اب کوئی ایجاد کر
پھونک ڈالیگی ستمگاروں کو مظلوموں کی آہ — اے جفاکیش ابتدا انجامِ بد کو یاد کر

کوہ ابلیس سے رواں ہونیکو ہے اک جوئے خون
یارب اس کے واسطے پیدا کوئی فرہاد کر

میاں بی بی

قیام سرینگر کے ایام میں ایک دوست کو جو گورنری میں ایک معزز عہدے پر تھے ,,تعلیم یافتہ بی بی،، کی آزادی اور ناول خوانی کے ہاتھوں نالاں پایا۔ ہم ۲۔ نومبر ۱۹۱۱ء کو سرینگر سے میں واپس پنجاب روانہ ہوا۔ ۲۶۔ نومبر کی چاندنی رات میں (اوڑی چکوٹھی کے سفر کے درمیان) ان کی پریشانیوں کے ساتھ میاں بی بی کے حقیقی تعلقات یاد آ گئے۔ جو اشعار کی صورت میں حسب ذیل ہیں۔

مری ہمدم مری مونس مری راحت رساں بی بی
مرے دکھ درد کی ساتھی مری آرام جاں بی بی

ہیں حسن و عشق سے بالاتریں دونوں میاں بی بی
کہاں مجنوں کہاں لیلیٰ کہاں شوہر کہاں بی بی

نہ ہو باور تو راماین سے سن لو ذکر سیتا کا
ہمیشہ سرخرو نکلی بوقت امتحاں بی بی

اگر بیوی اس کے تابع ہے اگر وہ اس سے راضی ہے
نہ ہو پھر بدگماں شوہر نہ ہو پھر بدگماں بی بی

یہ دنیا اور دنیا کے یہ جھگڑے عیش جنت ہوں
اگر تقدیر سے مل جائے دل کی رازداں بی بی

نہ ہو سیل حوادث کا اثر کچھ دل گرفتوں پر
اگر خوش باش بچے ہوں اگر ہو مہرباں بی بی

نہیں صورت میں گر شان مسیحائی تو کیا ڈر ہے
نہ سیرت سے مگر ہو کوئی مرگ ناگہاں بی بی

خدا معبود برحق ہے مگر ہے بعد ازاں شوہر
ہے حق ماں باپ کا برحق مگر ہے بعد ازاں بی بی

بہت اچھی ہے گر لکھی پڑھی بی بی کوئی مل جائے
مگر ہو تربیت تو پھر ہے عیش جاوداں بی بی

یہی تو پاک الفت ہے یہی تو عشق صادق ہے
جو رکھتے ہیں دل پُر درد دنیا باہم میاں بی بی

خدا ہی آبرو رکھے تو رکھے فوق اس گھر کی
میاں ہو جس میں جاہل اور ہو اخبار خواں بی بی

۱؎ خصوصاً مرتبہ بعد طلاق نے میاں بیوی کو جدا کر دیا۔

دہلی کا تخت و تاج

ملک معظم جارج پنجم ۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو انگلستان سے ممبئی آئے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو بعہد لارڈ کرزن دہلی میں عظیم الشان دربار ہوا۔ اکثر اخبارات نے اس موقعہ پر دربار نمبر شائع کئے۔ اخبار زمیندار کا دربار نمبر بڑا شاندار تھا مولوی ظفر علی خان بی اے ایڈیٹر اور منشی وجاہت حسین وجاہت جائینٹ ایڈیٹر کی فرمائش سے میں نے بھی چند اشعار لکھے۔ جن میں سے تین ابتدائی شعر بطور یادگار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

بخت جاگے تخت کے معراج پایا تاج نے — تخت بھی وہ تاج بھی وہ جو نہیں رکھتے مثال
کھل گئی قسمت تری اے دلی مرحوم آج — پھر نظر آنے لگا تجھ میں ترا جاہ و جلال
گو سنی تاخیر سے اللہ نے۔ لیکن سنی — ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال

کانگڑی اور پھرن

۱۱ دسمبر ۱۹۱۱ء کو میں ایک دو دن کے لئے گھرتل (ضلع سیالکوٹ) گیا تھا۔ اسی تاریخ سو وہاں پانچ بجے شام کے ذہن کشمیر کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور ذیل کے اشعار لکھے گئے

خطۂ کشمیر میں ہر کوئی بے توقیر ہے — علم کے دشمن جو ہیں ان کی یہی تعزیر ہے
حسن بھی میوے بھی چشمے بھی ہوا بھی پُر فضا — پھر یہ کیا جو کوئی دل والا ہے وہ دلگیر ہے
ٹوٹنے بگڑتی ہوئی قومیں اٹھائی ہیں بہت — اے فلک اس کے سنبھلنے کی بھی کچھ تدبیر ہے
عنقریب آنے کو ہے کشمیر میں بھی انقلاب[1] — وقت استاد زماں ہے اور زمانہ پیر ہے

شامت اعمال سے پردہ میں آئی کانگڑی
اور پھرن ان کا پیرہن پھوٹی ہوئی تقدیر ہے

[1] ۱۹۳۱ء کے کشمیر ایجی ٹیشن نے آخر کشمیر میں انقلاب پیدا کر دیا۔

ہرن مینار

جہانگیر نے اپنی تزک میں اس مینار کا ذکر اس طرح پر کیا ہے جب وہ ۵ ذی الحجہ ۱۰۱۵ھ کو لاہور سے سیر کابل کے لیے روانہ ہوا تو رستہ میں وہ اپنی شکارگاہ شیخوپورہ میں ٹھہرا جس کا نام اس نے جہانگیر پورہ رکھا لیکن جو مشہور نہ ہو سکا۔ جہانگیر لکھتا ہے "اس کے نواح میں میرے حکم سے ایک ہرن منسراج کی قبر پر ایک مینار تعمیر کیا گیا۔ یہ ہرن جنگ آہوان خانگی اور صید آہوان صحرائی میں بے نظیر تھا۔ میں نے اس ہرن کی یادگار میں حکم جاری کر دیا کہ کوئی شخص اس صحرا میں قصد شکار آہوان نہ کرے۔ اور اس صحرا کے ہرنوں کا گوشت ہندو مسلمان کیلئے گوشت گاؤ اور گوشت خوک کے برابر ہوگا۔

"بادشاہ کے حکم سے سرآمد خوشنویسان زمان ملا محمد حسین کاشمیری نے حسب ذیل عبارت پتھر پر نقش کی" دریں فضائے دلکش آہوئے بدام جہانداری خدا آگاہ نورالدین جہانگیر بادشاہ آمدہ در عرض یکماہ از وحشت صحرائیت برآمدہ سرآمد آہوان خاصہ گشت"

راقم الحروف اس مینار کی سیر کیلئے جو شیخوپورہ سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہے اخیر ۱۹۱۱ء کے ایام میں گیا۔ تالاب اور سربفلک مینار اور ایک نہر کے آثار نے ہر چند کہ وہ سب شکستہ تھے عہد جہانگیری کی شوکت عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا وسیع تالاب کے عین وسط میں ایک بارہ دری ہے جس پر بحکم گورنر پنجاب آرام گاہ جہانگیر بادشاہ لکھا ہوا ہے۔

ہو گئے ہیں طعمۂ مور و ملخ — سونے والے شیر نر کو مار کے
آج ہیں خود کشتۂ تیغ اجل — جو دھنی تھے تیر اور تلوار کے
جیتے ہوئے دیو اجل کے ہاتھ سے — دیو بھی جاتے تھے جن سے ہار کے
بوم کا مسکن ہے وہ بارہ دری — جس میں جلسے تھے کبھی دربار کے
دیکھ اے غافل کہ ہیں پیوند خاک — بیٹھنے والے ہرن مینار کے
خشک ہے اب نہر بھی تالاب بھی — یاس روتی ہے وہاں بس مار کے
کیوں نہ ہٹ جاتا اثر تعمیر کا — جب نشاں تک مٹ گئے معمار کے

گنبد و دیوار و مینار بلند
عکس ہیں اجڑے ہوئے آثار کے

سنہ ۱۹۱۲ء کی پہلی نظم

مارچ سنہ ۱۹۱۲ء کے آخری ایام میں انجمن اسلامیہ جموں کا سالانہ جلسہ تھا ان دنوں صاحبزادہ حضرت شاہ مرحوم جو فارسی کے ایک قابل شاعر تھے۔ انجمن کے سکرٹری تھے چونکہ دفتر میں کام کی وجہ سے فرصت نہ ملتی تھی اس لئے کبھی خیال آجاتا۔ تو رات کو۔ ورنہ صبح سیر کو نکل جاتا۔ اور جتنے شعر بغیر تکلف کے ہو سکتے لکھ لیتا۔ یہ نظم بھی جنوری کی کسی تاریخ کو اسی طرح لکھی گئی۔

جوشِ مردانہ کہاں عزمِ شریفانہ کہاں — ہم میں اب اعمال و اقوالِ حکیمانہ کہاں
ٹوٹنے سے جو ہو ناواقف وہ پیمانہ کہاں — دُور ہو پیچ و تابِ زلف جس سے وہ اب شانہ کہاں
جس سے تھے سب مست و بیخود اب وہ صہبا کیا ہوا — جس سے تھی سیراب اک دنیا وہ خمخانہ کہاں
کس لئے "حکم" و "شاورہم" پہ ہم عامل نہیں — اب وہ شوریٰ اور وہ آرائے فقیہانہ کہاں

اب ضیائے دین و ایماں کا اجالا کیوں نہیں
اخترِ قسمت مسلمانوں کا بالا کیوں نہیں

کفر سے لبریز ہیں دل اہلِ ایماں ہیں مگر — بدتریں مور و ملخ سے ہیں سلیماں ہیں مگر
کام حیوانوں کے سب کہنے کو انساں ہیں مگر — دشمنِ اسلام۔ ظاہر میں مسلماں ہیں مگر

سچے مومن ہیں عدم میں اولیا ہیں گور میں
ہے مسلمانی کتابوں میں مسلماں گور میں

گردشِ دورِ زمانہ گو ستم ایجاد ہے — گو غمِ فردا سے دل اپنا بہت ناشاد ہے
گو رواں ہر دم رگوں پر نشترِ فصاد ہے — رحمتِ حق کا مگر کیا برمحل ارشاد ہے

کٹ گئیں ذلت کی راتیں لد گئے کلفت کے دن
سامنے پرتاب کی صورت میں ہیں راحت کے دن

سُن کے تعلیمی عطیہ کی خبر کہتے ہیں سب ۔۔۔ علم کی نہریں رواں ہونے کو ہیں جموں میں اب
جو کوئی اَن پڑھ ہے اب سیکھ لے پڑھنے کے ڈھب ۔۔۔ پھر خدا جانے مبارک دَور ایسا آئے کب

ہندو و مسلم پہ یکساں سایۂ پرتاب ہے
کشتِ اُمیدِ رعایا آجکل شاداب ہے

گوہرِ مقصد ہے حاضر دستِ ہمّت کو بڑھا ۔۔۔ خود کبھی آئیگی دولت خود بدولت کو بڑھا
ہسٹری پڑھ دیکھ اخبار یں لیاقت کو بڑھا ۔۔۔ تو بھی بڑھ جائیگا پہلے قابلیّت کو بڑھا

چاہیے چلنا زمانہ کو ذرا پہچان کر
بخت کا شکوہ نہ کر نادان سب کچھ جانکر

حامیانِ قوم اب قومی حرارت تیز ہو ۔۔۔ خون ہو پیدا رگوں میں اور حرکت تیز ہو
بڑھ گئے ہیں ساتھ والے پائے ہمّت تیز ہو ۔۔۔ دشمنی ہو دور اور باہم محبّت تیز ہو

قوم میں احساس کا کچھ شوق تو پیدا کرو
گر نہیں اقبال کوئی فوق تو پیدا کرو

مناظرہ وطن و زمیندار

سنہ ۱۹۱۱ و سنہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کی وجہ سے بہیدو نوں ہفتہ وار اخبار روزانہ ہو گئے تھے اور خوب چمکے تھے۔ وطن کے اڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان مرحوم تھے (سنہ وفات سنہ ۱۹۲۶ء) اور زمیندار کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خان بی اے تھے۔ کئی سال تک دونوں میں جنگ زرگری شروع رہی میں نے ان دنوں اخباروں پر مناظرہ کی صورت میں ایک نظم

ے سنہ ۱۹۱۱ء میں ملک معظم جارج پنجم کے ہندوستان آنے پر مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ آنجہانی والئے جموں و کشمیر نے پچاس ہزار روپیہ تعلیم رعایائے ریاست کے لئے وقف کیا تھا۔

۱۸-۱۹-۲۰ فروری ۱۹۱۲ء کو بہ اوقات متفرق لکھی۔ منشی وجاہت حسین وجاہت ان دنوں زمیندار کے اسسٹنٹ اڈیٹر تھے۔ انہوں نے اس نظم کا ذکر مولوی ظفر علی خاں سے کیا۔ انہوں نے کہا ہر چند اس نظم میں ہماری بھی خوب خبر لی گئی ہے لیکن یہ نظم اس قدر دلچسپ ہے کہ آپ اجازت دیں یا نہ دیں میں اس کو چھاپنے کے لئے آمادہ ہوں۔ چنانچہ میری اجازت سے یہ نظم ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء کے روزانہ زمیندار میں چھپی۔ اس نظم کا کئی ماہ تک لاہور میں چرچا رہا۔

(اخبار وطن اخبار زمیندار سے)

تیز قینچی سی زباں تیری۔ قلم آفت رقم
آتشیں منظر تری تحریر بھی تقریر بھی

یاد ہیں اب تک دکن میں سازشیں تو نے جو کیں
پا بدستے تو بھی نکلا اور تیرا پیر بھی

پارٹی فیلنگ دکن کی گو بہت مشہور ہے
لیکن اس سے کچھ بڑھی دیکھی تری تشہیر بھی

بادشہ ظل خدا ہے باپ ہے اکرام حق
شک اگر ہو دیکھ لے قرآن بھی تفسیر بھی

جو سلوک ان سے کیا تو نے وہ سب کو یاد ہے
اب تو شہرت ہو گئی ہے اس کی عالمگیر بھی

خطۂ پنجاب کے شہر وزیرآباد میں
صورت باد خزاں الفت کا گلشن کر دیا

ہندو و مسلم وہاں تھے دوستانہ رنگ میں
پارٹی فیلنگ کے شیدائی نے دشمن کر دیا

دونوں فرقوں میں وہاں لاٹھی بھی آخر چل گئی
ہائے ظالم نے جدا چولی سے دامن کر دیا

کھل گئے جوہر مگر لاہور میں کچھ اور بھی
آہنی دیوار ودد میں تو نے روزن کر دیا

ابتدا میں ہندوؤں پر شعلہ افشانی ہوئی
جس نے اس فرقہ کو ہر مسلم سے بدظن کر دیا

بوئے کو کشت دل مسلم میں ہے تخم حسد
نام لکھا ہے اس کا زمیندار اور زمینداری بھی ہے

وعظ میں لکچر میں تحریروں میں تشہیر نماز
خود نمائی میں غضب ہے کہ خودداری بھی ہے

لیڈروں پر چوٹ کرجانا مگر ڈرتے ہوئے — اس کی ہر تحریر انکاری بھی اقراری بھی ہے
بدگماں سرکار سے کرنا دل مسلم مگر — خوف سے قانون کے ظاہر وفاداری بھی ہے
ٹرکی و ایراں کے دکھڑے رو کے چمکائی دکاں — نغمۂ شادی بھی لب پر ہے عزاداری بھی ہے
کہہ چکے ہم بارہا رو کو زبان تیز کو — باعث نقصاں کبھی یہ تیز گفتاری بھی ہے
تم مسلمانوں کے پالٹیکس کو سمجھو گے کیا — اس کی صورت خارداری بھی ہے گلزاری بھی ہے

تیر کی صورت تمہیں سیدھا کروں چاہوں اگر
فرگسن[1] سے دوستانہ ڈین[2] سے یاری بھی ہے

(زمیندار کا جواب وطن کو)

لیجیے میداں میں آئے خدائی فوجدار — ہے جگر سوز حسد سے آج جن کا داغدار
حسن خدمت کی جو نسبت ہر دو سازش ہے اگر — تو بہر صورت ظفر ہے مجرم و تقصیروار
بات گستاخیوں کا دیجیے کوئی ثبوت — یا نکالا مفت میں جل کے یہ دل کا بخار
دیکھنا کیسا کتاب شرع کا اے بے خبر — بندۂ عاصی ہے اس پر صدق دل سے جاں نثار

کب کلام پاک کا ہو دیکھنا اس کو نصیب
عمر بھر قرآں[3] فروشی پر رہے جس کا مدار

دیکھ اپنی آنکھ کا ظالم کبھی شہتیر بھی — میرے اک تنکے سے کیوں دل میں ترے آیا غبار
میرے ہر لکچر سے بو آئی بغاوت کی تجھے — دل میں جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہے آخر آشکار
میری ہر خوبی برائی ہی نظر آئی تجھے — پھول ہے سعدی اگر دشمن کی نظروں میں ہے خار

میرے آنے سے وزیرآباد کے لوگوں سے پوچھ
آج تک ہیں دیدہ و دل جن کے وقف انتظار

---

[1] اس زمانہ میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے [2] سر لوئیس ڈین لفٹنٹ گورنر پنجاب۔
[3] ان ایام میں مولوی انشاء اللہ خاں مرحوم نے ایک قرآن شریف طبع کرکے بڑی دھوم دھام سے اس کا اشتہار دیا تھا۔

دفتر اخبار جب سے آگیا لاہور میں
یہ خیال آتا رہا ہے میرے دل میں بار بار

یاالٰہی کونسی تقصیر مجھ سے ہو گئی
کیوں نہیں مسلم ایڈیٹر کوئی میرا غمگسار

ایک پردیسی سے پھر ہم جنس سے ایسا سلوک
کیا یہی اسلام میں دعوت کا ہوتا ہے شعار

ہندو و مسلم کو لڑوانے کی مجھ پر تہمتیں
ہو گیا دامن مگر انصاف کا اب تار تار

دیکھئے سن سات کا فائل وطنؔ کا غور سے
دیکھکر اس کو مگر ہونا نہ ہرگز شرمسار

جو مسلمانوں کے دل میں ہے وہی کہتا ہوں میں
قوم سے تو پوچھ اگر مجھ پر نہیں ہے اعتبار

ہے وہی لیڈر جو خود ہے عامل صوم و صلوٰۃ
اور امیروں کی طرح کرتا غریبوں کو ہو پیار

پاک ہو خود غرضیوں سے صاف آلائش سے ہو
اپنی ساری قوم کا چاہے وہ جب چاہے وقار

مسجدوں میں بھی کلب گھر کی طرح آجائے وہ
فرش پر بھی بیٹھ جائے گو نہ کچھ سمجھے وہ عار

"ست بچن مہاراج" نے مٹی ہماری کی پلید
اب ہے بے چینی کا گھر پہلے جو تھا دارالقرار

کھٹ کھٹاؤ گے تو دروازے کو کھولا جائیگا
ہاں اسی انداز سے چلتے جہاں کے کاروبار

ہاں مگر جو حرف ہیں اُن وہ ادب کے ساتھ ہوں
لیکن اُن کے ساتھ ہی الفاظ بھی ہوں نہ دردار

کینہ توزوں کی طرح ظاہر میں کچھ باطن میں کچھ
یہ مرا شیوہ نہیں ہے یہ نہیں میرا شعار

صرف اتنی بات کے معنے بغاوت ہو گئے
کیوں نہ فریادی ہو پھر یہ بندۂ طاعت شعار

جس قدر الزام ہیں مجھ پر وہ ہیں سب افترا
اصل میں ہمعصر میرے رکھتے ہیں دل میں غبار

وہ ہوا باندھی کہ میں نے گرد سب کو کر دیا
اب وہی پیدل نظر آتے ہیں جو تھے شہسوار

(کشمیری میگزین کا خطاب دونوں ایڈیٹروں سے)

دونوں کی تقریر سنکر بول اٹھا میگزین
کس لئے کرتے ہو جھگڑا صلح کر لو خبردار

وہ لکھو جس سے ہو ساری قوم کو کچھ فائدہ ۔ بحث ذاتی کر کے کیوں ہوتے ہو باہم بے وقار
تو تو میں میں سے ہمیشہ بڑھتی جائیگی خلش ۔ اور تو اور اپنی آنکھوں میں چبھو گے مثل خار

بات جو انصاف کی ہے میں نے لکھدی صاف صاف
تم اسے مانو نہ مانو یہ تمہیں ہے اختیار

چلتی ٹرین میں مصائب کشمیر کی یاد

(۱)

۱۹۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء صبح ۶ بجے چہارشنبہ کا دن تھا اور میں آگرہ سے جھانسی (یوپی) جا رہا تھا ہمارے درجہ میں ایک خوش الحان لڑکے نے ایک غزل پڑھنی شروع کی جس کی ردیف "بھول گئے" اور قافیہ نظام غلام تھا۔ لڑکے کی خاموشی کے بعد اسی بحر و قافیہ میں مجھے کشمیر کے مصائب یاد آ گئے اور میں نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے۔

ہمیں بھی ہوئے حسن کلام تھا لیکن ۔ تجھے جو دیکھا تو کلمہ کلام بھول گئے
نماز پڑھنے میں بیگار کا سنا جب نام ۔ رکوع و سجدہ درود و سلام بھول گئے
حضور پر تو ہیں ساری مصیبتیں روشن ۔ ہزار حیف ہمدار المہام بھول گئے
ہوئے ہیں نام ہمیں لیس تو سینکڑوں ازبر ۔ سہارا جس سے مگر تھا وہ نام بھول گئے

حضور بخشتے آئے حضور بخشیں گے
غلام بھوتے آئے غلام بھول گئے

(۲)

۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو میں جھانسی سے الس لاہور روانہ ہوا۔ گوالیار اور دھولپور کے ریلوے سٹیشنوں کے درمیان کشمیر نہیں بلکہ اہل کشمیر کی پردرد حالت نے پھر تڑپایا ہے

سرکار میں نہیں ہے اپنا کوئی مصاحب ۔ دربار میں نہیں ہے قائم مقام اپنا

ڈیرے وہ ڈال رکھے ہیں غیر ملکیوں نے — اپنے ہی دیس میں ہے مشکل قیام اپنا
ان کی حکومتیں ہیں اپنی اطاعتیں ہیں — دربار خاص ان کا دربار عام اپنا
بیگار کا جو ڈر ہے وہ موت سے سوا ہے — ظالم نے کر دیا ہے جینا حرام اپنا
پردیسیوں نے آکر پھیلا دیا تعصب — اور وہ بٹھا رہا ہے نقش دوام اپنا

کیوں تیر مناتھ رکھے اس کو بھلا ملازم
عرضی پہ جب نے لکھا محمود نام اپنا

(۳)

اسی سفر میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۲ء کی صبح کو میں لاہور سے امرتسر کے درمیان تھا۔ اس ڈیڑھ گھنٹہ کے ریلوے سفر میں مندرجہ ذیل نظم کشمیر کے ہی متعلق لکھی گئی۔

دل توڑ کے بیٹھے ہو یہ اچھا نہیں کرتے — ہمت کے دھنی جو ہیں وہ ایسا نہیں کرتے
ہمت ہی کی مٹھی میں ہے بجلی کی چمک بھی — جو کرنے پہ آجائیں وہ کیا کیا نہیں کرتے
مایوس ہوئے جاتے ہو۔ اللہ کے گھر سے — قرآن کو شاید کبھی دیکھا نہیں کرتے
ہر قوم پہ آتی ہیں مصیبت کی گھٹائیں — گھبرا کے مگر یوں کبھی رویا نہیں کرتے
منہ پھیرتے ہیں سیل حوادث کا وہی لوگ — جو پاؤں کبھی توڑ کے بیٹھا نہیں کرتے
مشہور جہاں میں ہے جماعت کی کرامت — تم فائدہ کیوں اس سے اٹھایا نہیں کرتے
تعلیم اگر عام ہو بیگار کہاں ہو — افسوس تم اس نکتہ کو سوچا نہیں کرتے
تعلیم ہی اک چلتا ہوا جادو ہے ایسا — جس جادو پہ عامل کبھی ٹونا نہیں کرتے
اک ہم کہ پریشاں ہی رہے غم میں تمہارے — اک تم کہ ہماری کبھی پروا نہیں کرتے
ہر ماہ[1] تمہیں بھیجتے ہیں چھاپ کے ہم خط — پڑھنا تو کجا تم اسے دیکھا نہیں کرتے
لکھتے نہیں اس میں گل و بلبل کی حکایت — افسانۂ ہجراں بھی لکھا نہیں کرتے

۱؎ مراد کشمیری اخبار سے ہے جو ان دنوں کشمیری میگزین کے نام سے ہفتہ وار کی بجائے ماہوار شائع ہوتا تھا۔

یہ خط نہیں کچھ اپنی نمائش کا ذریعہ
اس خط میں کبھی بخت کا شکوا نہیں کرتے

اس خط کو بنا لیں کبھی ہم تاجِ مفخر
ہم بھول کے بھی ایسا ارادہ نہیں کرتے

اس خط میں نہیں ہوتی ہے واعظ کی مذمت
اس خط سے کبھی شیخ کو رسوا نہیں کرتے

مقصود نہیں اس سے ملاقاتِ رُو سا
ہاں دل کے غنی اس کی تمنا نہیں کرتے

یہ خط ہے رعایا کا بھی راعی کا بھی خادم
کیا ان کو خبر جو اسے دیکھا نہیں کرتے

ہے خط میں تمہاری ہی شکایات کا رونا
ہم اپنا تو رونا کبھی رویا نہیں کرتے

اس خط نے بہت نیند کے ماتوں کو جگایا
اس طرح کہ اب راتوں کو سویا نہیں کرتے

اس خط میں کئی بار لکھا اہلِ وطن کو
نادان کا جو کام ہے دانا نہیں کرتے

کشمیر کو گرمایا ہے اس خط کی طپش نے
اس دور میں کیا مُردے کو زندا نہیں کرتے

کشمیر کی رفتارِ ترقی نہ ہو کیوں سُست
بیمار جو ہوتے ہیں وہ دوڑا نہیں کرتے

گھر بیٹھے ہی منزل پہ پہنچ جائیں گے کیونکر
باہر جو قدم گھر سے نکالا نہیں کرتے

کشمیر کا سب سے پہلا نومسلم

جنوری ۱۹۱۳ء سے کشمیری میگزین جو ۱۹۰۶ء سے ماہوار شائع ہو رہا تھا۔ ہفتہ وار کر دیا گیا۔ جو بحمد اللہ اب تک جاری ہے۔ اب فرصت پہلے سے بھی کم تھی۔ مگر پھر بھی جب کسی خاص واقعہ کا دل پر اثر ہوتا تھا۔ تو وہ اثر پذیر خیالات کسی موزون صورت میں ظاہر ہو ہی جاتے تھے۔ انہی ایام میں میں "تاریخ اقوام کشمیر" لکھ رہا تھا۔ وہاں سب سے پہلے نومسلم رینچن شاہ (تبتی شاہزادہ) کے قبول اسلام کا ذکر آ گیا جس کو سید عبدالرحمان شاہ عرف بلبل شاہ نے شاہزادہ کی خواہش اور مرضی سے مسلمان کیا تھا۔ رینچن شاہ کشمیر کا خود مختار راجہ تھا مگر تلاشِ حق کے لئے ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتا تھا۔ اتفاق سے سید بلبل شاہ جو کشمیر

اسکے پہلے نووارد مسلمان تھے۔ سرینگر آگئے۔ لب دریا انہوں نے قیام کیا۔ نماز پڑھی۔ راجہ نے اپنے محلات سے ان کو دیکھا۔ ان کا طریق عبادت پسند آیا۔ ان کو بلوایا اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد مسلمان ہوگیا۔ نام ملک صدرالدین رکھا گیا۔ عہد حکومت ۷۲۵ھ سے ۷۲۷ھ تک ہے۔ یہ نظم اسی واقعہ کے متعلق ہے۔

بات سن دم لے ٹھہر۔ اے موجۂ آب رواں
تھا لب ساحل وہ جب محو عبادت یاد ہے

اے ہری پربت کی چوٹی اے دلربائے ڈل کی موج
اسکی غاروں مرغزاروں میں ریاضت یاد ہے

اے دستہ اے ندی امرت کی اے آب حیات
وہ قیام شاہ بلبل خضر صورت یاد ہے

بلبل اسلام جب آیا ترے گلزار میں
اے گل کشمیر کیا وہ دن وہ ساعت یاد ہے

دیکھنا شاہی محل سے راجۂ ذی جاہ کا
گھر بلا کر پھر اسے دینا وہ دعوت یاد ہے

مسلم بیکس سے وہ ملنا شہر کشمیر کا
کفر کی اسلام سے صاحب سلامت یاد ہے

صفحۂ دل سے مٹا دینا وہ نقش کفر و شرک
سیکھنا اسلام کی طرز عبادت یاد ہے

اک بدیسی سے کیا تھا جس محبت کا سلوک
اے رینچن شاہ وہ اب تک محبت یاد ہے

کلمۂ توحید پڑھ لینا وہ دل کے شوق سے
اور اس کے ہاتھ پر کرنا وہ بیعت یاد ہے

جنت ارضی میں اول تو ہی نو مسلم ہوا
رفتہ رفتہ پھر ہوئی تیری رعیت یاد ہے

آگئے اسلام کے قبضہ میں آخر تخت و بخت
کفر کی کثرت پہ۔ وحدت کی حکومت یاد ہے

تضمین بر نظم مولانا صفی لکھنوی

دسمبر ۱۹۱۲ء کے جلسہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں مولانا صفی لکھنوی نے ایک پرجوش قومی نظم پڑھی بدیں ۱۳ دسمبر ۱۹۱۲ء میں اس پر تضمین لکھی۔ جو معہ نظم صفی ذیل میں درج ہے۔

غفلت کا اگر پردہ ہم دل سے اٹھا دیں گے — جو نقص کہ ابھرے ہیں ہم ان کو مٹا دیں گے
جب ہوش میں آئیں گے ہم ہوش اڑا دیں گے — زندہ ہیں اگر زندہ۔ دنیا کو دکھا دیں گے
مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے

چھیڑے نہ ہمیں کوئی یہ چھیڑ بہانہ ہے — اس سمت جو آئیگا سمجھو وہ روانہ ہے
سن بولنے والے سن لو سچا یہ ترانہ ہے — دھارے میں زمانہ کے بجلی کا خزانہ ہے
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دینگے

کہتا ہے جہاں سارا گو اب ہمیں بے چارا — بے چارے ہلا دیں گے اک دن یہ جہاں سارا
ہم آگ لگا دیں گے کہہ دیں گے جو وہ پارا — ہم سینہ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے

دل میں حرکت ہے کچھ یا محض ہے وہ ساکن — آئندہ ترقی ہے یا ختم ہیں اس کے دن
انسان ہیں یا حیواں ہم بوڑھے ہیں یا کم سن — ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے تو دو تم کو ہم یہ بھی بتا دیں گے

تو میٹ مٹانے کی لیکن ہے کوئی حد بھی — مانا کہ تجھے کد ہے تا چند مگر کد بھی
انسان ہیں انسانوں میں نیک بھی ہیں بد بھی — دنیا کے سمندر میں ہم جذر بھی ہیں مد بھی
دیکھو جو ہمیں روکا طوفان اٹھا دیں گے

ہمت تھی بلند اپنی تھے بحر میں با بر میں — سودائے ظفر کہتے تھے قلب و جگر سر میں
سیلاب تھے دریا میں طوفان سمندر میں — فاران پہ گرجے تھے برسے تھے جہاں بھر میں
گر کر جو ہمیں کڑکے پھر ہوش اڑا دیں گے

گو چاروں طرف اپنے ہنگامۂ محشر ہے — گو امت مرحومہ بے بال ہے بے پر ہے
گو دور تمول ہے گو پاس نہیں زر ہے — مرجھائی ہوئی کھیتی اب ہم ہیں تو کیا ڈر ہے
چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشو و نما دینگے

گو جانتے ہیں صدمے افلاک کے ٹوٹیں گے جو لوٹنے آئیں گے ہم خود انہیں لوٹیں گے
ہم جن کو دبوچیں گے ہرگز نہ وہ چھوٹیں گے جڑ ہم نے پکڑلی ہے کلے نئے پھوٹیں گے
گر خاک میں بھی ہم کو اک بار ملا دیں گے

ہستی کے سمندر میں طوفان اٹھا دیکھیں زردار غریبوں کو مٹی میں ملا دیکھیں
وہ ہم کو ستا دیکھیں وہ ہم کو جلا دیکھیں ایران ہو یا ٹر کی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دینگے

اسلام کے نعروں میں بجلی کی کڑک دی ہے سرد آہوں میں خالق نے شعلوں کی بھڑک دی ہے
جب ہم نے کئے حملے اللہ نے کمک دی ہے اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ ابھریگا جتنا وہ دبا دینگے

تڑپائیں گی عالم کو تحقیر کی آوازیں گرمائینگی ہر دل کو دلگیر کی آوازیں
اے گوش مقدر سن تدبیر کی آوازیں گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دینگے

پر جوش ہر اک رگ میں اس طرح لہو ہوگا چاک جگر دیں کا یوں ٹھیک رفو ہوگا
اے فوق جو یہ سوجھی پامال عدو ہوگا اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا
یہ نظم صفی پڑھکر ہم اس کو سنا دیں گے

اڈریانوپل کی واپسی

۱۹۱۴ء میں ترکوں نے جب یونانیوں سے اڈریانوپل واپس لے لیا۔ تو مسلمانان لاہور نے اس مسرت انگیز تقریب پر ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں مینے بھی مندرجہ ذیل نظم پڑھی ؎

ذرۂ ریگ کو وہ گوہر نایاب کرے وہ اگر چاہے تو تشنکدے کو آب کرے

تودۂ برف کو چاہے تو وہ سیلاب کرے　　دل شکستوں کو وہ چاہے تو ظفریاب کرے

دستِ بے پا سے تھے جو محروم سنبھلتے دیکھے

ہم نے غرقاب شدہ بیڑے اچھلتے دیکھے

قحط اک خوف سے چاہے تو وہ بیتاب کرے　　اور چاہے تو وہ ارزانی کے داباب کرے

تشنہ ہوں زمینیں انہیں سیراب کرے　　چمن خشک کو چاہے تو وہ شاداب کرے

تیر جستہ کو وہ چاہے تو کماں میں لائے

آب رفتہ کو ابھی جوئے رواں میں لائے

ماہ سے ماہی کا مالک ہے نگہبان ہے وہ　　صاحب فقر کہیں ہے کہیں سلطان ہے وہ

غیب سے بے سروسامانوں کا سامان ہے وہ　　درد کیا چیز ہے جب مائل درمان ہے وہ

اپنے بندوں کو وہ کیا جانئے کیا دیتا ہے

عین مایوسی میں امید بندھا دیتا ہے

تازہ اک منظر قدرت ہے نمایاں دیکھو　　ایزد غالب و ناصر کی نئی شان دیکھو

پہلے تمہید ستم نامۂ بلقاں دیکھو　　بعد میں خاتمۂ خجلت و خسراں دیکھو

ہاں رہائی ہے گرفتار بلا ہو جانا

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

جب دغاباز شرارت سے دغا کرتا ہے　　یا جفاکار کوئی جور و جفا کرتا ہے

اپنے حق میں وہ حقیقت میں برا کرتا ہے　　فوق مظلوم کو ظالم پہ ملا کرتا ہے

نہ کرے دہر میں انساں نہ کرے کام برا

ہر برے کام کا ہوتا ہے سرانجام برا

ڈوب کر مہر نئے سر سے نکل آتا ہے　　آسماں اختر گم گشتہ کو چمکاتا ہے

سبز ہو جاتا ہے جو برگ کہ مرجھاتا ہے　　خشک ہوتا ہے جو سبزہ تو تری لاتا ہے

قدرت حق سے تو ہو جاتی ہے ہر مشکل حل
کیا سبب ہے کہ نہ لیں ترک ایڈر یا لوپل

کشمیر ہے اک شیر

دھندلا سا نہ کیوں قوم کا ہو چہرۂ روشن
آئینۂ دل داغ مصائب سے ہے کالا

بے یار و مددگار کی جو بار رہی ہے
اس قوم کا اب کوئی نہیں پوچھنے والا

جس قوم میں تھے جمع ذہانت کے خزانے
اس قوم کا صد حیف کہ نکلا ہے دوالا

اس علم کا اب جاننے والا نہیں کوئی
جس علم نے ایران سے صاحب کو نکالا

اس قوم کی رفعت کو ہے پستی سے ندامت
جس قوم کی پستی تھی کبھی تا بہ ہمالا

اس قوم کو اب ٹکڑا زمین کا نہیں ملتا
جو قوم کبھی لیتی تھی ملکوں کا قبالا

ناقابل افواج ہیں اس قوم کے فرزند
جس قوم سے محمود کا بھاگا تھا رسالا

وہ قوم بھی کیا خون رگوں میں نہیں رکھتی
جس قوم کے چہرے سے پشیمان ہو لالا

پرچم کبھی لہرایا ہے پنجاب میں اپنا
ڈیرا کبھی افواج نے لنکا پہ ہے ڈالا

برسوں ہی رہا تبت و قندہار پہ قبضہ
تاریخ کو پڑھ۔ گر تجھے بننا ہے حوالا

اکسیر کو تقدیر نے گو خاک بنایا
یہ خاک بنا دے گی کبھی جم کا پیالا

پنجاب میں آئے تو ہوئے نازش پنجاب
بنگال میں جا کر بنے نواب بنگالا

جو خوبیاں اپنی ہیں نظر آئیں گی تجھ کو
جب دور کبھی ہوگا۔ تری آنکھ کا جالا

کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے
جاگیگا تو مشکل ہے وہ جائیگا سنبھالا

جس دم وہ دہاڑے گا تو گونج اٹھیگی دنیا
لرزیگی زمیں ہوں گے سمندر تہ و بالا

ہم فوق ہیں اور فوق رہیگا ہمیں سب پر
کچھ غم نہیں گر گردش نے جو چکر میں ہے ڈالا

۵ سنہ ۱۹۱۲ء بر جلسہ مسلم کشمیری کانفرنس بمقام سیالکوٹ۔

سچّا سوُدا

بابا نانک صاحب کے ایک واقعہ کے متعلق

حسب فرمائش سردار رام سنگھ صاحب مالک و ایڈیٹر اخبار لائل گزٹ (حال شیر پنجاب) ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۷ء کی صبح کو پانچ سے چھ بجے کے درمیان یہ نظم لکھی گئی۔

دولت دنیا کی خاطر اے دلِ دولت طلب
تُو نے بازارِ جہاں میں کی خریداری بہت

بہرِ دُنیا دین کو تُو نے گنوایا ہاتھ سے
کی تری عالم فریبی نے ہے مکاری بہت

نفع کی خاطر چلا تھا گھر سے اے غافل مگر
تجھکو حاصل ہو گئی آخر زیاں کاری بہت

اس سے بڑھکر کوئی بیہوشی و غفلت ہی نہیں
جس کو تو سمجھا ہے بیداری و ہشیاری بہت

اس قدر بھی کیا کہ جب دیکھو ہوس دنیا کی ہے
فکر کر دیں کی کہ کام آئے گی دینداری بہت

زر دیا اللہ نے تجھکو کر اس کے نام پر
کچھ مدد اس کی بھی کر جو ہے و قفِ ناداری بہت

چھوڑ کر اپنی خوشی جو غیر کو کرتے ہیں خوش
ایسے سودے کے بھی ہیں دنیا میں بیوپاری بہت

اے کہ فخر و ناز تیرے نام پر توحید کو
اے کہ یکساں ہندو و مسلم ترے دربار میں

اے کہ ہے نام مبارک لفظ نانک سے عیاں
اے کہ تیرے خلق کی خوشبو ہر اک گلزار میں

ظلمت و الحاد کے چھائے تھے جب بادل سیاہ
برق مضطر تھی ترے دیدار پُر انوار میں

جس زمانہ میں بہ شکل راہزن تھے رہنما
تو نے اک سچا کیا سودا بھرے بازار میں

باپ نے کچھ زر دیا تجھکو تجارت کے لیے
تا کرے ساماں تو کچھ جمع طبیعت کے لیے

بیٹے کے دھندول کا تجھ پر ابتلا آکر پڑا
اس جوانی میں کہ جو تھی عیش و عشرت کیلئے

راہ میں دیکھے مگر جب بھوکے اور ننگے فقیر
دل میں تیرے رحم آیا ان کی غربت کیلئے

جس قدر زر تھا وہ ان کو دیدیا بہرِ خدا
تاکہ ہو وجہ کفایت ان کی حاجت کیلئے

کر کے یہ ایثار تو نے ایسی قائم کی مثال
جو چراغِ راہ ہے رشد و ہدایت کے لئے

غیر کی تکلیف پر کی اپنی آسائش نثار
رنج تو سہتا رہا اوروں کی راحت کیلئے

سیاحت کشمیر کا پانچواں کلام

پری محل کا نظارہ

سری نگر سے چشمہ شاہی کو جاتے ہوئے ذرا بلندی پر شاہجہانی عہد کی ایک عمارت پری محل کے نام سے موسوم ہے جس کو دارا شکوہ نے جو شاہجہان کا فرزند اکبر تھا تعمیر کرایا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ دارا شکوہ کا کتب خانہ تھا۔ کوئی اس کو رسدگاہ بتاتا ہے کسی کا خیال ہے۔ شاید دارا شکوہ کی کسی بیگم کا نام پری بانو ہو اور اس کے نام پر پری محل آباد کیا گیا ہو۔ ابھی تین سو سال کا عرصہ بھی نہیں گذرا۔ لوگ اصل بات کو بھول گئے ہیں۔ اب مختلف قیاسات سے کام لیا جا رہا ہے۔

یہ عمارت مغلیہ عمارتوں کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ اس کے تین طبقے ہیں۔ فواروں اور حوضوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ دیواروں کے کھنڈر بھی "تعمیر او معمار" دونوں پر نوحہ کناں ہیں۔ اس وسیع عمارت کے سب سے نچلے طبقہ میں قدِ آدم گھاس اُگا ہوا تھا۔ میں معہ اپنے چند احباب کے ستمبر ۱۹۱۵ء میں اس کو عبور کرتا ہوا اس اجاڑ محل کی چوٹی پر پہنچا اور وہیں چند شعر موزوں ہو گئے۔

پستیٔ دنیا نظر آئے جو اوجِ کوہ سے
ماہ سے تا پھر بہ ماہی یوں انساں کوئی نہو

امتیازِ مذہب و ملت نہ ہو کوئی وہاں
شورشِ آوازِ ناقوس و اذاں کوئی نہو

سنگریزوں کے سوا "کنکرہ" نہ ہو کوئی وہاں ‏ اشک چشم تر تو ہو چشمہ رواں کوئی نہ ہو
برف کی چادر ہو سر پر گھاس کا ہو فرش خواب ‏ اور پتھر کے سوا تکیہ وہاں کوئی نہ ہو
رنج و راحت کا کوئی جھگڑا نہ ہو جس دیس میں
جس جگہ گل ہے چنیں گا ہے چناں کوئی نہ ہو ‏ ناتمام

سیر کشمیر کو بہتر تھا نہ آیا ہوتا

۲۶ستمبر ۱۹۱۵ء کو میں بارہ مولا سے واپس لاہور روانہ ہوا۔ ہمارا ٹانگہ (اس زمانہ میں موٹریں اور لاریاں نہ تھیں) شام کو اوڑی پہنچا۔ رات وہاں بسر کی۔ ۲۷ستمبر کی صبح کو چار بجے اوڑی سے روانہ ہو گئے۔ چاندنی رات تھی۔ خاموشی کا عالم تھا۔ اوڑی سے چکوٹھی کے درمیان اس شدید سردی کے باوجود طبیعت میں حرارت و حرکت پیدا ہوئی اور ٹانگہ میں بیٹھے ہوئے مندرجہ ذیل نظم لکھی گئی؎

فرق ملّت کا اگر تو نے مٹایا ہوتا ‏ بت کدہ میں تجھے اللہ نظر آیا ہوتا
ہم نے قرآن کو لیڈر جو بنایا ہوتا ‏ راستہ خضر کو بھی ہم نے بتایا ہوتا
میری قسمت میں جو تھی آتش دوزخ کی جلن ‏ ساکن جنت ارضی نہ بنایا ہوتا
کفر اسلام کا اس طرح اڑائے خاکہ ‏ میری آنکھوں کو یہ نقشہ نہ دکھایا ہوتا
اضطراب دل مجروں نے قیامت ڈھائی ‏ سیر کشمیر کو بہتر تھا نہ آیا ہوتا
میرے واعظ کو کوئی جا کے سنا دے یہ پیام ‏ شہ سلیماں سا کبھی وعظ سنایا ہوتا
کشتئ انجمن قوم ہے اب خطرہ میں ‏ اس کو طوفان حوادث سے بچایا ہوتا
حسد و بغض کے داغوں سے ہیں دل جن کے سیاہ ‏ ایسے سکوں کو کبھی تو نے مٹایا ہوتا

؎ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری شریف ضلع پٹنہ

دیکھتا چشم تحیر سے تو پرواز مری — چٹکیوں میں نہ اگر مجکو اڑایا ہوتا
دیکھتا آئینۂ دل کو۔ تو ہاں اُسنے تجھے — جام جمشید سے کچھ بڑھکے دکھایا ہوتا
میرزا سعدؔ سا شاعر کوئی ہوتا پیدا — جس نے پھر در در سیدوں کو رلایا ہوتا
یوں تو اے آہ زمانہ کو جگایا تو نے — خفتۂ روز ازل کو بھی جگایا ہوتا
تاج محتاج کو افسردگی افسر کے لیے — بُت خود بیں کو بھی اے دل یہ بتایا ہوتا
کون تھا ایسا جو پھر پیچھے ہٹاتا تجھکو — گر قدم تو نے کبھی آگے بڑھایا ہوتا
پھر رسلؔ شاہ سا کشمیر میں ہوتا کوئی — جس نے پنجاب کو سینے سے لگایا ہوتا

اے فلک فوقؔ بھی کچھ دیکھتا دنیا کے مزے
قید سے رنج و محن کے جو چھڑایا ہوتا

نظم شادی سر راجہ ہری سنگھ ولی عہد کشمیر حال فرمانروائے جموں و کشمیر

سر راجہ ہری سنگھ ولی عہد ریاست جموں و کشمیر (جو آج ہز ہائنس مہاراجہ بہادر آف جموں و کشمیر ہیں) کی دوسری شادی ریاست چمبہ کی راجکماری سے ہوئی۔ یکم نومبر ۱۹۱۵ء سے ۴ نومبر ۱۹۱۵ء تک جموں میں عیش و عشرت کا بازار گرم رہا۔ ہز ہائنس میجر جنرل سر پرتاب سنگھ فرمانروائے ریاست اور دیوان امرناتھ سی آئی ای وزیر اعظم تھے۔ مجھے بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔ پر یڈ

۱؎ میرزا سعد الدین سعدؔ جو کشمیر میں اردو فارسی کے بے مثل شاعر تھے وزیر وزارت کے عہدہ پر بھی ممتاز رہے ہیں مولانا شبلی نعمانی سے آپکی مخلصانہ خط و کتابت رہی ہے کشمیر میں مولانا شبلی آپ ہی کے پاس ٹھہرے تھے۔

۲؎ مولوی رسل شاہ میر واعظ مرحوم جو انجمن نصرت الاسلام سرینگر اور اسلامیہ ہائی سکول سرینگر کے بانی تھے۔

میں مہمانوں کے قیام کا انتظام تھا۔ وہیں میں نے بطور تہنیت چند اشعار لکھے۔ یہ تہنیت نامہ نہ سر راجہ صاحب کو پیش کیا گیا اور نہ کسی اخبار میں چھاپا گیا۔ اب مجموعہ کلام میں شامل کیا جاتا ہے

تیری مٹی میں ہے لے جموں[1] خمیر انصاف کا
تیرے بانی[3] میں نظر آیا ضمیر انصاف کا

دے رہا ہے تیرا دریا یہ صدا مثل سروش
شیر و بز تیرے ہی ساحل پہ رہے ہیں آب نوش

اے گل گلزار جموں لے توی کی موج آب
تجھ میں بل رنجیت[2] دیو کا تجھ میں خوشبوئے گلاب[3]

شیرخواری میں بھی ہر بچہ ترا رنبیر[4] ہے
خاک وہ دیکھی تری جو رشک صد اکسیر ہے

جب خمیدہ سے ترا پرتاپ[5] دیدہ ہو گیا
آسماں بہر قدمبوسی خمیدہ ہو گیا

سوکھتے دیکھے بہت سے وکمال آرزو
پر ہری[6] دیکھی تری شاخ نہال آرزو

---

[1] راجہ جامبو لوچن جس کے نام پر جموں آباد ہے۔ یہ راجہ ایک دفعہ اسی پہاڑی پر سیر کو آیا یہاں توی کے کنارے شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پیتے دیکھا۔ اور اس کو مبارک فال سمجھکر یہاں اپنے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ جو اب جموں کے نام سے مشہور ہے۔

[2] راجہ رنجیت دیو جو جموں کا ایک نامور راجہ گذرا ہے۔

[3] مہاراجہ گلاب سنگھ آنجہانی جو مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر موجودہ فرمانروائے ریاست کے پردادا اور حکومت ڈوگرہ کے بانی تھے۔

[4] مہاراجہ سر رنبیر سنگھ آنجہانی جموں و کشمیر کے ایک باقتدار بارعب اور علم پرور حکمران گذرے ہیں۔

[5] مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ آنجہانی جنہوں نے ۴۰ سال کی حکمرانی کے بعد ۱۹۲۵ء میں بمقام سرینگر کشمیر انتقال کیا۔

[6] موجودہ مہاراجہ کشمیر ہزہائنس مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر جو سر راجہ امر سنگھ آنجہانی کے اکلوتے فرزند مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے برادرزادہ اور مہاراجہ سر رنبیر سنگھ کے پوتے ہیں۔ مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ لاولد تھے۔

ہم نے دیکھی ہیں یہاں اکثر چمن آرائیاں — آج ہیں لیکن غضب کی انجمن آرائیاں

ہے شفا خانہ کے پاس آباد اک خیموں کا شہر — دید کے قابل ہے اس کی رونق اسکی بہر بہر

آج ہے شادی ولیعہد بلند اقبال کی — خانہ آبادی ولی عہد بلند اقبال کی

یہ وہ شادی ہے کہ جس شادی سے ہیں دل شاد شاد — دے رہے ہیں شوق سے جس پر مبارکباد سب

دیکھنی ہو جس کو کچھ جنت کے گلشن کی بہار — آئے اور وہ دیکھ لے منڈی[1] کے جوبن کی بہار

تہنیت نامے لکھے اوروں نے اجرت کیلئے
فوق نے لکھا ہے اظہارِ عقیدت کیلئے

قطعہ تاریخ وفات پیر سید حیدر شاہ صاحب جلالپوری

۱۳۳۶ھ میں حضرت پیر سید حیدر شاہ صاحب جلالپوری کا وصال ہوا۔ فروری ۱۹۱۶ء میں ملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر رسالہ صوفی پنڈی بہاؤالدین نے جو حضرت مغفور کے مریدوں میں ہیں لکھا کہ میں حضرت مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں ان کی وفات کا قطعہ تاریخ لکھ دو ان کی فرمائش سے میں نے حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا۔ جو اپریل ۱۹۱۶ء کے رسالہ صوفی میں چھپ چکا ہے۔

اے پیر شاہ حیدر اے ذوالفقار حیدر — مجموعۂ کرامت تھی تیری زندگی بھی

تو تھا فروغ دنیا تو تھا قرار جاں ہا — تو چل بسا تو رخصت اپنی ہوئی خوشی بھی

فیض کرم سے جس کے تھے تلخ کام شیریں
مغفور آج ہے وہ شیریں سخن دلی بھی

۱۳۳۶ھ — ۱۳۳۶ھ

[1] منڈی جہاں شاہی محلات ہیں۔ موجودہ مہاراجہ سر ہری سنگھ نے اس کا نام دربار گڑھ رکھا ہے۔

جلسہ انجمن خدام الصوفیہ کی نظمیں

۹۔ مئی ۱۹۱۶ء کو انجمن خدام الصوفیہ علی پور ضلع سیالکوٹ کا جلسہ تھا۔ مجھے بھی سکرٹری صاحب اور حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب قبلہ نے ایڈیٹر رسالہ طریقت کی حیثیت سے یاد فرمایا۔ میں نے وہاں دو نظمیں پڑھیں۔ ایک بہ طرز غزل اور ایک آنکھ کے مضمون پر۔ دونوں ذیل میں درج ہیں۔

مے بھی موجود ہے ساقی بھی ہے دلدار بھی ہے
رنگ محفل بھی ہے اور مجمع مے خوار بھی ہے

بزم یاران طریقت کی بھی ہے دھوم بہت
چشم مشتاق بھی ہے اور رخ یار بھی ہے

میں کہاں جاؤں بتا خضر طریقت مجھ کو
پاس مسجد بھی ہے اور خانۂ خمار بھی ہے

بندۂ زلف کو محشر میں نہ رسوا کرنا
یہ سیہ کار بھی ہے اور گنہ گار بھی ہے

حسن جاں صدقے ہے جو چھوڑ ادائیں اس کی
رنج بھی دیتا ہے اور مونس و غمخوار بھی ہے

نظر لطف کی امید نہ کیوں کر ہو مجھے
تیری آنکھوں میں مروت بھی ہے اور پیار بھی ہے

گو لٹا بیٹھا دل زار متاع ہستی
پر زلیخا کی طرح تیرا خریدار بھی ہے

بیخبر دین سے دنیا سے ہے ناواقف فوق
یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ صاحب اخبار بھی ہے

چشم وحدت نگر

(در جلسۂ انجمن خدام الصوفیہ علی پور ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء)

ذرۂ مہر در بغل اے چشم
قطرۂ بحر آشنا ہے تو

یعنی اس بزم گاہ جلوت میں
آئینہ دار دلربا ہے تو

ناظرِ یک جہاں ضیا ہے تُو
خود بھی اک شوخ عشوہ زا ہے تو

چشمِ وحدت نگر خطاب ترا — دیکھ پتے ہیں گلستانوں کو
جو ازل سے عطا ہوا ہے تجھے — نہ دلوں کو ملا نہ جانوں کو
کس دل افروز پر فدا ہے تو
کیوں تحیّر میں مبتلا ہے تو

ایک میں ہے ہزار پوشیدہ — یعنی کثرت نہفتہ در وحدت
ہے تو اک عضوِ بے بساط مگر — نگرانِ مظاہرِ قدرت
عکسِ انوارِ کبریا ہے تُو
روشن آئینِ پر صفا ہے تُو

رازدانِ تصوّرِ ازلی — محرمِ سرِّ جلوہ ابدی
مستفیضِ لقائے مصطفوی — منظر آرائے وحدتِ صمدی
مخبرِ ارض یا سما ہے تُو
کیا کہوں تجھ کو میں کہ کیا ہے تُو

بستگی و کشادگی میں بھی — جُز تجلّائے حُسنِ یار نہ دیکھ
اک تصوّر ہو اک خیال ہو صرف — ماسوا اس کے چشم زار نہ دیکھ
ہے جو یہ وصف تو بجا ہے تو
ورنہ بیکار و ناسزا ہے تُو

تو ہے موجود اگر تو چیز ہیں کیا — حور و غلماں ہوں یا کہ جن و ملک
یاوری سے تری پہنچتا ہے — ہر بشر منزلِ حقیقت تک

رہِ عرفاں میں مقتدا ہے تو
جادۂ قلب حق نما ہے تو
بے خودی میں بھی کر خودی پیدا دوپہر میں بھی تو زوال کو دیکھ
تیرہ بختی کا کیا گلہ غافل اخترِ قسمتِ بلال کو دیکھ
با محمد ہے با خدا ہے تو
سارے عالم کی رہنما ہے تو
ہاں اٹھا دے یہ پردۂ مژگاں شش جہت میں اسی جمال کو دیکھ
جوہر جام جم سے ہے لبریز اپنے ہی ساغر سفال کو دیکھ
اہل بینش کا مدعا ہے تو
دلکشا اور جاں فزا ہے تو
مرحبا اقتباس لمعہ حسن حبذا انعکاس جلوۂ یار
کام تیرے صحیح ہیں سارے گو ہے کہنے کو نرگسِ بیمار
سر بسر نسخۂ شفا ہے تو
دم عیسے نہیں تو کیا ہے تو
گر مئے یک نگاہ سے دم میں ساز کثرت کو پھونک دیتی ہے
کچھ بصارت سے کچھ بصیرت سے جز دیں گل کو دیکھ لیتی ہے
مِلِ وحدت سے سرمہ سا ہے تو
من و تو دونوں سے ورا ہے تو
بے نشاں کا نشاں تجھے معلوم لامکاں تک تری رسائی ہے
نیست کو ہست سے ملا دینا ہاں یہی شان رہنمائی ہے

رہبرِ جادۂ ہُدا ہے تُو
درس آموزِ اقتدا ہے تُو

دل کو محوِ خیالِ یار بنا سر میں سودائے شوق پیدا کر
شہر و سنگ۔ ہر ذرہ ہے حُسن اے چشمِ فوق پیدا کر

ناظرِ جلوۂ خدا ہے تُو
زائرِ روئے مصطفےٰ ہے تُو

(کشمیر سے واپسی پر ستمبر ۱۹۱۷ء میں بمقام کوہ مری)

خاموش رہ کہ شور کرا ے دل تیری خوشی فریاد کا تو ڈھب تجھے ہم نے بتا دیا
اللہ دے سمجھ تو پھرن[1] کو اتار دو
گھٹنوں کے بل جوانوں کو جس نے بٹھا دیا

گرو نانک صاحب

سردار امر سنگھ ایڈیٹر لائل گزٹ (حال اخبار شیر پنجاب) لاہور نے ۱۵ نومبر ۱۹۱۹ء کو بابا نانک صاحب کے متعلق ایک نظم لکھنے کی تحریک کی۔ ۲۰ نومبر کو میں نے چند شعر اپنی بیاض سے لئے۔ اور کچھ نئے لکھے۔ یہ نظم ۲۵ نومبر ۱۹۱۹ء کے لائل گزٹ کے خاص نمبر میں چھپ چکی ہے۔ اب مجموعہ کلام میں شامل کی جاتی ہے۔ ؎

قلم ترچ کر وصفِ نانک رقم نہ کر غور کچھ۔ کر اپنا نک رقم
گدا اور شہ جس کو یکساں رہے رفاقت میں ہندو مسلماں رہے
پڑی جس پہ اس کی نگہ بن گیا جو آیا یہاں بادشہ بن گیا
جو پھیلایا دامن تو زر لے گئے
صدقت سے کرم کے گہر لے گئے

[1] کشمیر کے ہندو مسلمانوں کا لباس جسکو تعلیم یافتہ جماعت اب ترک کر رہی ہے۔

نہ کیوں جلوہ نور آتا نظر — کہ ظلمت تھی چھائی رخ صاف پر
تماشائے چشم بتاں کا تھا دور — خدا کا کہاں این و آں کا تھا دور
پناہ کی جگہ پیش دستی کا زور — خدا کی جگہ بت پرستی کا زور
کہیں شور مردم پرستی کا تھا — کہیں ذکر رندی و مستی کا تھا
غرض ہر جگہ تھیں سیہ کاریاں — کہ تھیں غرق مے سب کی بیداریاں
جدائی کی بانی ہوئی ذات پات — مسلماں سے ہندو کو تھی چھوت چھات
اسی عہد میں آئی وہ ذات پاک — بنی طوطیا جس کے قدموں کی خاک
اسے پیار تھا اپنے بیگانہ سے — تھی الفت اسے شمع و پروانہ سے
وسیع الخیالی کی کچھ حد نہ تھی — یہی روح تھی جو مقید نہ تھی
گرو بابا نانک اسی کا تھا نام — جو دیتا تھا صہبائے وحدت کے جام
اسی نے مٹائیں رسومات شرک — زمانے سے کیں دفع آفات شرک
فسادات کے اس نے مٹائے بہت — جو آن مل تھے۔ باہم ملائے بہت
خدا کی طرف سب کو مائل کیا — دلیل اور برہاں سے قائل کیا

بناتے تھے پتھر کو جس کا شریک
بتایا وہ ہے وحدہٗ لاشریک

۱۹۱۸ء کی سیاحت کشمیر کا کلام

شاہی مجوزہ کے ابتدائی زمانہ کی نظمیں

۱۹۱۸ء میں کشمیر میں سر راجہ دلجیت سنگھ چیف منسٹر۔ خان بہادر چوہدری خوشی محمد ناظر منسٹر مال اور رائے بہادر پنڈت نریندر ناتھ گو. نرو رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹیز تھے۔

شمالی مجوزہ کا زمینداروں پر زور تھا خلق خدا مجوزہ کے جبر وستم سے نالاں تھی۔ اور مجوزہ کی آڑ میں پنڈت صاحب کے ماتحتوں کی ایک جماعت بڑے بڑے زمینداروں کی حسب طرح آبروریزی کرتی تھی۔ اس کے خلاف زبان وقلم دونوں کو نظر بند کر دیا گیا تھا میں نے دیہات میں پھر کر ہر زمیندار کو اپنی عزت وآبرو بلکہ ننگ وناموس تک کا شاکی پایا۔ مندرجہ ذیل دو نظمیں انہی تاثرات وخیالات کا نتیجہ ہیں۔ یہ دونوں نظمیں اگست ۱۹۱۵ء کے مختلف ایام میں مختلف مقامات پر لکھی گئیں ؎

جب خزانِ پرفتن تیرے طویلے سے کھلے — چھ گئے میری امیدوں کی چراگاہیں تمام
خنجر خانہ تلاشی سے مجھے بسمل کیا — بال و پر نوچے مرے۔ توڑیں مری بانہیں تمام
ان بتانِ سنگدل کا دل نہ گرمایا ذرا — گوگئیں عرش معلےٰ پر مری آہیں تمام
جس جگہ جا کر چھپا آخر میں پکڑا گیا — میرے حق میں تھیں پناہیں بھی کمیں گاہیں تمام
تو گیا جن راستوں سے میری شالی لوٹ کر — کلٹے کو کیوں نہ دوڑیں تجھکو وہ راہیں تمام

اک تمل[1] کے دانہ کو ترسیں مرے اہل وعیال
عیش اڑائیں تیرے کدلوں[2] کی گذرگاہیں تمام

ایک زمیندار کا خطاب اتحادی بنکوں کے ایک افسر کے نام

تیری رشوت کی کمائی اور مرا رزقِ حلال — تیری گھڑیاں عیش کی مغموم میرے ماہ وسال

---

[1] تمل۔ چاول
[2] کدل کشمیر میں پل کو کہتے ہیں۔

خاکِ تاشہ وانؔ[1] کی سر پر ترے اے ارشاد تو — نعمتیں گھر کی میسر تجکو اور وقفِ ملال
تجھ کو مسجد سے رہا ابلیس کی مانند بیر — خدمتِ مسجد میں حاضر ہیں سدا مثلِ بلال
تیری خوئے بد سے نالاں اپنے بیگانے تمام — خلق میرا خلقِ آنحضرت کی اک ادنیٰ مثال
وقف تیری زندگی مکر و خوشامد کے لئے — مجھ سے آزادی و خودداری کی قائم ہے مثال
تو کہ تجھ سے افسر و ماتحت سب ناراض ہیں — ہم کہ تجکو دیکھکر چھوٹے بڑے سب ہیں نہال
تو کہ زر رکھکر بھی کچھ دیتا نہیں نامِ خدا — ہیں کہ ناممکن مجھے عزت میں بھی ردِّ سوال
بنک کا مقصد زمیندارں کا تھا بہبود و سود — پر دیا تو نے زمینداروں کا دیوالہ نکال
گر انہیں بے سود کچھ قرضہ ملا بھی بنک سے — تیری خود رائی سے آخر ہو گیا ان کو وبال
یعنی دُگنے بیاج پرے گر انہیں دینا پڑا — ایسی "بے موقع طلب" سے ہو گئے یہ سب نڈھال
بنک نے سب ابرِ رحمت تو نے زحمت کر دیئے — اے بدوں کے یارِ غار اے بد سرشت اے بد خصال
تو نمکداں پھوڑ دیتا ہے نمک کھانے کے بعد — اپنے محسن کو دعا دیتا ہے میرا بال بال
دیکھکر تجھکو زمینداروں کا خوں ہوتا ہے خشک — ابرِ رحمت کی مری طلعت سے لیتے ہیں وہ فال
الوداع سن کر تری آتی ہے ان کے تن میں جان — میری فرقت سے فراقِ جان و تن سے ہوں نڈھال

حال تیرا خوب تر اعمال تیرے زشت تر
اس کی قدرت میں نہیں دم مارنے کی کچھ مجال

[1] جس طرح لاہور کا بازار شیخو پوریاں اور اس کے ملحقات تبتی کہلاتے ہیں. جو حسن فروشوں کا مسکن ہیں.
اسی طرح سرینگر میں فتح کدل کا ایک حصہ تاشہ وان کہلاتا ہے۔

ڈھاکہ بنگال کے مچھر

میں جولائی و اگست ۱۹۱۹ء میں قریباً ایک ماہ تک اپنے کرم فرما خان بہادر خواجہ محمد اعظم صاحب رئیس ڈھاکہ سابق ممبر لیجسلیٹو کونسل بنگال کا مہمان رہا۔ وہاں ہر قسم کی راحتیں اور نعمتیں میسر تھیں۔ مگر ایک چیز وہاں ایسی تھی جس سے ڈھاکہ کے کسی فرد بشر کو نجات نہ تھی یہ بلا ڈھاکہ کے مچھروں کی تھی۔ جو باوجود مچھر دانیوں کی فصیل کے دست و گریباں ہو ہی جاتی تھی۔ ۱۰۔ جولائی ۱۹۱۹ء کی صبح کو ۷½ بجے یہاں کے مچھروں کی یادگار میں مندرجہ ذیل نظم لکھی گئی۔

نمرود کی طرح نہ کیا تھا کبھی غرور
کیوں تنگ کرتے ہیں مجھے مچھر تمام رات

بیدار طالعی میں مری شک ہے وجہ کفر
ڈھاکہ میں آکے جاگتا ہوں اکثر تمام رات

آزاد ہی رہے یہ نہ دام آکے بھی
اڑتے رہے مسہری کے اندر تمام رات

رکھا سنان نیش نے شب بھر گریز پا
خالی پڑا رہا مرا بستر تمام رات

تنہا ادھر میں اور ادھر فوج پشگاں
کس طرح ان سے لڑ سکوں جمکر تمام رات

اک جان ناتواں پہ ستم ہائے بیشمار
گویا بنا رہا ہوں میں ہمیسر تمام رات

ننھی سی جان کو ملے گز بھر کی یہ زبان
مچھر اٹھائے شورش محشر تمام رات

کچھ خون کا فساد بدن میں مرے نہ تھا
لگتے رہے ہیں کیوں مجھے نشتر تمام رات

ممکن نہیں کہ نیش سے پشہ کے ہو نجات
چھڑکو ہزار آئیل و پوڈر تمام رات

جب آئے قصد خوں کیلئے کر دیئے ہلاک
سینی رہا ہوں دست بہ خنجر تمام رات

دشمن حقیر بھی ہو تو سمجھو نہ تم حقیر
جاری رہا یہ مصرع زباں پر تمام رات

ڈھاکہ کی برسات سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ کوئی دن بارش سے

خالی نہ جاتا تھا۔ ۲۴۔ جولائی ۱۹۱۹ء کو بارش کے دوران ہی میں یہ چار شعر زبان پر جاری ہو گئے۔

تماشا ہے یہ اک نیرنگیٔ عالم کا عالم میں
مرا مختار ہو جانا ترا مجبور ہو جانا

جو مادر زاد نابینا تھے اب وہ اہل بینش ہیں
مناسب اہل بینش کا ہے اب مستور ہو جانا

نمونہ ہجر و وصل دوست کا ہے زندگی اپنی
کبھی مسرور ہو جانا کبھی رنجور ہو جانا

جہاں سنتے ہیں ہوتی ہے رسائی تک بھی مشکل سے
مبارک فوقؔ کی عرضی کا واں منظور ہو جانا

بلیک اینڈ وائٹ

ریلوے سائیکل ورکس (لاہور نکلسن روڈ) کے بانی ہمارے دوست خواجہ فضل الٰہی صاحب ہیں جن کی دوکان آج نذیر برادرس کے نام سے اسی سڑک پر محنت اور استقلال کی وجہ سے کامیابی کی ایک روشن دلیل ہے ان کے متصل ہی "بمبئی ہیر کٹنگ سیلون" کے نام سے مسٹر محمد اسمعیل باربر کی فیشن ایبل دوکان ہے ۱۹۱۹ء میں مالک دوکان نے مس وائٹ کے نام سے ایک نوخیز خوبصورت یورپین لڑکی کو زنانہ برانچ یعنی میم صاحبات کے بال سنوارنے کے لئے ملازم رکھا۔ ایک دوست مس وائٹ کو دیکھکر ریشہ خطمی ہو گئے ربط ضبط بڑھایا تو بہت کچھ۔ کچھ بے تکلفی بھی پیدا کر لی۔ مگر سرکار حسن نے عشق کی گستاخیوں کو اس سے آگے قدم اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ مجھے اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ تو میں نے بلیک اینڈ وائٹ یعنی سیاہ و سفید کے عنوان سے مندرجہ ذیل اشعار لکھے اتفاقاً گل میں جا نکلا نکلسن روڈ پر
جس جگہ تھے جمع کچھ نظارے سائٹ کیلئے

بمبئی ہیر کا سر راہ اک وہاں سیلون ہے
شب تو شب جو وقف ہے دن کو بھی لائٹ کیلئے

اک مس کم سن گرہ ہے مست شباب حسن عشق
بوالہوس مرتے ہیں جس پر اپنے رائٹ کے لئے

ے نظرے، دشتی کے حق۔

جب اسے دیکھا جبینِ ناز پر بل آ گئے — گفتگو جب کی ہوئی تیار فائٹ کے لئے
تخلیہ چاہا تو فرمایا کہ قدرِ خود شناس — لڑائی ؎
کوششیں بیکار ہیں کالے کی وائٹ کیلئے

سیر کوہستان جمّوں

سنہ ۱۹۲۰ء میں قاضی امام الدین[۱] بٹ مرحوم ریٹائرڈ افسر بلا ورڈ ڈویژن اور شیخ غلام محمد[۲] صاحب ایم اے۔ ایم۔ او۔ ایل منصف رام نگر کی تحریک سے میں رام نگر کی سیر کو روانہ ہوا اور ۱۶ اگست کو جموں پہنچا۔ ان دنوں کشمیر اور جموں اور پنجاب کے مختلف مقامات پر دودھ اور گوشت کی گرانی کی وجہ سے حلوائیوں اور قصائیوں کے بائیکاٹ کا بڑا چرچا تھا اور اس بائیکاٹ میں ہندو مسلم سکھ سب شامل تھے۔ انہی دنوں جموں میں بھی ایک جلسہ تھا جب میرے بعض احباب[۳] کو میرے جموں آنے کا علم ہوا۔ تو انہوں نے باصرار ایک نظم کی فرمائش کی۔ چنانچہ ۱۸ اگست کو جموں ہی میں میں نے ہندو مسلم اتحاد پر ایک نظم لکھی جو پرتاپ ڈوگرہ ہال کی وسیع گراؤنڈ میں دس بارہ ہزار کے مجمع میں پڑھی گئی۔ اور پسند کی گئی۔

وہ ہوا جس کی تولید ہوئی کشمیر کے چمنستانوں میں
وقت آ ہی گیا کہ آ پہنچی جموں کے کوہستانوں میں
ہندو مسلم کا شیرازہ کچھ اور بھی ہو مضبوط اگر
مضبوط رہیں سب دھرموں پر اور ضعف نہ ہو ایمانوں میں

---

[۱] ان کے چھوٹے بھائی قاضی محمد نظام الدین جو ان دنوں طالب علم تھے اب بی اے ایل ایل۔ بی ہو کر راجوری جموں میں منصف ہیں [۲] شیخ صاحب آجکل صوبہ جموں کے ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز ہیں۔
[۳] بالخصوص منشی محمد الدین صاحب نقشبندی سابق سپرنٹنڈنٹ انجمن اسلامیہ جموں

ان شمع وطن کے پروانوں کو اور نگت کچھ ہو کہ نہ ہو
جل بجھنا تو سیکھیں آ کر قومی آتش خانوں میں
عزم اور ثبات کے آگے کوئی چیز ٹھہر سکتی ہی نہیں
ہاں چرچا اس کا ہم نے سنا ہے اکثر نکتہ دانوں میں
قول اور قسم کی شان رہے اور دین و دھرم کی آن رہے
یہ ملک اور قوم کی خدمت ہے کچھ کھیل نہیں نادانوں میں
جو کام شروع کیا تم نے وہ کام تو کوئی کام نہیں
مضمون نیا مل جائیگا ہاں کوئی اپنی عنوانوں میں
ہندو و مسلم کی جے کا نعرہ قائم اور بلند رہے
یہ سچے دل سے اپنی دعا ہے گونج نہیں ویرانوں میں
آزادیٔ قوم و وطن کے لئے جو رنج و مصائب جھیلینگے
پیدا ہوں گے وہ دیوانے آخر کو اپنی انسانوں میں
مسلم تو ہندو سے اب ایسی کشش الفت خاص سے مل
ہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا شور اُٹھے بُت خانوں میں

ورود رام نگر

جموں سے رام نگر تک کا راستہ بڑا دشوار گذار ہے۔ اگر بارش ہو جائے۔ تو ندی نالوں اور پہاڑوں کی اترائی چڑھائی کی وجہ سے ناقابل عبور ہو جاتا ہے ۲۱۔ اگست کی دوپہر کو میں جموں سے روانہ ہوا۔ اور ۲۳۔ اگست ۱۹۲۰ء کو دس بجے صبح کے پا پیادہ رام نگر پہنچ گیا۔ یہ قصبہ شہر جموں کی طرح ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے جس کو تین طرف سے نالہ بندراہن گھیرے ہوئے ہے۔ یہ قصبہ راجہ سوچیت سنگھ

برادر راجہ دھیان سنگھ دمہاراجہ گلاب سنگھ کی جاگیر کی راجدھانی تھا۔ یہاں محلات جو ابتک نقش و نگار سے آراستہ ہیں موجود ہیں۔ راجہ سوچیت سنگھ لاولد تھے ان کی وفات کے بعد یہ جاگیر شامل ریاست ہوگئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے بیٹے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے زمانہ میں رام نگر اپنے فرزند ثانی راجہ رام سنگھ کی جاگیر میں دیدیا۔ راجہ رام سنگھ کی وفات کے بعد یہ جاگیر پھر شامل ریاست ہے۔

۲۴۔ اگست کی شام کو سیر و تفریح کے دوران میں جبکہ چاندنی نکھری ہوئی تھی اور رام نگر کے مسطح و ہموار میدان کا وسیع سبزہ زار اپنی بہار دکھارہا تھا۔ یہ شعر زبان پر جاری ہوگئے ؎

جی چاہتا ہے کیجے پہاڑوں کا سفر بھی
"اترائی چڑھائی" سے ہے پر جان کا ڈر بھی

کافور ہوئی آتے ہی یاں راہ کی کلفت
یہ رام کی نگری تو ہے آرام نگر بھی

اے دیدۂ دل گر ہے تجھے کچھ بھی بصیرت
آدیکھ یہاں کے سبق آموز کھنڈر بھی

اے مہ کہ تو ہے زیب دہِ محفلِ انجم
گردش ہو کبھی لطف و کرم کی مرے گھر بھی

سوختہ جانوں کی عید

۲۵۔ اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو یوم عید الضحیٰ تھا۔ میں اپنے ہم سفر شیخ علی محمد (حال کلرک امپیریل بنک لاہور) کے ہمراہ رام نگر کے نالہ نبدراہن اور اس کے نواحی سبزہ زار کی سیر کر رہا تھا۔ اس وقت صبح کے سات بجے چلے تھے۔ مسلمانوں اور پھر ان میں سے بھی سوختہ جانوں کی عید کے متعلق اسی دوران میں مندرجہ ذیل اشعار موزوں ہوگئے ؎

پھونک دے سامان عشرت غیر اے سوزِ فغاں
رنگ لائے کچھ نہ کچھ تو سوختہ جانوں کی عید

عید خود مغموم ہے حفظ خلافت کیلئے   اس طرح سے آئی ہوگی کم مسلمانوں کی عید

راکھ کر دے پھونک کر اے شمع عشق مصطفےٰ

اس سے بڑھکر اور کیا ہوتی ہے پروانوں کی عید

سنہ ۱۹۲۲ء کے سفر کشمیر کا کلام

سنہ ۱۹۱۸ء کے بعد تین سال گذر گئے احباب کشمیر نے خطوط بھی لکھے لیکن کشمیر جانے کا وقت نہ نکل سکا۔ آخر سنہ ۱۹۲۲ء میں تقاضائے احباب غالب آئے۔ اور میں ۳۱۔ اگست سنہ مذکور کو روانہ کشمیر ہوگیا بسوپور میں انجمن معین الاسلام کا پہلا سالانہ جلسہ ۹۔۱۰ ستمبر کو تھا۔ مولانا سید مبارک شاہ اندرابی مولوی فاضل (حال تبلیغ کالج کرنال) صدر مدرس تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ نظم کے بغیر داخلہ سوپور کی اجازت نہیں ہے۔ لاہور میں نظم کی فرصت کہاں؟ آخر یکم ستمبر کو جب کوہ مری کا سبزہ زار نظر آیا۔ تو سکون طبیعت میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی ۳۔ ستمبر کو موٹر جب دومیل کے پڑاؤ پر پہنچی۔ تو یہ چھوٹی سی نظم نوحۂ سوپور کے عنوان سے تیار ہو چکی تھی۔ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء کو اتوار کے دن سوپور کے جلسہ میں پڑھی گئی۔

نوحۂ سوپور

خطۂ سوپور تو ہے آج گو ننگ زمن   اک زمانہ میں رہا ہے تو مگر رشک چمن

تیرے حسنوں سے رواں ہوتی تھیں انہار لبن   تیرے ذروں سے تھا روشن حال آئین کہن

یاد آتے ہیں کبھی کیا تجھکو وہ ایام بھی

راجدھانی جن دنوں کشمیر کی تجھ میں رہی

ذات پر جن کی سدا نازاں رہے ہیں تخت و تاج   جن کو جھک جھک کر دیا شاہان عالم نے خراج

جن کی تیغوں نے رکھی قائم جوانمردی کی لاج   ہند کے راجے بھی جن کا مانتے آئے تھے راج

تخت گہ تو ایسے راجاؤں کی اے سوپر رہا
جن کے آگے سرنگوں ہر سرکش و خود سر رہا

کھول سینہ کو وُلر کے بحرِ بے پایاں ذرا
ماہیِ مضطر مری خاطر کوئی غوطہ لگا

کچھ تو ہی اے موجِ طوفاں خیز دے مجکو پتا
سبزۂ آبِ رواں تجھ میں حرکت سی ہے کیا؟

ناز جن کی ذات پر اس جنت ارضی کو تھا
کچھ کہو آخر ہوئے وہ گوہرِ نایاب کیا؟

جس جگہ راجے مہاراجے رہے مسند نشین
جس جگہ شاہی محل ہوتے تھے زینت آفریں

جس جگہ تھیں عدل اور انصاف کی راہیں کھلیں
جس جگہ رکھتے تھے دل میں اہلِ دنیا شوقِ دیں

اب وہاں دنیا کی رونق ہے نہ دیں کا شوق ہے
غیبت و جہل و فریب و بغض و کیں کا شوق ہے

معدن سوپور میں ٹکڑا ہے اک زینہ گیر کا
مدتیں گذریں وہاں نہریں رواں تھیں جابجا

یاد کر جب شاہ زین العابدین کا دور تھا
نام جس کا صفحۂ ہستی پہ اب تک ہے لکھا

بانئ زنگیر بھی تھا بانئ انہار بھی
وہ شہِ کشمیر تھا کشمیر کا غمخوار بھی

اس کے زریں عہد میں جاری تھے وہ دار العلوم
جن کی شہرت کے ہیں شاہد آج بھی شمس و نجوم

جن کے علم و فن سے تھے مشہور سوادِ شام و روم
جن کی دیواروں سے بچ بچ کے چلی بادِ سموم

گردشِ ایام نے شکلیں وہ ایسی میٹ دیں
آج ان تعلیم گاہوں کا نشاں تک بھی نہیں

اب نزولِ رحمتِ حق سے ہے خالی یہ زمیں
علم و زہد و دولت و حکمت ہیں سب گوشہ نشیں

ئے نہر مدہ متی کے اجرا نے سن ۲۱ء میں علاقۂ زنگیر کو پھر سیراب و شاداب کر دیا ہے۔

ڈھونڈھنے سے بھی اخوت کا نشاں ملتا نہیں ۔۔۔ منفعل کشمیر میں ہے اتحاد المسلمین

بھائی کا بھائی ہے دشمن باپ کا بیٹا عدو

شیر مادر ہے انہیں خویش و اقارب کا لہو

زبان فوق اور بیان کشمیر

۴ ستمبر ۲۲ء کو میں بارہ مولا پہنچ گیا۔ وہاں دو دن ٹھہر کر پھر اوڑی واپس آیا۔ وہاں دو دن رہا ۔ اوڑی سے سلام آباد تک دو اڑھائی میل کا فاصلہ ہے۔ سڑک پر ٹہلتا اور چکر لگاتا رہا۔ اس نظم کے چند ابتدائی شعر اسی دوران میں لکھے گئے۔ پھر سوپور آیا۔ چند شعر وہاں لکھے۔ پھر سمبل۔ ناگرا ناڑ، اور جاگیر راجپور کے قیام میں ۲۱ ستمبر تک اس کو مکمل کر لیا۔ یہ نظم سرینگر میں کشمیر کے ایک رئیس[1] کی "کشمیری دعوت" کے موقعہ پر جہاں سرینگر کے تقریباً تمام پنجابی معززین تھے سنائی گئی ؎

گر زبان فوق سے ہو کچھ بیان کاشمیر ۔۔۔ ہے یقیں بے چین کر دے داستان کاشمیر

اے خدا اے لم یزل سن لے فغان کاشمیر ۔۔۔ تیرے ہی بندے ہیں آخر بندگان کاشمیر

ممبر بزم فتنہ و شر واعظان کاشمیر ۔۔۔ عاملان شرک و بدعت عالمان کاشمیر

ظلم تو آئین ہے اور لب کشائی جرم ہے ۔۔۔ بہر خاموشی بنی گویا زبان کاشمیر

خون کثرت دیکھنا ہو تیغ قلت سے اگر ۔۔۔ دیکھیے آکر کبھی محشر ستان کاشمیر

ظالموں نے استخوان و پوست تک چھوڑا نہیں ۔۔۔ کھا گئے کشمیر کو سب میہمان کاشمیر

ایک عالم ہے ثنا خواں خطۂ کشمیر کا ۔۔۔ ہم کو قسمت نے بنایا نوحہ خوان کاشمیر

چاہیے تو اک ادنیٰ گھڑی میں سب کو باندھ لے ۔۔۔ ہیں بظاہر رشک صد رستم جوان کاشمیر

تیرے مظلوموں کی آہوں کے دھوئیں سے نیلگوں ۔۔۔ آسماں اک اور ہے زیر آسمان کاشمیر

ہے ازل ہی سے یہاں ترک تشدد پر عمل ۔۔۔ ہیں سبق آموز گاندھی ساکنان کاشمیر

[1] خواجہ اکبر شاہ عشاداری مرحوم رئیس زینہ کدل سرینگر۔

دور حاضر نے کیے بیدار سب سوئے ہوئے — کب اٹھیں گے یا الٰہی خفتگان کاشمیر
قوم غافل کس طرح بحر فنا میں بہ گئی — کچھ خبر ہے تجھکو اے آب روان کاشمیر
مٹ گیا احساس حریت اڑی روح عمل — ہیں غلامان غلام آزادگان کاشمیر
ذلت و جہل و حسد کا اک ذخیرہ ہے یہاں — پر ہے جنس علم سے خالی دکان کاشمیر
گر گئی گھل گھل کے ان کے غم میں عقل بیش و کم — حال مست اب تک ہیں پر دیوانگان کاشمیر
کوئی بات اسلام والوں کی نہیں آتی نظر — عالم اسلام دیکھا گو جہان کاشمیر
خون یزداں در عجائب خانہ برحال وطن — خود و تیر و جوشن و تیغ و سنان کاشمیر
مال اور بیگار، خارسٹ مجوزہ اور پولیس — اتنے دشمن اور اک جان کسان کاشمیر
تیغ جوہر دار برسوں تک رہی قومی نشاں — کانگڑی ہے یا پھرن بس اب نشان کاشمیر

(جاگیرداران کاشمیر)

اپنے ہی گھر تک ہے ان کی شان و شوکت کا جلوس — جن کی طاقت نے بڑھائی آج شان کاشمیر
نام ہی کے رہ گئے سلطان سلاطین پناہ — نام ہی کے اب ہیں راجے راجگان کاشمیر
اب کہاں موج ہوائے دلکشا و جاں فزا — اب کہاں وہ آب و رنگ گلستان کاشمیر
دینی غربت کا وہی عالم رہا زیر زمیں — عمر بھر دیکھا جو زیر آسمان کاشمیر
چین لینے ہی نہیں دیتی کبھی کشمیر میں — قہر آلودہ نگاہ پاسبان کاشمیر

کیا شگفتہ پھول کیا منہ بند کلیاں سب ہیں خشک
رحم کر اب اے جفائے باغبان کاشمیر

۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو پانچ بجے صبح کا وقت تھا۔ کہ میں اوڑی سے بارہ مولا روانہ ہوا موٹر کے ذریعہ دو گھنٹہ کا سفر تھا صبح کا وقت۔ ہوا کے فراٹے طبیعت میں پھر ایک لہر پیدا ہوئی۔ اور بارہ مولا پہنچنے سے پیشتر یہہ مختصر سی غزل تیار ہوگئی ؎

جانیں بھی دی ہیں زر بھی دیا بیشتر تمہیں
ہمدرد اپنا پھر بھی نہ پایا مگر تمہیں

سینچو لہو کے چھینٹوں سے بستانِ ملک و قوم
لینا اگر ہے جھولیاں بھر کر ثمر تمہیں

کچھ فکر بھی ہے زادِ رہِ عاقبت کی کیا؟
آخر تو پیش آنا ہے یہہ بھی سفر تمہیں

چھوڑو نہ عزمِ منزلِ آزادیٔ وطن
ہر چند راہ آئے نظر پر خطر تمہیں

ہے امتحانِ صبر و تحمل کی کوئی حد
ایسا نہ ہو کہ اس میں ہو آخر ضرر تمہیں

تم وہ کہ تم دوا تھے قضا کے لباس میں
ہم وہ کہ ہم سمجھتے رہے چارہ گر تمہیں

کیا آزمائشیں ہیں ہماری اڑان کی
پرواز کیا دکھا سکیں بے بال و پر تمہیں

تم نے ستم جو ہم پہ کئے لطف خاص تھا
سوئے ہوئے بتائینگے یہ جاگ کر تمہیں

کھانا نمک بھی اور نمکداں بھی پھوڑنا
جی چاہتا ہے بھیج دیں اب لام پر تمہیں

پتلے ہو تم تعصب و فسق و فجور کے
کہنے کو سب خوشامدی کہہ دیں بشر تمہیں

پوچھو جناب فوق کا جا کر پتہ کہیں
ہے جستجوئے عاشقِ صادق اگر تمہیں

بمقام منڈواڑہ وزارت بارہ مولا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۲ء

ایک خاص واقعہ کے متعلق

انجامِ ظلم کا کبھی اچھا نہیں ہوا
سو بار ہم تو کہہ چکے سر پیٹ کر انہیں

جن کے سلف رہے ہیں ہمیشہ پناہ فقر
اب کر رہا ہے دورِ زماں دربدر انہیں

بیداد و جور و قہر رعایا پہ جو کریں
کہتے ہیں کاشمیر میں سب دادگر انہیں

نرمی سے ناپسند ہے تقریرِ سودمند
سختی سے مان جائیں گے گو ہو ضرر انہیں



محمد دین فوق بعمر 57 سال

(سنہ 1933)

معلوم ہو حقیقتِ دردِ جنابِ فوق
کشمیر کا بنا دیں گورنر اگر انہیں

مناظرِ کشمیر کی یاد

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو بارہ بجے دوپہر کے بعد میں سرینگر سے واپس لاہور روانہ ہوا۔ لاری امیرا کدل سے پار ہو کر ابھی ڈاک خانہ[۱] تک ہی پہنچی تھی کہ دفعتہً بغیر کسی غور و فکر کے زبان سے نکلا ؎ الوداع اے خطۂ کشمیر اے باغِ بہشت ॥ اے کہ تیرے منظرِ دلکش ہیں سب داغِ بہشت
اوڑی آکر لاری خراب ہو گئی۔ وہاں ایک دن ٹھہرنا پڑا۔ نظم کا کچھ حصہ یہاں لکھا گیا۔ اور کچھ بگلہ اور مری کے درمیانی سفر میں۔ ؎

الوداع اے خطۂ کشمیر اے باغِ بہشت ॥ اے کہ تیرے منظرِ دلکش ہیں سب داغِ بہشت
چشمہ سار و کوہسار و مرغزار و آبشار ॥ لالہ زار و جوئبار و گلعذار و شالامار
تیرے قصبے تیرے قریے تیرے دریا تیرے شہر ॥ تیرے میداں تیری جھیلیں اور ان کی لہر بہر
تیرے ڈل کی سیر اور اس سیر کی کیفیتیں ॥ کون کہہ سکتا ہے کہ بھولیں تو پھر کیسے کہیں
تیری راتیں تیرے دن تیرے مہینے تیرے سال ॥ ہم نے دیکھے دافعِ حزن و غم و رنج و ملال
تیری سڑکیں تیری راہیں اور تیرے سرو و چنار ॥ سرمۂ چشمِ تماشائی ترا گرد و غبار
تیری حد میں آبِ جہلم کی ادب آموزیاں ॥ دور جا کر کچھ ذرا اس کی غضب آموزیاں
تیرے کوثر ناگ ویری ناگ اور ناگ آہر ॥ تیرے مانس بل کی سیر اور سیرِ تالابِ وُلر
تیری بجلی اور اس بجلی کی خیرہ کن چمک ॥ تیری کانیں اور ان کانوں میں نیلم کی دمک
چودھویں کی چاندنی تیری شبِ تاریک تاک ॥ تیرے ایامِ خزاں غیرت دہِ فصلِ بہار
کوہ پر ہے اس طرح تیرے چراغوں کی جھلک ॥ آسماں پر جس طرح ہوتی ہے تاروں کی چمک
تیری بے پہیہ فٹن کی دوڑ سطحِ آب پر ॥ ہر گھڑی ہر لحظہ ہر ساعت رہی پیشِ نظر

۱؎ اب ڈاکخانہ سنٹوریہ ہائی کورٹ کے متصل ہے۔

وادیٔ گلمرگ کے منظر بہشت اندر بہشت
جن پہ قرباں کعبہ و دیر و کلیسا و کنشت

تو محک کھوٹے کھرے اعمال کی اکثر بنا
بد میہاں بد تر بنا اور نیک نیکو تر بنا

تو بھی پیارا اور تری ہر چیز پیاری ہے مجھے
تو اگر ماتم میں ہے تو سوگواری ہے مجھے

ایک ناظر ہی نہیں شامل ترے کشتوں میں ہے
فوق بھی تیری نگاہ ناز کے کشتوں میں ہے

اپنے فرزندوں سے کہہ آئیں ذرا وہ ہوش میں
وہ جنہیں پالا ہے قدرت نے تری آغوش میں

جاں فزا و روح پرور دی انہیں آب و ہوا
جنت الدنیا رکھا ہے نام ان کے ملک کا

مبدا فیاض نے ہاتھوں سے پالا ہو جنہیں
حیف ہے اے دور گردوں انکو ایسی ذہنیں

تا بہ کے خالی رہیں گے علم کی دولت سے وہ
یوں تہیدست آہ کیونکر شوکت و حشمت سے وہ

العجب اہل ارم آرام سے محروم ہیں
ساکن جنت ہیں اور انعام سے محروم ہیں

کاش فطرت ان کی مانند سحر بیدار ہو
کاش انہیں احساس اپنے حال کا اک بار ہو

کاش یہ اس جنت کشمیر میں رضواں نہیں
ان بہشتی ارض کی حوریں نہیں غلماں نہیں

پھونکتا رہتا ہوں اس محفل میں بیداری کا صور
ایک دن میری نوا ہوگی اثر پیرا ضرور

خود بخود خاش دل نالہ سرا ہو جائیگا
جب وطن میرا اسکول سے آشنا ہو جائیگا

سفر بھوپال کی غزلیں اور نظمیں

۱۴- اکتوبر ۱۹۲۲ء کو میں لاہور سے کشمیر پہنچا ان دنوں اخبار کچھ عرصہ کیلئے پندرہ روزہ کر دیا گیا تھا کشمیر میں ایک نوجوان ہمدرد کشمیر سرکاری ملازم ہیں اور کچھ عرصہ اخبار کشمیری میں کام کر چکے ہیں انہوں نے اور چند اور احباب نے پھر ہفتہ وار کر دیئے کا مشورہ دیا بلکہ خود بھی رخصت لیکر لاہور میں آنے کا وعدہ کیا ملا ہور آکر میں نے اس خیال سے کہ ہفتہ وار ہو جانے کی صورت میں فرصت نہ مل سکیگی اپنی کتاب تاریخ حریت اسلام اور بعض اور کتابوں کیلئے بھوپال اور بمبئی تک کے سفر کا ارادہ کیا اور آخر ۲۴ اکتوبر کو لاہور سے روانہ ہو گیا۔ ۲۵- اکتوبر کو دہلی سے بھوپال لائن کی گاڑی روانہ ہونیکے تھوڑا ہی عرصہ بعد یہ چار شعر تیار ہو گئے۔

لہ خان بہادر چوہدری خوشی محمد بی اے ناظر سابق گورنمنٹ ریونیو منسٹر کشمیر

لیکے دل خوش ہو نہ عیاری اگیسا تھ | دلدہی بھی سیکھ دلداری کے ساتھ
وہ مصیبت بھی ہے کیا ناگفتنی | جبکہ بیماری ہو ناداری کے ساتھ
جھوٹ سے لبریز تیرا ہر سخن | تیرا ہر وعدہ ہے مکاری کے ساتھ

مثل آدم جنت ارضی سے فوقؔ
آئے لیکن ذلت و خواری کے بعد

دشمنان اہل ہند

(۲۵۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء چلتی گاڑی چھاؤنی آگرہ و دھولپور کے درمیان) بوقت شب

بن گئے اغیار جب سے پاسبان اہل ہند | گھر گئی بتیس دانتوں میں زبان اہل ہند
رشک صد دشت و بیاباں بوستان اہل ہند | غیرت صد ہا و یہ جنت نشان اہل ہند
کام کر جاتے نہ خیر اندیش بنکر بد سرشت | اہل ہند افسوس خود تھے دشمنان اہل ہند
کون دھد سے دیکھتا ہے جب نکل جاتا ہے کام | ہو گیا عین الیقین آخر گمان اہل ہند
مال و جاں قربان کردیں ملک و ملت کیلئے | ہے یہی راز حیات جاودان اہل ہند

گر نہ ہو سینہ گرہ اس ملک میں ہوا ور کیا
فہر اہل ہند ہے آخر بیجان اہل ہند

مشاعرہ بھوپال کی ایک غزل

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو تیسرے پہر میں بھوپال پہنچ گیا۔ وہاں ایک علم دوست طبقہ مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی کے فیض صحبت میں موجود رہتا ہے یہ جماعت دراصل بھوپال کی شاعرانہ زندگی کی حقیقی روح ہے۔ میں سرائے میں مقیم تھا معلوم نہیں ان اصحاب کو کس طرح میرے آنے کی خبر ہو گئی۔ دوسرے ہی دن یعنی ۲۷ اکتوبر

کو پچھلے پہر مولانا محوی اپنے چند احباب (مظہر سوزی، سوجہد گلابی اردو، جناب ناہمی، جناب ہاتف اور مولانا توحیدی) کے ہمراہ میرے "رین بسیرا" میں تشریف لائے اور معمولی تعارف کے بعد میرا اسباب وغیرہ اٹھوا کر میرے مرحوم ہموطن منشی چراغ الدین صاحب فائق لاہوری کے دولت خانہ واقعہ شاہجہان آباد سے آئے اور تا ایام قیام بھوپال یہ تمام احباب اور دیگر علم دوست اصحاب جن سے بھوپال میں شناسائی ہو گئی تھی، مجھ سے محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتے رہے۔

یہاں ایک مشاعرہ "بزم قمر" کے نام سے ہر مہینہ ہوتا ہے۔ اس مرتبہ یہ مشاعرہ جس کے سکرٹری منشی صدرالدین صاحب سرشتہ دار کمشنری تھے ۱۲ نومبر کو منعقد ہوا۔ مصرع طرح تھا ع کسی صورت سے حسن و عشق میں تکرار ہو جائے۔ مولانا محوی کے اصرار بیحد سے یکم نومبر کو مجھ سے بھی چند شعر لکھوا ہی لئے۔

تری تدبیر وہ صائب کہ سب دشواریاں آساں | مری قسمت وہ ہے آساں بھی ہو دشوار ہو جائے
نہ گھبرا اے دل مسلم عدوئے دیں کے حملوں سے | ہمیں وہ ہیں کہ ہم پر آگ بھی گلزار ہو جائے
اُبل پڑنے پہ آمادہ ہیں چشمے دیدۂ تر کے | جسے طوفاں سے بچنا ہو سمندر پار ہو جائے
جسے منظور ہوں آزادیاں دونوں جہانوں کی | وہ آئے اور غلام احمد مختار ہو جائے

تماشا ہو اگر تو بھی کسی پر جان دے ظالم
مزہ ہو گر مسیحا بھی کبھی بیمار ہو جائے

ماتم فرزند

۵۔ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء کو چھ بجنے کے ساتھ ہی تار والے ڈاکیہ کی صورت میں مجھ پر غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یعنی لاہور سے تار آیا کہ میرا سب سے چھوٹا لڑکا ظفر الحسن عمر گیارہ سال سخت بیمار ہے۔ میں تار کے ذریعہ روزمرہ خبر منگواتا رہا۔ کچھ صحت

کی خبریں آنے کے بعد ۔ نومبر کی شام کو اس کے وفات پا جانے کا تار ملا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁

۱۱ - نومبر کی شام کو جب گاڑی ملب گڈھ (ضلع دہلی) کے ریلوے سٹیشن پر پہنچی ۔ تو ماتم فرزند میں جس کو میں تندرست چھوڑ کر آیا تھا - خون کے آنسو نالۂ موزون بنکر نکلنے لگے - چنانچہ شعر جو اس نظم کا آخری شعر ہے ۔ اسی سٹیشن پر شام کے وقت بیاختہ زبان پر آگیا ۔ ؎

کچھ لڑکے چلے آتے ہیں اسکول سے پڑھکر ۔ دیکھو کہیں ان میں مرا احسن تو نہیں ہے

اصل شعر تو یہی ہے - جو بلا تکلف اور بلا تامل دل کی اندوہناک کیفیت کا ترجمان تھا باقی اشعار رات ہی کو دہلی - سہارنپور اور جگادھری وغیرہ کے درمیانی سٹیشنوں پر لکھے گئے ۔ ؎

اے برقِ اجل کیا مری بربادی سے حاصل
کچھ تنکے ہیں گنتی کے نشیمن تو نہیں ہے

اے سوزِ غم مرگِ عزیزاں نہ جلا اب
بکھرے ہوئے کچھ دانے ہیں خرمن تو نہیں ہے

اے راحتِ جاں نورِ نظر جاتے ہیں تیرے
دل ٹکڑے ہے اور آنکھ بھی روشن تو نہیں ہے

اے عیش کے شوقین ترا عیش ہوا ختم
یہ قبر ہے اور قبر میں آنگن تو نہیں ہے

بے موت تیری موت کے پیغام نے مارا
برقیہ ہیں برق نشیمن تو نہیں ہے

اس کم سنی ہی میں سوئے عدم جانے کا یہ شوق
تنہا بھی ہو اور واں کوئی ساجن تو نہیں ہے

دن بھر میں کئی مرتبہ وہ روٹھنا تیرا
جاتے ہوئے بھی کیا کوئی اَن بن تو نہیں ہے

کچھ لڑکے چلے آتے ہیں اسکول سے پڑھکر
دیکھو کہیں ان میں مرا احسن تو نہیں ہے

۲۴ مئی ۱۹۲۳ء کو میں لاہور میں تھا ۔ رات کو بارش کی وجہ سے آنکھ جو کھلی تو پھر نیند نہ آسکی ۔ اسی حالت میں مندرجہ ذیل اشعار کی ایک غزل لکھی گئی ۔ ؎

مرا منہ ہے اور وصفِ شاہِ لولاک — "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"
کجا کالج کجا رسانؔ[1] وائیں — مجھے بھی کیا سمجھ رکھا ہے پٹہ کاک[2]
گیا لاحول کے پڑھتے ہی شیطاں — اڑی توبہ کھلا بوتل کا جب کاک
اُن آنکھوں سے نہیں تھمتے اب آنسو — کبھی دیکھا نہ جن آنکھوں کو نمناک
رہا جو آنکھ میں پتلی کی صورت — وہی نورِ نظر ہے اب تہِ خاک
الٰہی آ پڑی یہ کیسی اُفتاد — گئے ہوش و حواس و عقل و ادراک
سُنا ہے اس کی تفسیریں لکھیں گے
کلامِ فوق بھی گویا ہے للہؔ[3] واک

کوہ مری کی سیر

کشمیر جاتے ہوئے کئی دفعہ مری سے گذرا لیکن وہاں ٹھہرنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ جولائی و اگست ۱۹۲۳ء میں احباب مری کے اصرار سے کشمیر کا ارادہ ترک کر کے کوہ مری ہی میں ٹھہرنا پڑا مری راولپنڈی سے ۳۹ اور لاہور سے ۲۱۹ میل کے فاصلہ پر اور سطح سمندر سے ۷۵۰۰ فٹ بلند ہے لیکن سنی بنک جہاں میرا قیام تھا۔ ۶۶۱۶ فٹ

---

[1] لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کا تتبع ہے ؎ کہاں کالج کہاں مجنوں کی بکواس۔ بہ مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس۔
[2] کشمیر کے مسلمان کا نام [3] کشمیر کے ہندو (پنڈت) کا نام
[3] للہ جی صاحبہ جن کو للہ دید اور للہ ایشوری بھی کہتے ہیں کشمیر میں بڑی زاہدہ و عابدہ عورت گذری ہے ہندو مسلمان اس کا بڑا احترام کرتے ہیں اسکے اشعار کو شلوک اور واک کہتے ہیں لندن میں ایک انگریز نے اسکی سوانح عمری اور اس کے شلوکوں کی شرح لکھی ہے اردو میں ہی للہ عارفہ کے نام سے راقم الحروف نے اس کے سوانحات عمر قلمبند کیے ہیں۔

کی بلندی پر تھا۔ کچھ یہاں کے نظارے دلفریب تھے۔ کچھ سوسائٹی زندہ دل مل گئی۔ اس لئے جب تک رہا مزے سے رہا۔

صاحب خانہ چودھری خان بہادر صاحب ٹھیکہ دار دہاؤس پر دبرائٹر کی وسیع بلڈنگ میں مسٹر غلام زین العابدین خان صاحب رئیس میرٹھ وسرکاری کنٹریکٹر بھی فروکش تھے۔ وہ جب عید الضحیٰ کی تقریب پر اپنے وطن تشریف لے گئے۔ تو مجلس سونی ہوگئی احباب نے ایک منظوم خط لکھنے کی تحریک کی۔ میں ۲۳۔ جولائی کو صرف مندرجہ ذیل شعر لکھ سکا ؎

صحن و دیوار و در و نظارۂ بام مری — ابر و باد و بارش و پیمانہ و جام مری
محفل عشرت نوائے نازک اندام مری — جاں فزا صبح مری صحت فزا شام مری

تو اگر ہمراہ ہے تو لطف نظاروں میں ہے
سیر بزم یار ہی سے عیش سب یاروں میں ہے

مسافر لنڈن کیلئے

۲۸۔ اگست ۱۹۲۳ء کو عزیز محمد رفیق احمد (خلف خانصاحب شیخ غلام حسین صاحب ریٹائرڈ ای اے سی حال آنریری مجسٹریٹ لاہور) بیرسٹری کے لئے یورپ روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے اطلاع مل چکی تھی لیکن میں کوہ مری میں تھا۔ ۲۲۔ اگست سے بخار میں مبتلا تھا اس لئے لاہور نہ جاسکا۔ البتہ ۲۲۔ اگست ہی کی شام کو عزیز مذکور کی روانگی یورپ کے متعلق ایک الوداعی نظم لکھی گئی ؎

دین و دنیا میں رہے تو کامراں — اے رفیق ملک و قوم و خانداں
چتر افگن تجھ پہ افضال خدا — اے رفیق احمد شفیق احمد ترا
ہو مبارک سیر یورپ کی تجھے — جس کی مدت سے تمنا تھی تجھے

غیرتِ صد صبح کر شامِ وطن — تجھ سے روشن تر ہے نامِ وطن
اے عزیزِ خاطرِ ہر خویش و غیر — اے کہ تیری ذات وقفِ کارِ خیر
یوں تو بیرسٹر ہیں صدہا ملک میں — چل رہا ہے جن کا سکہ ملک میں
تجھ سے امیدیں ہیں لیکن خاص خاص — ہیں مسلماں نام مومن خاص خاص
سیکھ جا کر حکمت و علم و ہنر — یاد رکھ خُذ ما صفا دع ما کدر
دیکھ لے جو کچھ وہاں آئے نظر — دین کے بچنے کا رستہ دیکھکر
گو سفر بحری ہے ڈر کوئی نہیں — خضرِ راہ بن جا۔ خطر کوئی نہیں
سب بزرگوں کی دعائیں ساتھ ہیں — جو موافق ہیں ہوائیں ساتھ ہیں

دیدہ و دل بھی ہیں تیرے ہمرہی
"تا نہ پنداری کہ تنہا میروی"

اہلِ کشمیر کے لئے

۷۔ فروری ۱۹۲۲ء کی صبح تھی۔ اور چار بج چکے تھے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کا یہ شعر یاد آگیا ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل۔ جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اسی وزن اور ردیف و قافیہ میں میں نے بھی ایک نظم لکھی۔ جو پانچ بجے تک مکمل ہوگئی۔ نظم حسب ذیل ہے۔ ؎

اے ظالم یوں تکفیر نہ کر۔ تو ملت کی تشہیر نہ کر
مسلم کو نہ شمشیر نہ کر۔ صیاد نہ بن۔ نخچیر نہ کر

ہے ظلم وستم کا نام بُرا اور نام سے بڑھکر کام بُرا
جس کام کا ہو انجام بُرا اس کام کو اے کشمیر نہ کر

ہر شخص مہاشہ جی تو نہیں ہر عورت شریمتی تو نہیں
یہ بدکاری شُدھی تو نہیں تو مذہب کی تحقیر نہ کر

تو مَن کیا؟ تَن ہے سیر نہ بن پروردۂ فطرت زیر نہ بن
اے نورِ ظہور اندھیر نہ بن دلگیر نہ ہو دلگیر نہ کر

کچھ کام طلسمِ عقل سے لے یہ ہاتھ نہ ہر اک ہاتھ میں دے
لے درس کتاب و سنت سے تو پیروئے ہر پیر نہ کر

محمود ابتوں کی پوجا کیوں دکھ درد نصیب عدے کیوں
خورشید کا گھر ہو دھندلا کیوں تاریک اپنی تنویر نہ کر

یہ برہمنی و بت شکنی دو باتیں ہیں اُلٹی سیدھی
یا بُت خانے میں سنکھ بجا یا توہینِ تکبیر نہ کر

اب دورِ جہاں میں علم کا ہے جو ہے شائق اس علم کا ہے
بزدل جانی اب حلم کا ہے یہ خواب نہیں تعبیر نہ کر

ہر قطرہ کو طوفاں نہ سمجھ ۔ ذرہ کو مہرِ جہاں نہ سمجھ
ظلمت کو نور افشاں نہ سمجھ ۔ کم ہمت کو نر بیر نہ کر

گر دور ہے ظلم و مصیبت کا کر ہمت استقلال دکھا
ہر رائی کو پربت نہ بنا ہر تنکے کو شہتیر نہ کر

مٹنے میں بھی تیرے عظمت ہے اس میں بھی کوئی حکمت ہے
ہر خاک کا ذرہ دولت ہے تو پروائے اکسیر نہ کر

اقبال[1] ترا آہر و بھی ترا۔ غازی بھی ترا۔ کچلو بھی ترا
رینہ بھی ترا سپرو بھی ترا۔ تو شیر ہے وہم شمشیر نہ کر

اے فوق حجاب شب سے نکل بن جا پروانہ شمع عمل
تدبیر سے رنگ دہر بدل۔ تقدیر کو دامن گیر نہ کر

کشمیر میں تحریک شدھی کی خبر پر

نومبر ۱۹۲۳ء کے آخری ایام میں پیر سید حسام الدین شاہ صاحب جاگیردار پونچھ (کشمیر) جو ان دنوں بوجہ جلا وطنی لاہور میں مقیم تھے کے ہمراہ مجھے بہاولپور جانا پڑا۔ وہاں ہم نواب سر خدا بخش خاں ٹوانہ چیف منسٹر کے مہمان تھے۔ خان بہادر چوہدری محمد الدین صاحب سابق وزیر پونچھ بھی ان دنوں بہاولپور میں ریونیو منسٹر تھے۔ اور مجھے ان سے پیشتر ہی سے نیاز حاصل تھا۔ وہیں میں نے کسی اخبار میں یہ خبر پڑھی۔ کہ شدھی کی تحریک اب خالص اسلامی صوبہ کشمیر تک بھی جا پہنچی ہے۔ خبر کے پڑھتے ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ دو شعر ذہن میں آ گئے ؎

کفر بے عین ہے ظلمت کی اشاعت کے لئے
پر تو افگن ہے جہاں جلوۂ نور اسلام

جس کی اک پھونک سے اڑ جائے یہ خاکستر کفر
کاش ایسا کوئی آجائے محمد کا غلام

---

[1] ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ خواجہ عبد الرحمان بی اے غازی۔ ڈاکٹر سیف الدین بیرسٹر ایٹ لا کچلو۔ رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم رینہ۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔

[2] مسلم کشمیری کانفرنس لاہور کے اجلاس منعقدہ ۲۵-۲۶-۲۷ اپریل ۱۹۲۳ء واقعہ گوجرانوالہ میں یہ نظم میری علالت کی وجہ سے یو پی کے جوان شاعر جناب عزنظامی سیمابی علیگڑھی مدیر رسالہ پیمانہ نے نہایت بلند آہنگی اور خوش الحانی سے پڑھی یہ نظم دوبارہ سنی گئی۔

آغا محمد صفدر کی رہائی

۱۰ اپریل ۱۹۲۲ء کو آغا محمد صفدر صاحب بی اے ایل ایل۔بی وکیل سیالکوٹ (حال سیکرٹری میونسپلٹی لاہور) لاہور سنٹرل جیل سے رہا ہونے والے تھے۔ کانگریس اور خلافت کے تمام عہدہ دار اور کارکن اور دوسرے کئی ہندو مسلمان اور سکھ ان کو لینے کے لئے سنٹرل جیل تک گئے۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ مولانا سید حبیب بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ہندو مسلم اتحاد کا نظارہ دیکھ کر یہ رباعی پڑھی گئی۔ جسے سب اصحاب نے پسند کیا ؎

گو شیخ و برہمن میں رہا بُعد بلے قیاس
گو بیٹھنا ملا نہ کبھی ان کو پاس پاس
آخر ملے غلام محمد سے رام داس
ناخن سے گوشت ہو نہیں سکتا مگر جدا

اس کے بعد جلوس روانہ ہوا۔ واپسی پر دوران جلوس میں کشمیر کے متعلق مندرجہ ذیل چند اشعار تیار ہو گئے

اقتصادیہ لیڈروں کو ہے پیارا کشمیر
فارنر لوگوں کی آنکھوں کا تارا ہے کشمیر
دشمنوں کیلئے یہ وسعتِ اخلاق وطن
اہل کشمیر کا ہوگا نہ سہارا کشمیر

کرنے کی ایسی تواضع کبھی غیروں کیلئے
تیرگی اپنے لئے روشنی غیروں کیلئے
اہل کشمیر نے ایثار کی مشکل ہے نظیر
غلہ میں رہ کے جو ہیں دو رخی غیروں کیلئے

مسٹر محمد علی جناح

۲۴-۲۵ مئی ۱۹۲۴ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ تھا۔ صدر جلسہ آنریبل مسٹر محمد علی جناح (بمبئی) ممبر اسمبلی تھے۔ قیام دوران لاہور میں مسٹر موصوف نے

بریڈلا ہال اور اسلامیہ کالج لاہور میں دو لیکچر بھی دیئے۔ جو لیکچر اسلامیہ کالج کے طلبا کے سامنے دیا گیا اس میں میں بھی موجود تھا۔ ۲۵ مئی کو ۱/۲ ۷ بجے صبح کے قریب مسٹر جناح حبیبیہ ہال میں آئے ان کو دیکھتے ہی میں نے مولانا سید حبیب آف سیاست سے کہا۔

آتی نہیں نظر میں کوئی صورت فلاح — شاید بتائیں راہ محمد علی جناح

انہوں نے بلند آواز سے یہ شعر جلسہ میں پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔

۱۹۲۴ء کے سفر کشمیر کا کلام

۶۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو میں ملیریا اور بعد ازاں ڈینگو بخار میں مبتلا ہو گیا جس سے تمام اعضا کو درد شروع ہو جاتا ہے۔ تقریباً ۱۲۔ یوم تک بخار نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں اخبار کو جو دو سال سے پندرہ روزہ تھا پھر ہفتہ وار کر دیا گیا۔ چنانچہ دماغی محنت نے جنوری کے آخری ایام میں پھر بیمار کر دیا۔ آخر مجھے ۲۴ جون کو آرام کرنے اور بحالیٔ صحت کے لئے کشمیر روانہ ہونا پڑا۔ جولائی کی گیارہ یا بارہ تاریخ تھی۔ کرم فرما سید حسین صاحب مہتمم بندوبست کے بتقریب دورہ مقام چوگل قیام پذیر ہونے کی اطلاع دی۔ یہ موضع ہماری قیام گاہ سوپور (منزل سوپور) سے چھ سات میل کے فاصلہ پر برلب دریائے پہرو واقع ہے۔ قبلہ منشی غلام محمد صاحب خادم میرے ہمراہ تھے۔ رستے میں "شاہ کوہل" کے کنارے کنارے مندرجہ ذیل نظم کہی گئی۔ جو اس زمانہ کے کشمیر پالٹکس کی ایک زندہ تصویر ہے۔

چل گئے وہ چال" ناؤں لکھا سبّی "کشمیر میں — قافیہ ہے "تنگ" "عمو جان" کا کشمیر میں
کاش کچھ ان کے دنوں میں بھی خدا کی یاد ہو — گو زبانوں پر بہت ہے "یا خدا" کشمیر میں
ہر زوالے را کمالے ہر کمالے را زوال — ہم نے نظارے یہ دیکھے بارہا کشمیر میں
رشتۂ اسلام کی کیا پوچھتے ہو وسعتیں — اک سرا ہے انقرہ[1] میں اک سرا کشمیر میں
ہندو و مسلم میں جن آنکھوں نے دیکھا اتحاد — دیکھتا ہوں آج ان آنکھوں سے کیا کیا کشمیر میں

[1] انگورہ

"کانگڑی" کی جگہ ہے اب "کانگڑا"[1] کشمیر میں
ہو گئیں ٹھنڈی مرے اہل وطن کی گرمیاں
پیرزادہ ہو کہ کوئی پیرزا کشمیر میں
کافروں سے بھی ہے بدتر وہ مسلماں کیلئے

خون مسلم تیغ مسلم سے جہاں ہو رات دن
کی یزیدوں نے وہ پیدا کربلا کشمیر میں

۱۵ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کو میں سوپور سے سرینگر تانگہ پر آرہا تھا کہ کشمیر کے ہندو راجگان قدیم کی شجاعت و وسعت سلطنت پر چند شعر سوپور سے پٹن کے درمیان لکھے گئے۔

جس قوم پہ نازل ہی رہی رحمت باری
"جو قوم پلی سایہ میں تیغوں کے ہمیشہ"
جس قوم کا سکہ رہا غیروں پہ بھی جاری
جس قوم کی قلت رہی کثرت پہ ظفریاب
جس قوم کی پرجا تھی کبھی راج دلاری
جس قوم کے راجے تھے مہاراجوں سے بڑھکر
جو قوم کبھی خانۂ غزنی سے نہ ہاری
جس قوم نے سب ہند کی قوموں کی رکھی لاج
جس قوم نے چشمے کئے تعلیم کے جاری
جس قوم میں تاریخ کے اوراق ہیں محفوظ
جس قوم نے اغیار کی حالت بھی سنواری
جس قوم نے اپنوں کو بھی پہنچایا فلک تک

یہ بندۂ ناچیز اسی قوم کا ہے فرد
ہر فرد رہا جس کا دس افراد پہ بھاری

مسلم کشمیر سے خطاب

جولائی سنہ ۱۹۲۴ء میں یتیم خانہ اور خانقاہ معلی کے فساد کی وجہ سے سارے کشمیر اور بخصوص سرینگر کی فضا نہایت مکدر تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں اور حکومت کشمیر اور مسلمانوں کے تعلقات میں افسوسناک کشیدگی بعض دراندازوں کی وجہ سے پیدا ہو چکی تھی۔ مسلمان سہمے ہوئے تھے انہی ایام میں ۲۱ یا ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء کو خانقاہ معلے والوں نے اپنے سکول کا سالانہ جلسہ مقرر کیا۔ مسلمانوں نے اس جلسہ کو باہم مل بیٹھنے کے لئے غنیمت سمجھا۔ اور باوجودیکہ ہمی

[1] ضلع کانگڑہ کے راجپوتوں کی اکثریت کی طرف اشارہ ہے۔

اختلافات کے ہر فرقہ کے مسلمان اس جلسہ میں کثرت سے شامل ہوئے۔ مجھ سے بھی ایک نظم کی فرمائش کی گئی تھی چنانچہ ۲۰ جولائی کو میں نے "مسلم کشمیر سے خطاب" کے عنوان سے جو نظم لکھی وہ حسب ذیل ہے۔

مسلم کشمیر آخر تا کجا غفلت تری
تیری غفلت کی بدولت چھن گئی دولت تیری
باعث ذلت مسلمانوں کو ہے ذلت تری
اک کہانی سی ہے اب شوکت تری حشمت تری

کچھ خبر بھی ہے کہ تجھ میں پنہاں اک طاقت بھی ہے
ہے خلافت بھی خدا کی اور عبدیت بھی ہے

کام لے اس قوت مخفی سے اور خوددار ہو
چھوڑ اب یہ خواب شیریں اٹھ ذرا بیدار ہو
تاک میں صیاد اور غافل ہے تو ہشیار ہو
غازیٔ گفتار سے اب غازیٔ کردار ہو

سن اسے جو ملہم غیبی ہے آکر کہہ گیا
ساتھ والے دور جا پہنچے تو پیچھے رہ گیا

جن دنوں تھا اوج پر تیری ترقی کا شباب
تیری خاک پاک کے ذرے بنے تھے آفتاب
جذبۂ حب وطن میں مست تھے سب شیخ و شاب
بزم و رزم دہر میں ہر فرد تیرا انتخاب

مسلم دانا سے کہہ! کوئی تو نادانی بھی کر
یعنی کچھ تاریخ کی اوراق گردانی بھی کر

یاد آیا ہے تجھے حاصل تھا وہ عیش و فراغ
جس کا برقی لیمپ سے بھی اب نہیں ملتا سراغ
ہے اجڑ جانے کو تیرے مذہب و ملت کا باغ
عندلیب خوشنوا کے بالعوض ہیں بوم و زاغ

باغ عالم میں جو خطہ رنگ تھا لایا ہوا
آج سناٹا اسی خطہ پہ ہے چھایا ہوا

سطوت دور گذشتہ اور فتوحات زماں
زہد سادات و مشائخ یعنی بزم قدسیاں
علم و فضل و زہد اور وہ رونق اسلامیاں
دیدۂ عبرت میں اب سب ہے رنگ خواب گراں

یادگاریں اس قدر جن کی ہیں یاد آئیں نہ کیوں؟
یاد ایام سلف سے دل تڑپ جائیں نہ کیوں؟
دیکھنے والوں کو کیوں اس بات پر حیرت نہ ہو
خون ہو تیری رگوں میں اور پھر حرکت نہ ہو
تو ہو رسوائے جہاں اور کچھ تجھے غیرت نہ ہو
دہر میں اتنا کوئی بیگانۂ عبرت نہ ہو
آہ تو اتنا حریص لذت آزار ہے
سخت جانی کا تری قاتل کو بھی اقرار ہے
ہوش میں آ ہوش کر بگڑی ہوئی حالت بنا
ترک کر اس جامۂ ذلت کو کچھ عزت بنا
منتشر شیرازۂ قومی ہے جمعیت بنا
دوزخ کشمیر کو پھر غیرت جنت بنا
وقف اندوہ و ملال و غم مسلماں ہیں تمام
تیرے اجزائے پریشاں سے پریشاں ہیں تمام
اٹھ کہ ہیں صدیوں کے اب سوئے ہوئے بیدار سب
جن کو ہم مجبور کہتے تھے وہ ہیں مختار سب
نشۂ صہبائے درد قوم کے سرشار سب
اب بدل دینے کو ہیں عالم کے کاروبار سب
تو بھی آ اور اس تگ و دو میں ذرا شامل تو ہو
تو ہی خضر راہ ہے پر عازم منزل تو ہو
تیغ گو تفریق کی اک ضرب سے تقسیم ہے
گو دل ہر دردمند قوم اب دو نیم ہے
حال مستقبل شکستہ خط میں گو ترقیم ہے
مدعائے قوم گو نذر امید و بیم ہے
پر تری غیرت اگر شان دگر پیدا کرے
قالب بے روح میں جلن دگر پیدا کرے

بڈشاہ کی روح سے سوال و جواب

۲۲ جولائی ۱۹۲۴ء کی صبح کو رشیم خانہ سرینگر کے ہزارہا مزدوروں پر جو حضوری باغ میں جمع ہو کر اپنے ۲۵ سرکردہ مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فوج نے حملہ کر دیا اور بیشمار لوگ نیزوں بھالوں کی نوکوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں اور ڈنڈوں کی ضرب سے زخمی ہوئے مسلمانوں کے جو خیالات اس وقت کشمیر کے مشہور ہر دلعزیز بادشاہ زین العابدین بڈشاہ اور کشمیر کے ہندوؤں کے متعلق تھے ان کو میں نے بڈشاہ کی روح سے خطاب کے عنوان سے نظم میں قلمبند کیا اور بڈشاہ کی روح نے جو جواب دیا۔ وہ بھی نظم میں لکھا یہ نظم بمقام پلوامہ ۶۔ اگست و ۸۔ اگست ۱۹۲۴ء کے متفرق اوقات میں لکھی گئی۔ ؎

لوٹ آ اک بار پھر اے روح زین العابدین ۔۔۔ جنت کشمیر کو پھر دیکھ لے جنت نشیں
تو نے آئین محبت سے جو تھے یکجا کئے ۔۔۔ دور گردوں نے جدا وہ آج سب اجزا کئے
متحد ہو کر جو رہتے تھے بہ اعزاز و ادب ۔۔۔ وہ گرفتار طلسم ملت و آئیں ہیں اب
جس جگہ تو نے مٹایا غیریت کو اب وہاں ۔۔۔ امتیاز بندہ و آقا سے ہیں رسوائیاں
جن کی الفت نے کیا بڈشاہ سے بٹ شاہ تجھے ۔۔۔ تیرے انعامات نے جن کے بڑھائے مرتبے
جن کو دستور معظم تیری شفقت نے کیا ۔۔۔ صاحب شوکت جنہیں شاہی عنایت نے کیا
جس شب تیرہ کو تو نے دن سے روشن تر کیا ۔۔۔ تو نے اپنے دفتروں میں جن کو سر دفتر کیا
علم و حکمت سے منور جن کے سینے کر دیئے ۔۔۔ پارہ ہائے سنگ جو تو نے نگینے کر دیئے
آج صدمہ ہے انہیں مسلم نہ بڑھ جائے کہیں ۔۔۔ خشک ہے برسوں سے جو دریا نہ چڑھ جائے کہیں
تیغ پنڈت مضطرب ہے جان مسلم کے لئے ۔۔۔ بتکدوں میں جنگ ہے ایمان مسلم کے لئے

؎ بڈشاہ = شاہ معظم۔ بٹ شاہ = ہندوؤں کا بادشاہ

دے رہے ہیں تیرے احسانوں کا بدلہ کس قدر
کہہ رہے ہیں ہم رہیں گے نام مسلم میٹ کر

آفتیں ہیں ہم مسلمانوں کی جانوں کیلئے
وہ سکوں کے لئے ہم جیلخانوں کیلئے

رشوت و تنخواہ دونوں ہضم ان کو بے ڈکار
اپنی مزدوری کے چند آنے بھی لیکن ناگوار

قلت تنخواہ کے شکوے پہ بھی وہ سود خوار
تارکش ریشم کے ہم اور پھر گریباں تار تار

آستاں سنگیں تبرک ہیں سجانے کے لئے
خانۂ اللہ اکبر صرف ڈھانے کے لئے؟

آئے ان کہنہ شوالوں پر نئے سر سے شباب
سجدہ گاہ مسلم مسکیں رہے زیر عتاب

کیا اسی انصاف پر ہے ادعائے عدل آہ
تین فی صد کیلئے ستانوے فی صد تباہ

سن زبان دہر کیا کہتی ہے اے پنبہ بگوش
تجکو لے ڈوبے نہ طوفان تعصب کا یہ جوش

متحد افراد ہیں، تو عیش و خوشحالی بھی ہے
امن و آسائش اگر ہے ملک میں شادابی بھی ہے

بڈشاہ کی روح کا جواب

مسلم کشمیر میری روح کا پہونچے سلام
نالہ تیرا سن چکا ہوں۔ تو بھی سن میرا پیام

انقلاب اس عالم ایجاد کی تقدیر ہے
خواب ماضی کی فضائے حال میں تعبیر ہے

ایک حالت پر کبھی رہتی نہیں بزم جہاں
اب خراب آباد ہے وہ کل جو تھا اک گلستاں

شکر کر ہے تیری جنت کی ابھی باقی بہار
ایک داغ سینۂ عالم ہے تیرا لالہ زار

دشت و گلشن کی ہوائے مشکبو بھی ہے وہی
نہر اور دریا کی قائم آبرو بھی ہے وہی

زندگی کی آگ سے ابتک فروزاں ہے چنار
ہے نمو کے جوش سے ہر فصل میں فصل بہار

کس جگہ برپا یہاں طوفان رنگ و بو نہیں
ہے وہی فیضان فطرت کا مگر وہ تو نہیں

دوسری قوموں سے یہ شکوہ ترا بیکار ہے
تیری عظمت اور ذلت کا خدا مختار ہے

چاہتا ہے جس کو دیتا ہے وہ دنیا میں کمال
قبضۂ قدرت میں ہے اس کے ہر اک اوج و زوال

راز سارا اس تغیر کا مجھے معلوم ہے
نفس تیرا خود ہوا و حرص سے محکوم ہے

مذہب و ملت حفاظت میں ہے خود اللہ کی
ہے مگر تیرے ہی ہاتھوں سے یہ رسوائی تیری

تجھ میں غیرت ہو تو تجھ پر غالب آسکتا ہے کون | تجھ میں جرأت ہو تو پھر آنکھیں دکھا سکتا ہے کون
ایک مرکز پر ترا عزم و عمل قائم نہیں | نام کا ہے تو مسلماں کام کا مسلم نہیں
ہاں مگر اک وقت آنے کو ہے بعد انقلاب | فطرت باری کا ہوگا پھر ارادہ کامیاب
ذرہ ہائے خاک سے چمکیں گے پھر سورج نئے | ہو نگے پھر انوار کے معدن نئے مخرج نئے
ان خرابوں سے چھلکے گی پھر یہاں تازہ شراب | آئے گا پھر اس خزاں آلودہ گلشن پر شباب

ہاں نہ گھبرا رحمت حق مہرباں ہو جائے گی
جنت کشمیر اک دن پھر جواں ہو جائے گی

۴۲۔ اگست ۱۹۲۴ء کو پیر شمس الدین صاحب حیرت پاندانی کاشمیری نے جن کو فارسی و عربی پر عبور کامل ہے اور جن کا فارسی کلام اپنی بلند پایگی کی وجہ سے کشمیر میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ مجھے چند نایاب قلمی کتابیں اپنے دولت خانہ واقعہ محلہ پاندان سری نگر میں دکھائیں۔ ان میں عہد اکبری کے ایک مشہور کشمیری شاعر یعقوب صرفی کا دیوان بھی تھا۔ میں نے اس کو جستہ جستہ دیکھا۔

۱۷۔ اگست کو میں معہ منشی غلام محمد صاحب خادم اپنے مکرم دوست راجہ شیر علی خان صاحب جاگیردار راجپور تحصیل مہنڈاوڑہ کے صاحبزادہ محمد سکندر خان کی تقریب شادی پر جا رہا تھا۔ رستے میں مولانا عرفی کے ایک مقطع کا یہ مصرع بار بار زبان پر آتا تھا ع

اگرچہ رشک بہشت است گلشن کشمیر

راجپور پہنچنے سے پیشتر آٹھ شعر کی مندرجہ ذیل غزل تیار ہو گئی۔ دو شعر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

اڑائی دست فلک نے وہ دولت کشمیر | زبان خلق ہے اور ذکر غربت کشمیر
اسی روش پہ رہی گر حکومت کشمیر | تو ادر ڈھونڈھے گی راعی رعیت کشمیر[1]

---

[1] تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کشمیر و جموں کے موجودہ فرمانروا مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ آنجہانی کی وفات کے بعد گدی نشین ہو گئے۔

ادھر ہے عیش مقام اور اُدھر ہے شادی مرگ
سنبھل کے کیجیے اے دل سیاحت کشمیر

مذاق علم کی بیگانگی سے دوزخ ہے
اگرچہ غیرت جنت ہے گلشن کشمیر

تباہ حالی نے دونوں کو کر دیا یکساں
تہی ارادت و ہمت سے ہیں مرید و پیر

بہشت خلد بھی ہے کاشمیر بھی لیکن
وہاں تو لوگ ہیں دل شاد و یہاں دلگیر

بابا نانک کی آنکھیں

اخبار لائل گزٹ (حال شیر پنجاب) کے گرونانک نمبر کے لیے ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء
کی صبح کو چار سے پانچ بجے کے اندر بستر پر

یاد ہیں وہ دن تجھے اے فتنۂ پنجاب کیا؟
تفرقہ تھا جب رعایا اور راعی میں پڑا

ملک پر چھایا ہوا دور نفاق انگیز تھا
فتنہ ہنگامہ کی صورت میں قیامت خیز تھا

ہندو و مسلم ہم دست و گریباں تھے لگے
بادشہ سے جنگجو۔ حکام دوراں تھے الگ

جب رعایا فتنہ جو ہو اور حاکم بد شعار
کیوں نہ غالب آئیں پھر اک لاکھ پر بارہ ہزار

مٹ چکا آسائش و امن و اماں کا نام تھا
عہد ابراہیم خوں ریزیاں کا نام تھا

جور افغاناں تو بابر نے مٹا ڈالا مگر
فتنہ پردازان مذہب تھے ابھی تک جوش پر

ہندو و مسلم بھلا بیٹھے تھے سب احکام دیں
روندتے زیر قدم تھے بے ادب احکام دیں

ایسی حالت میں دیا نانک نے وہ پیغام صلح
جس سے روز حشر تک روشن رہیگا نام صلح

جو کہے کر بھی دی۔ پھر نہ کچھ تاثیر عمل
آبرو دیکھو مگر بڑھا دیتی ہے توقیر عمل

ہندو و مسلم میں جب فتنہ نے ڈالا ہے فساد
کاش اس سے کوئی کہہ دے اے عدو دانشمند

تو نے جن قوموں میں ڈالی از سر نو دشمنی
جسم ہے نانک اگر تو اس کی آنکھیں ہیں یہی

آہ ان آنکھوں کو ظالم مائل زاری نہ کر
کشور ہندوستان میں جوئے خون جاری نہ کر

"ملکۂ دلکشا" کا نوحہ

خان بہادر خواجہ محمد اعظم صاحب رئیس اعظم ڈھاکہ دسابق ممبر لیجسلیٹو کونسل بنگال کی بیگم نواب زادی مہربانو صاحبہ نواب بہادر نواب خواجہ سر سلیم اللہ نواب آف ڈھاکہ کی ہمشیرہ تھیں مرحومہ کے اخلاق حمیدہ اور ان کی قومی فیاضیوں نے ان کو مشہور عالم کر رکھا تھا۔ چند دنوں کی علالت کے بعد "باغ دلکشا" کی وہ نیک دل ملکہ ۳۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو راہگرائے عالم جاودانی ہو گئی۔ مجھے جب ان کی وفات کا تار ملا۔ تو بیحد صدمہ ہوا۔ اس کے بعد حکیم حبیب الرحمان صاحب نے مرحومہ کے قطعہ تاریخ وفات کی فرمائش کی۔ چنانچہ ۱۱۔ نومبر ۱۹۲۵ء کی رات کو مندرجہ ذیل شعر لکھے گئے ؎

رہی مہرباں مہربانو سدا ۔۔۔ رہی "ملکۂ دلکشا" دل نشیں
یتیموں کے سر پر ترا ہاتھ تھا ۔۔۔ غریب عورتیں تیرے داماں میں تھیں
زمانہ میں شوہر پرستی تری ۔۔۔ مثال و نظیر اپنی رکھتی نہیں
تجھے بھی اسی راہ چلنا پڑا ۔۔۔ جو ہر اک کو درپیش ہے بالیقیں
غم جاں گسل کا پہن کر لباس ۔۔۔ مرض موت کا ہو گیا جاگزیں
زمیں نے نہ آغوش شفقت میں کیوں ۔۔۔ تری ذات کس دن تھی بار زمیں
تجھے اپنی تنہائی تھی انجمن ۔۔۔ تو غواص بھی ہو کے ساحل نشیں
جئے تو جئے کوئی تیری طرح ۔۔۔ کسی سے حسد تھا نہ تھا بغض وکیں
یہاں نیز حسن اعمال وخلق ۔۔۔ وہاں خاتم دین حق کی نگیں
ترا سوگ پنجاب وکشمیر میں ۔۔۔ ترے غم میں بنگال اندوہگیں

لکھا فوق نے تیرا سالِ وفات
ز دنیائے دوں شد بخلد بریں

۱۳ ۵ ۴ ۲

کشمیر زراعتی بورڈ

۲۰- فروری ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم کشمیری زراعتی بورڈ راولپنڈی کا گجرات میں جلسہ تھا۔ مجھے نظم کے لئے تاکیدی خطوط آ رہے تھے۔ لیکن کچھ تو فرصت نہ ملی۔ اور اگر فرصت ملنے پر کچھ توجہ بھی کی۔ تو کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر اس خیال سے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا کہ وہاں شور و شر کم ہوتا ہے۔ اگر کچھ کوشش کروں گا۔ تو ممکن ہے چند اشعار ہو جائیں لاہور سے گاڑی پر بیٹھا۔ تو وہاں شیخ صادق حسن صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا امرتسر و سابق ممبر اسمبلی بھی موجود تھے جو اسی جلسہ پر بحیثیت صدر گجرات جا رہے تھے۔ بات چیت میں وقت تو کم ملا لیکن "دل بہ یار دست با کار" کے مطابق چلتی ٹرین ہی میں ۲۰ فروری کو گجرات پہنچنے سے پیشتر مندرجہ ذیل شعر لکھ لئے۔

تیری ارضِ پاک ہے ہر ایک کی جائے پناہ
جس میں ترکستان بھی ایران بھی توران بھی

تیری آغوشِ محبت میں سب اقوام و ملل
جن میں قریشی بھی مغل بھی میر بھی افغان بھی

تو نے کفر آباد میں گاڑے ہیں علم توحید کے
قابلِ تحسیں ہے تیرا جذبۂ ایمان بھی

ہے ترا ہم قوم ڈھاکہ کا حبیب اللہ خان
تھا ترا ہی ہم وطن لاہور کا "سلطان" بھی

تجھ میں جج بھی ہیں سشن جج بھی ہیں اور ڈی سی بھی ہیں
تجھ میں صوبیدار بھی لفٹنٹ بھی کپتان بھی

تو نے فنِ پہلوانی میں کیے پیدا بہت
رستمِ ہندوستاں بھی رستمِ دوران بھی

تو وہ گردوں ہے درخشاں جس میں صدہا آفتاب
دیکھ غافل غور کی نظروں سے اپنی شان بھی

زینت سبتان کونسل تیرے پھولوں کی بہار — جن کی خوشبو سے معطر جسم بھی ہے جان بھی
تیری غفلت سے مٹے جاتے ہیں یہ تیرے حقوق — گو اراضی دار بھی ہے تو زراعت دان بھی
اپنی ہمت سے تو اپنی مشکلیں آسان کر — تیرے ہاتھوں میں ہے تیرے درد کا درمان بھی

رنج محنت کے اٹھا اور عیش کی بنیاد رکھ
زندہ رہنے کے لیے مرنا پڑیگا یاد رکھ

دُعائے نیم شبی

یکم جون ۱۹۱۶ء کو میری اہلیہ مرض سل میں مبتلا ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۲۶ء میں اس کی حالت زیادہ یاس انگیز تھی۔ میں نے دسمبر ۱۹۲۶ء کے آخری ایام میں دعائے نیم شبی کے نام سے ایک نظم لکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں مریضہ کی صحتیابی کے لیے دعا مانگی۔ یہ نظم ۷ جنوری ۱۹۲۷ء کے کشمیری اخبار میں چھاپ دی گئی تھی۔ اور اس کے بعد دیگر کئی اخبارات و رسائل نے بھی اس کو چھاپا۔ اس نظم کے پُر تاثیر اور درد انگیز ہونے کے متعلق بے شمار خطوط میرے پاس آئے۔ کئی لوگوں نے اس کو زبانی یاد کر لیا۔ اور کئی لوگوں نے لکھا کہ نظم ایسی پُر تاثیر اور پُر درد تھی۔ کہ ہم پڑھتے جاتے تھے۔ مریضہ کے لیے دعائے صحت بھی کرتے تھے۔ اور آنکھوں سے آنسو بھی بے اختیار نکلے جاتے تھے۔ مرض چونکہ جان ہی لینے کے لیے آیا تھا اس لیے باوجود بہت سی دعاؤں اور دواؤں کے مریضہ ۲۸ اپریل ۱۹۲۷ء کی صبح کو رخصت ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

سب تجھے قدرت ہے مولیٰ ایک پل میں کیا سے کیا کر دے — گدا کو شاہ کر دے شاہ کو چاہے گدا کر دے

لے ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں مندرجہ ذیل کشمیری مسلمان ممبر تھے۔ شیخ دین محمد صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب ساکن گوجرانوالہ حال لاہور۔ ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا لاہور۔ شیخ محمد صادق صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا رئیس امرتسر۔

بقا کو تو فنا کر دے فنا کو تو بقا کر دے
زمیں کو آسماں کر دے ثریا کو ثریٰ کر دے

کہیں پھولے پھلے گلزار وقت باد صرصر ہوں
کہیں برسوں کی سوکھی ٹہنیوں کو تو ہرا کر دے

بہت ڈوبے ہوئے بیڑے اٹھائے تو نے ساحل سے
مرے ٹوٹے ہوئے دل کا بھی کوئی آسرا کر دے

دق و سل کے مریضوں میں تو آخر جان آتی ہے
جو تو چاہے تو مردے کو بھی جیتا جاگتا کر دے

گھلی جاتی ہے شمع بزم ڈر ہے گل نہ ہو جائے
ضیائے لطف سے تو پھر اسے نور آشنا کر دے

میں عاجز بندہ تیری ذات ہے عاجز نواز آقا
عجب کیا ہے جو مجھکو کامیاب مدعا کر دے

تری قدرت نے ناممکن کو ممکن کر دیا اکثر
مری مشکل کو بھی آسان اے مشکل کشا کر دے

کمی کیا ہے تیری سرکار میں آسانیٔ مطلق
رفیق زندگی فوق کو صحت عطا کر دے

نہیں کوئی نہیں جب کی دوا اس کی دوا تو ہے
سوا تیرے دعا کس سے کروں میرا خدا تو ہے

سنہ ۱۹۲۹ء کے سفر کشمیر کا کلام

۲۴ جون سنہ ۱۹۲۹ء کو میں کشمیر روانہ ہوا۔ ۲۹ جون کی صبح کو راولپنڈی اور اسی دن روانہ ہو کر ۳۰ جون کی سہ پہر کو سرینگر پہنچ گیا۔ سر رشتہ انجمن اسلامیہ جموں کے سپرنٹنڈنٹ منشی محمد الدین صاحب نقشبندی سرینگر ہی میں تھے۔ ان کے ہمراہ واپس اوڑی آیا اور اوڑی کو ہیڈ کوارٹر قرار دے کر بجھامہ ملکوٹ۔ جاگیر نامبلہ اور سلام آباد کی خوشگوار فضاؤں میں تین ہفتے بسر کئے۔ ۱۱ جولائی کو ہم بجھامہ میں تھے جس کی سیر تو صحت افزا ہے لیکن جہاں پہنچنے کے لئے دریا کا پل ایک ناواقف اور اجنبی کے لئے پل صراط سے کم نہیں ہے۔ بجھامہ کشمیر کے سب سے بڑے جاگیردار سلطان محمد متولی خان صاحب کی وسیع جاگیر کا صدر مقام ہے ۱۴ جولائی کی شام کو ہم دونوں ہمنام سلطان صاحب کے ہمراہ کاجی ناگ کے برفانی نالہ اور جنگل کے کوارٹر کی سیر کر کے واپس آ رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر ایک نوجوان عورت پنجابی لباس میں نظر آئی، جو ہمیں دیکھتے ہی حیران

ہوگئی میں نے بے ساختہ وہاں یہ شعر پڑھا۔

وہ شکل جو آتے ہی نظر ہوگئی غائب — جادو ہے کہ بجلی کہ چھلاوہ کہ بلا ہے

رات کو اس ایک شعر کی بدولت مندرجہ ذیل غزل تیار ہوگئی۔

سرد آجکل اس درجہ زمانہ کی ہوا ہے — انجام کے احساس سے دل کانپ رہا ہے
تم دل نہ کہو اس کو وہ پتھر کا ہے ٹکڑا — جس میں نہ حمیت نہ حرارت نہ وفا ہے
وہ شکل جو آتے ہی نظر ہوگئی غائب — جادو ہے کہ بجلی کہ چھلاوہ کہ بلا ہے
میں وہ کہ ترے ظلم و ستم پر بھی دعا گو — تو وہ کہ مرے عجز و وفا پر بھی خفا ہے
کس ہستئ موہوم پہ غافل یہ تکبر — اتنا تو سمجھ کوئی رہے گا نہ رہا ہے
کشمیر جسے کہتے ہیں سب غیرت فردوس — جب تو ہی نہیں پاس تو دوزخ سے سوا ہے
کہسار پہ یہ ابر کے پھرتے ہوئے سائے — اک عالم شاداب تجھے ڈھونڈ رہا ہے
کیا دیدۂ بد بیں سے حفاظت کیلئے آج — اوڑھی ہوئی ناظورۂ گردوں نے ردا ہے
گر بادلہ سر پر ہے تو مخمل ہے تہ پا — القصہ عجب منظر پُر زیب و ضیا ہے
آ۔ اور مری چشم تصور میں سما جا — آئینہ ترا دیر سے بے عکس پڑا ہے
ہونے کو وہ سب کچھ ہے بہ انداز تعین — بندہ ہے تو بندہ ہے خدا ہے تو خدا ہے

اے فوق میں یا ہوں اسلئے محتاج رفاقت
تنہا رہِ منزل میں کوئی چھوڑ گیا ہے

۱۱۔ جولائی ۱۹۲۳ء کو میں اور منشی محمد الدین صاحب بجبامہ سے پہل پورہ تک جو سلطان صاحب کٹھائی (بجبامہ) کی جاگیر ہی میں ہے گئے۔ یہ موضع جو بجبامہ سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ بارہ مولا کے پہاڑی رستہ میں دریا کے کنارے واقعہ ہے۔ پہل پورہ دو ندیوں کے درمیان ہے اور بلندی پر ہونے کی وجہ سے ایک بہت اچھی سیرگاہ ہے۔ رات رہکر صبح ہم واپس روانہ ہوگئے۔ ٹھنڈی مگر خوشگوار ہوا

چل رہی تھی۔ بارش گو "چھم چھم" ہوتی تھی لیکن "تھم تھم" کے ہوتی تھی۔ بعض مقامات پر سبزہ زار اور پانی کی کثرت کی وجہ سے خواجہ حافظ رح کا یہ شعر یاد آجاتا تھا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ را

اسی حالت میں بجھامہ تک واپس پہنچتے پہنچتے مندرجہ ذیل غزل تیار ہوگئی۔

خداوندا یہ کیا اندھیر ہے تیری خدائی میں
عداوت آشنائی میں کدورت ہے صفائی میں

بہار جنت و کوثر کے نظارے نظر آئے
کنار آب بجھامہ میں گلگشت کنھائی میں

نگاہوں میں شہنشاہان عالم تک نہیں جچتے
وہ استغنا میسر ہے ترے در کی گدائی میں

یہ دولت عارضی ہو کر بھی ایسی فتنہ پرور ہے
تنازع ڈالتی ہے باپ بیٹے بھائی بھائی میں

کسی کے جان بحق ہوتے ہی گھر میں ہو کا عالم ہے
ڈراتے ہیں در و دیوار تک رنج جدائی میں

نہ کہیے اس کو گر محروم مے قسمت تو کیا کہیے
فلک رس ہو کے نالے کھو رہے ہیں نارسائی میں

مگر ابلیس نے پہنا ہے اب کے زہد کا جامہ
چھپے ہیں دشنہ و خنجر لباس پارسائی میں

تمہارے تیر کے زخموں کے شاید کچھ نشاں نکلیں
ہمارے دل کے آثار قدیمہ کی کھدائی میں

غلامی کا بھلا اس قوم کو احساس کیا ہو گا
نہ سمجھے فرق جو اصلاً اسیری اور رہائی میں

بہت واماندگان رنج و غم نے مدعا پائے
الٰہی دیر کیا ہے اب مری حاجت روائی میں

نمایاں ہے خلقت الخلق سے یہ نکتہ عرفاں
ہمارا راز ہستی ہے کسی کی خود نمائی میں

جہاں نیرنگئ حسن ازل ہے بے نقاب پیدا
مجھے لے چل اسی خطہ کے دامان ہوائی میں

نتیجہ امتحان دین و دنیا کا نہ کچھ نکلا
گذاری فوق ہم نے عمر قسمت آزمائی میں

سیر نا نمبلہ (کشمیر)

۲۲۔جولائی ۱۹۲۹ء کو منشی محمد الدین صاحب نقشبندی اور اخبار کشمیری کے قدیم معاون اور علاقہ پہاڑ کے علم دوست مولوی غلام مرتضےٰ بیگ صاحب ملکوٹی کے ہمراہ پا پیادہ راجہ محمد افضل خان صاحب جاگیردار نا نمبلہ کے پاس گیا۔راجہ محمد افضل خان دوسری پشت سے اخبار کشمیری کے خریدار چلے آتے ہیں یعنی ان کے والد راجہ بلند اقبال خان صاحب بھی اپنے آخری دم تک اخبار کے خریدار رہے ملکوٹ سے نا نمبلہ پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے۔رستے میں پانی افراط سے ملتا ہے۔یہاں دو دن قیام رہا ۲۳۔جولائی کی صبح کو نالہ کے کنارے سیر کے لئے گیا۔جہاں نظر فریب منظروں نے چند اشعار بھی لکھوا لئے۔

کیفیت آب نا نمبلہ میں ہیں حد سے سوا لطافتیں بھی
کہسار کی سیر میں یہ اے دل ہیں راحتیں بھی صعوبتیں بھی
دلچسپ وہ شور ندّیوں کے پوشیدہ ہیں جن میں ہیبتیں بھی
کیا کیا لب آب گل کھلے ہیں جن سے ہیں فضا میں زینتیں بھی
فطرت کی کتاب میں ہیں گویا صفحات بھی اور عبارتیں بھی
ہیں ستر کشائے نقطہ معنی یہ رنگ بھی اور نکہتیں بھی
منظر کی نظر فریبیوں میں قدرت کی عیاں ہیں صنعتیں بھی
مقصود نہیں ہے محض تفریح ہیں غور و نظر کی دعوتیں بھی
ہیں اہل نظر کے واسطے فوق
ان سبزیوں میں عبرتیں بھی

علاقہ کٹھائی جھاہ کی سیر

حقیقی تفریح وہ ہے جو خوشنما رنگ من موہنی صورت۔ خوشبودار مہک اور دلفریب آواز یا کسی ایسی چیز سے پیدا ہو جس کی موجودگی مسرت بخش اور دل خوش کن ہو لیکن اگر وہ کیفیت جاتی رہے۔ تو تکلیف نہ ہو۔ ایسے اوصاف کی تفریح سوائے سرسبز و شاداب جنگلوں کے اور کہاں مل سکتی ہے۔ قدرتی پھولوں کے رنگ سے زیادہ خوشنما رنگ۔ قدرتی مناظر سے زیادہ دلفریب صورت ان کی خوشبو سے زیادہ بہتر خوشبو جو ہوا میں عطر فشانی کر کے اپنی مہک کو دور تک پہنچا دیتی ہے۔ اور کہاں مل سکتی ہے۔ اور ایسا حسن جو مشاطگی سے بے نیاز ہو۔ اور کہاں میسر ہو سکتا ہے۔ وہ چھوٹے آزاد مغنی جو رنگ برنگ کے پروں کا فاخرہ لباس پہنے ان ہوش ربا نازنینوں کی محفل میں خالق اکبر کی قدرت کے راگ ڈال ڈال پر گاتے پھرتے ہیں ثابت کرتے ہیں کہ ان کی آواز سے زیادہ دلکش اور کوئی آواز نہیں ہے۔ اور کس قدر بے آزار کہ جب یہ سماں بدل جائے تو نہ کسی دل پر ملال اور نہ کسی طبیعت پر رنج۔

ایسی ہی تفریح کے لیے ۲۰ جولائی ۱۹۲۹ء کو میں سلطان محمد متولی خانصاحب جاگیردار کے علاقہ کٹھائی کی سیر کے لیے روانہ ہوا منشی محمد الدین میرے ہمراہ تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ میں ان کے ہمراہ تھا اور وہ پنڈت پریم ناتھ صاحب بی اے سٹلمنٹ افسر کی معیت میں تھے۔ یہ سفر بیشک سخت دشوار گذار تھا اکثر مقامات پر گھوڑوں سے اتر کر پیدل چلنا پڑتا تھا کئی نالے بمشکل عبور کیے گئے تقریباً ہر روز بارش کا سامنا رہتا تھا ہم اس سفر میں زیادہ سے زیادہ ۹½ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچے لیکن یہ حقیقت ہے کہ قدرت کی دلفریبیاں اسی سفر میں نظر آئیں۔ اور صحت پر بھی بہت اچھا اثر پڑا۔ ۳۰ جولائی کو ہمارا کیمپ جاگیر کٹھائی کے مقام سفیدہ میں تھا یہاں "کچھ کہنے کے لیے" دل بے اختیار ہو گیا۔

عقل کی تسخیر کی دیرانیاں ہیں
شمع ہے موجود پروانہ نہیں

جام کوثر سے وہی محروم ہے
جو مرید پیرِ مے خانہ نہیں

کس طرح آئے تصورِ شیخ کا
دل خدا کا گھر ہے بُت خانہ نہیں

حسنِ فطرت میں وہ جادو ہے جسے
حاجتِ آئینہ و شانہ نہیں

کر سکے جو چارۂ دیوانگی
آہ ایسا کوئی فرزانہ نہیں

جس کو کہئے قصۂ خواب آفریں
داستانِ غم وہ افسانہ نہیں

فوق سے دربانِ جنت نے کہا
آبھی جا ناداں۔ تو بیگانہ نہیں

۳۱۔جولائی ۱۹۲۹ء کو ہم اپنے چندروزہ سفر کی انتہائی بلندی ۹½ ہزار فٹ پر تھے۔چاروں طرف دھواں چھایا ہوا تھا۔ننھی ننھی نامعلوم سی بوندیں پڑ رہی تھیں ایک سرسبز اور گھنے جنگل میں سے ہم گذر رہے تھے۔اونچی اونچی ٹیکوں پر کہیں کہیں گجروں کا کوئی عارضی مکان نظر آجاتا تھا۔اسی حالت میں یہ چند شعر ہو گئے۔

آپ نہیں نہ مجھے ریو وریا کا بندہ
میں ہوں الفت کا غلام اور وفا کا بندہ

جس سے بن جائیں یہ سب بندۂ خدا کے بندے
کاش مل جائے کوئی ایسا خدا کا بندہ

کی تغافل کی جو عاشق نے شکایت تو کہا
کیا مرکب نہیں نسیان و خطا کا بندہ

حق کی درگاہ میں مقبول ہو یا نامقبول
یہ مناسب ہے کہ خوگر ہو دعا کا بندہ

پائے بندِ ہوس و آز کو انساں نہ کہو
بندۂ خاص ہے تسلیم و رضا کا بندہ

جس نے آفاق کے گوشوں میں مچا دی ہلچل
میں ہوں اس خلوتیٔ غارِ حرا کا بندہ

؎ اس سفر میں لوگوں کی جہالت، بے علمی اور ان کی درماندگی و نکبت دیکھ کر یہی شعر سب سے پہلے زبان سے نکلا تھا۔

ہجر ساقی میں ہوئی ہے یہ غم افزا ثابت	نہیں قائل مئے اندوہ ربا کا "بندہ"

آپ سے بڑھ کے نہیں کوئی جفا کا مونس

فوق سے بڑھ کے نہیں کوئی وفا کا بندہ

۱۹۲۹ء کا سفر کشمیر جو لاہور سے ۲۸۔ جون کو شروع ہوا تھا۔ ۸۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو لاہور واپس پہنچنے پر ختم ہو گیا۔

۱۴۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میں درد پیچ سے بیمار ہو گیا۔ اور ۱۴۔ نومبر ۱۹۲۹ء تک بیمار رہا۔ ۱۶۔ اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا اور میں بستر علالت پر پڑا تھا۔ کہ عالم خواب میں مطلع و مقطع اور شعر ۱۶ موزون ہو گئے۔ آنکھ کھلی۔ تو یہ تینوں شعر زبان پر جاری تھے۔ باقی اشعار دن کو لکھے گئے۔

قضا سے مرض کی دوا چاہتا ہے	مریض محبت بھی کیا چاہتا ہے

کسی کی خوشی ناخوشی سے اُسے کیا	الٰہی جو تیری رضا چاہتا ہے

وہ کیا جانے الفقر فخری کی لذت	کہ جو صحبت اغنیا چاہتا ہے

بُتوں کی جگہ دل میں لی یاد حق نے	یہ بُت خانہ کعبہ بنا چاہتا ہے

کہاں بوالہوس اور کہاں یہ تحمل؟	غم عشق صبر و رضا چاہتا ہے

وہ لا ریب ہے قابل رشک سائل	جو تجھ سے تجھے اے خدا چاہتا ہے

دمِ آخری ہے مریض الم کا	تمہیں اک نظر دیکھنا چاہتا ہے

خوشامد ہوئی فوق سے اور نہ ہو گی

بتا تو سوا اس کے کیا چاہتا ہے؟

۱۶ جنوری ۱۹۳۰ء کی شب کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ یعنی خواب میں ہی ایک شعر موزون ہو گیا۔ بلکہ خواب ہی کی حالت میں بڑبڑاتا ہوا اس کو پڑھ رہا تھا۔ کہ بیدار ہو گیا۔ شعر حسب ذیل ہے۔

مٹ گیا حرف غلط کی طرح سب لکھا پڑھا	قیس نے ہمدرس لیلےٰ ہو کے آخر کیا پڑھا

بعد میں اس پر مندرجہ ذیل اشعار کا اضافہ کر کے غزل پوری کر دی گئی۔

مٹ گیا حرفِ غلط کی طرح سب لکھا پڑھا
قیس نے ہمدرسِ لیلیٰ ہو کے آخر کیا پڑھا

دہی رسم الخط ہیں تازی ودری سیدھے فقط
ہم نے جو خط بھی پڑھا ان کے سوا الٹا پڑھا

کر رہے ہیں رات دن ہم انتظارِ نفخِ صور
ان کے نامے میں جو تا صدد وعدۂ فردا پڑھا

سرورِ امی لقب نے درس گاہِ وحی میں
اولاً اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى پڑھا

موسمِ گل میں شرابِ ناب ہے واعظ حلال
مفتیٔ ابرِ سیہ کا ہم نے خود فتویٰ پڑھا

آفرینش کے فنا آمادہ ہیں اجزا تمام
اس دبستاں میں یہی درسِ خرد افزا پڑھا

بول اٹھا ہے لفظ لفظ اس کا پیامِ آگہی
جس نے کوئی شعرِ دلکش میرے دیواں کا پڑھا

عشق کی وارفتگی نے کھو دیئے ہوش و حواس
تھا وگرنہ فوقؔ بھی اک آدمی لکھا پڑھا

سنہ ۱۹۳ء کے سفرِ کشمیر کا کلام

(۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۳ء بمقام جاگیر راجپور ہندواڑہ کشمیر)

کچھ آگے بڑھ گئے ہیں جوانی کی حد سے ہم
اب ہمکنار ہوں گے عروسِ لحد سے ہم
آخر مریضِ غم کسی صورت نہ بچ سکا
مدت سے ڈر رہے تھے اسی روزِ بد سے ہم
تکمیل جس کی صرف محبت کے ہاتھ ہے
کس طرح کام لیں گے وہ بغض و حسد سے ہم
پندار کے بتوں سے کریں گے نہ دل تباہ
بت خانہ توڑ دیں گے خدا کی مدد سے ہم
کر دیگا فوق وہ ہمیں دنیا سے بے نیاز
رکھتے ہیں یہ امید خدائے صمد سے ہم

(بمقام پہلگام وادیٔ لدر کشمیر ۵ ستمبر سنہ ۱۹۳ء)

خوابِ رضواں کی نظر افروز اک تعبیر ہے
واہ کیا کشمیر ہے واللہ کیا کشمیر ہے
دیکھکر خود دنگ ہے نقاشِ قدرت بھی آج
جس پہ نازاں ہے مصور بھی یہ وہ تصویر ہے
بنگس و لولاب و گلمرگ و لدر کی وادیاں
جن کی ہر چوٹی شعاعِ برف کی تنویر ہے

ناتمام

راقم الحروف اور حاجی میر شمس الدین صاحب سابق سکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور سنہ ۱۹۳ء میں ڈاکٹر عبدالواحد صاحب (سرینگر کشمیر) کے مہمان تھے۔ ۲۵۔ اکتوبر کی شب کو ۱۲ بجے جو آنکھ کھلی۔ تو تین بجے تک سر نا نصیب نہ ہوسکا۔ اور پھر نیند آئی۔ تو مرود ل سے شرط باندھکر حاجی صاحب نے آواز دی کہ اُٹھئے اور نماز پڑھئے۔ میں نے عرض کیا ہم کیا اور ہماری نماز کیا؟ لیکن نماز کے بعد اس فقرہ کی موزونیت کے خیال نے ذیل کا شعر تیار کر دیا۔ ؎

در اصل اک بہانہ ہے تشہیر زہد کا
یہ ذوق جبل سازا ور اس کی نماز کیا؟

(۲۔نومبر ۱۹۳۰ء بمقام سرینگر کشمیر)

تم رئیسوں کی خوشامد ہی پہ نازاں رہنا
مجھ کو راس آئے محمدؐ کا ثنا خواں رہنا

خود ہی میرے لئے سامان کیا فطرت نے
آگیا کام مرا بے سرو ساماں رہنا

کٹ گئے دو مرتبہ زنجیر نئے سے بنی
میری قسمت ہی میں ہے پائے بہ جولاں رہنا

مجھ سا ناشادِ ازل بھی کوئی ہوگا کہ جسے
محفلِ عیش میں بھی اشک بداماں رہنا

گر گئی ذوق اشارہ نگہ شوخ ان کی
تم اسیرِ ستم گردشِ دوراں رہنا

۱۹۳۲ء کے سفرِ کشمیر کا کلام

درد سر کا شاعرانہ علاج

مولانا حسرت موہانی نے اپنے قید وبند کے ایام میں بہت سی نظمیں لکھی تھیں چنانچہ ایک غزل کے مطلع میں بھی جو جیل خانہ ہی میں لکھی گئی تھی مشق سخن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎ اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی ، ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی میں ۱۹۳۲ء کے سفر کشمیر میں ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ ۸ اگست کی رات درد سر کی وجہ سے بہت بے چینی سے بسر ہوئی۔ اسی حالت میں چند خیالات دل میں موجزن ہوئے اور وہ شعر بن کر زبان پر آتے رہے۔ ؎

جس سے مایوس مسیحا ہے وہ بیمار ہوں میں
موت ہی جس کا مداوا ہے وہ آزار ہوں میں

تجھ میں یہ وصف کہ تو اہل وفا کا دشمن
مجھ میں یہ عیب کہ اس پر بھی وفادار ہوں میں

حوصلہ دیکھ مرے جذبۂ سودائی کا
گو ہوں بے مایہ مگر تیرا خریدار ہوں میں

جرم ہمدردیٔ مخلوق کی عادت ہے مجھے
جس پہ رحمت تری صدقے وہ گنہگار ہوں میں

ہائے اے شوق گرفتار پئے عیش و آرام
تو ہی ڈالوں گا زنجیر غلامی اک دن
یہ تن آسانی و جوش طلب آزادی
ظلم بے حد ہے اگر کس سے نسبت ہے تجھے
ہائے اے جانِ برادر ترے گم ہونے سے
مجھکو کیا کافر دیدار کے جھگڑوں سے غرض
سبب شورش کشمیر تو جو کچھ ہو۔ مگر

ہو کے آزاد اپنے سر سے گرفتار ہوں میں
آج گو دیکھنے میں بیکس و لاچار ہوں میں
جنس نایاب کا اور مفت طلبگار ہوں میں
عہد حاضر میں سری کرشن کا اوتار ہوں میں
دل پُر داغ ہوں میں دیدۂ خوں بار ہوں میں
یعنی اک ذرۂ درد دل عطار ہوں میں
آج کشمیر یہ کہتا ہے کہ بیدار ہوں میں

ترک ذوق مئے دمشوق مبارک اے فوق
آجکل اپنے تصور ہی میں سرشار ہوں میں

اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

کشمیر ایجی ٹیشن کے ایام ۱۹۳۱ء میں جہاں ظالم افسروں اور غیر منتظم حاکموں پر نزلہ گرا۔ وہاں کئی جابر افسر اپنے رسوخ کی وجہ سے بچ بھی گئے۔ لیکن پبلک نے جن ایک دو افسروں کی معزولی یا معطلی یا جبریہ ریٹائرمنٹ پر افسوس و قلق کا اظہار کیا۔ ان میں پنڈت پریم ناتھ بی اے وزیر وزارت مظفر آباد بھی تھے جن کو حقیقی معنوں میں پبلک اپنا محبوب حاکم خیال کرتی تھی لیکن حکومت کشمیر نے کردہ گناہوں کی فہرست میں اس ناکردہ گناہ کو پہلے جبریہ رخصت دی۔ اور اگست ۱۹۳۲ء کے اخیر میں ان کو جبریہ پنشن دیدی۔

میں ۹ ستمبر ۱۹۳۲ء کو سرینگر کے نگین باغ کے ساحل پر تھا۔ وہیں کشتی میں رات بھی بسر کی۔ ذہن فوراً اس پریم مجسم وزیر کی طرف منتقل ہوگیا جس کی ریٹائرمنٹ پر ریاست کے تمام ہندو مسلمان اور سکھ کف افسوس مل رہے تھے چنانچہ بعنوان بالا سے نگین باغ ہی میں ذیل کی نظم لکھی گئی۔

تجھ سے کل چند وزیران وزارت نے کہا
اے کہ تجھ سے تو کسی شخص کو آزاد نہ تھا

تیرے اخلاق کے مداح تھے سب خورد و کلاں — کون سا فرد وہ تھا جس سے تجھے پیار نہ تھا
تجھ سے ہمدرد رعایا پہ یہ بیدردی ہو — آہ تو ایسی سزا کا تو سزاوار نہ تھا
جرم تیرا تو کسی کو کبھی آیا نہ نظر — پھول ہی پھول تھا اس باغ میں تو خار نہ تھا
جس قدر تیری رعایا تھی دعا گو تھی تری — حاکم عدل فزا تھا۔ تو جفا کار نہ تھا
پھر سبب کیا ہے کر دی جبریہ پنشن تجھکو — تو کسی دوست و دشمن پہ کبھی بار نہ تھا
سن کے یہ باتیں پڑھا داغ کا میں نے اک شعر — شاعری سے مجھے گو کوئی سروکار نہ تھا

بات کیا چاہیے جب مفت کی حجت ٹھہری
اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا

کشمیر میں رام لیلا کا ایک منظر دیکھکر

(۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء حضوری باغ سرینگر)

نہ جم چاہیے اور نہ کے چاہیے — سری رام چندر کی جے چاہیے
اثر لے سری بانسری کا ہو کیا! — وہ گوکل کے رسیا کی نے چاہیے
جس آواز پر مست تھیں گوپیاں — وہ سُر اور وہ تان اور وہ لے چاہیے
بجھے سوزش عشق کی جس سے آگ — کوئی ایسی ٹھنڈی سی شے چاہیے
بڑھے جس سے اعزاز قوم و وطن — وہی دمبدم پے بہ پے چاہیے
ہوئے مست جس سے سبلام و جام — وہی ساقیا ہم کو مے چاہیے
وہی آستان حجاز اور جبیں — وہی اپنا مشرب جو ہے چاہیے

یہ کشمیر ہو اور فوق حزیں
نہ شیراز اس کو نہ رے چاہیے

چلا تیغ اے تیغ زن

۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کی رات تھی میں دو تین دوستوں کے ہمراہ جموں کشمیر مسلم پولیٹیکل کانفرنس کے اجلاس (پتھر مسجد سرینگر) سے براستہ خشکی اپنی قیام گاہ پر پیدل واپس آ رہا تھا۔ راستہ میں تاشہ دن کے مشہور بازار سے گذر ہوا۔ جہاں کوئی خوش گلو ہارمونیم کے ساتھ ایک غزل جس کا قافیہ ردیف "گلبدن دھیرے دھیرے" تھا گا رہا تھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ ایک کامل تھا خاموشی چاروں طرف اپنا سکہ بٹھا رہی تھی۔ باجہ کی آواز سریلی تھی۔ گانے والے کا گلا صاف تھا۔ یہ حالات ہوں تو کسی کے پہلو میں دل کی بجائے پتھر ہی ہوگا کہ یہ دلکش آواز سنے اور زیادہ نہیں تو چند منٹ بھی نہ ٹھہر سکے۔ ہم سب کو بھی بے اختیار ہو کر چند منٹ تک سردخانہ ہمسایہ کا لطف اٹھانا پڑا۔ بالآخر قیام گاہ پر پہنچتے پہنچتے مندرجہ ذیل چند اشعار دھیرے دھیرے کی جگہ رفتہ رفتہ کی ردیف میں تیار ہو گئے۔

ہوا بزم میں ہم سخن رفتہ رفتہ
کھلا ہم سے غنچہ دہن رفتہ رفتہ

یہی ہے اگر شوق ملبوس نو کا
اتر جائے گا یہ پھرن رفتہ رفتہ

مٹائے گی آخر نشان غلامی
یہ احرار کی انجمن رفتہ رفتہ

یہیں باد صرصر جو چلتی رہے گی
اُجڑ جائے گا یہ چمن رفتہ رفتہ

وطن کو بنا دے گا فردوس ثانی
مرا داغ حب وطن رفتہ رفتہ

تری شکل و سیرت وہ من موہنی ہے
کہ ہے ہی گئی میرا من رفتہ رفتہ

بنیں گے یہ خار وطن دیکھ لینا
گل نرگس و نسترن رفتہ رفتہ

تو قع تھی کچھ رہنمائی کی جن سے
وہی بن گئے راہزن رفتہ رفتہ

نہ خنجر رہے آستیں میں کسی کی
ملیں شیخ اور برہمن رفتہ رفتہ

تقاضا ہے آثار کا عہد نو کے
کہ جائے گی رسم کہن رفتہ رفتہ

یہاں حسرتیں دفن ہیں ہر قدم پہ کر دے طے رہِ تاشہ دآں رفتہ رفتہ
تو کر فوق کو فتح کشمیر بڑھکر
چلا تیغ لے تیغ زن رفتہ رفتہ

"دست بوسہ" کی ایک مجلس میں ایک قومی نظم

راجہ غلام محمد خان صاحب جاگیردار دچھلڈارہ تحصیل اوتر مچھی پورہ کشمیر کے صاحبزادہ خانصاحب عنایت اللہ خان کی شادی کی تقریب میں مجھے بھی دچھلڈارہ جانا پڑا۔ وہاں کئی شعرا نے ۲۰ نومبر ۱۹۳۲ء کی شام کو "دست بوسہ" کی مجلس میں مبارکباد کی نظمیں پڑھیں۔ مجھے بھی حکم ہوا میں نے ایک مختصر سی نظم پڑھی جسمیں قومی جذبات کا ذکر تھا اسی تقریب پر پنڈت بلہ کاک روز یر وزارت۔ ٹھاکر رگناتھ سنگھ تحصیلدار پنڈت آنند کول نائب تحصیلدار۔ راجہ شیر علی خان جاگیردار راجپور اور ان کے برادر عزیز خانصاحب زبردست خان اور منشی غلام محمد خادم وغیرہ کئی سخن فہم اصحاب موجود تھے۔ نظم حسب ذیل ہے:۔

تم کو رہے مبارک سارا جہاں تمہارا
ہم کو بہت ہے کافی کشمیر کا نظارا

فردوس نام تیرا تو ہے وطن ہمارا
سب ہیچ تیرے آگے کیا بلخ کیا بخارا

تیرا مآل خلقت گمنامیاں نہیں ہیں
شہرت پہ آسمان کے بنکر چمک ستارا

نشو و نما اے جب تاب و تواں نے دی تجھ
چارہ گری کریگا سب کی یہی بچارا

اے انقلاب عالم گردش ادھر بھی کوئی
کہنہ لباس تو نے ہر قوم کا اتارا

"ایمان کی کہے کچھ ایمان ہے تو سب کچھ"
حب وطن ہی کامل ایمان ہے ہمارا

کوئی کسی کا خواہاں کوئی کسی پہ نازاں
اے رحمت الٰہی ہمکو ترا سہارا

قوموں نے گیت بدلے گیتوں نے ساز بدلے
اپنی وہی ہے لو لو۔ اور وہ ہی تمکنارا

ہر برگ پر ہے کندہ تاریخ عہد ماضی
اک نقش نازنین ہے ہر نقش سنگ خارا

دیکھا ہی ہم نے ارض کشمیر میں وہ جلوہ — موسیٰ کو جو نہ دشت ایمن میں تھا گوارا

از کیف تازہ مستم۔ بہلائے خوش بستم — دل می برد ز دستم صاحبدلاں خدارا

دردا کہ راز الفت خواہد شد آشکارا

تکمیل غزل ۲۴ سال کے بعد

اکتوبر ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ میں راجہ غلام محمد خان صاحب کی جاگیر دچھلپورہ کشمیر میں تھا وہاں ایک صبح کو یہ شعر بالکل حسب حال تھا زبان سے کہ ترجمان دل بھی نکلا اور بے ساختہ نکلا۔

ہم بڑی مدت سے سنتے تھے کہ ہے دنیا دار فوق — جب اسے پرکھا تو وہ دنیا کے بھی قابل نہ تھا

یہی شعر مطلع اور مقطع اور غزل کا متن تھا۔ کلام فوق کے ایڈیشن اول میں بھی یہی شعر درج کیا گیا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ۲ دسمبر ۱۹۳۲ء کی رات کو سرینگر کشمیر میں پچھلے پہر جب آنکھ کھلی۔ تو پھر یہی شعر ورد زبان تھا تھوڑی سی کوشش کے بعد چند اور شعر موزوں کر کے اس مقطع کے ساتھ ملا دیئے گئے۔ اب پوری غزل حسب ذیل ہے۔

یہ مذاق درد یہ ذوق خلش حاصل نہ تھا — تجھ سے جب الفت نہ تھی پہلو میں شاید دل نہ تھا

کاش اپنا گھر سمجھ کر آپ آ جاتے کبھی — دل جہان عشق تھا اجڑی ہوئی محفل نہ تھا

مثل انجم ضوفشاں ہوتا نہ کیونکر اے فلک — ذرۂ خاک وطن۔ گرد رہ منزل نہ تھا

کہتے ہیں قصہ ترا سنتے تو سنیئے کس لئے — وہ کوئی افسانۂ آرائش محفل نہ تھا

بھیک دینی ہی پڑی آخر فقیر قوم کو — ایک جھڑکی پر جو ٹل جاتا میں وہ سائل نہ تھا

قصہ اسلاف سنکر آپ کیوں برہم ہوئے — قصۂ ماضی تھا وہ فریاد مستقبل نہ تھا

ساتھ دیتا ہجر کی تاریک راتوں میں وہ کیا — چاند ہی تو تھا وہ آخر میرا داغ دل نہ تھا

مد و جزر دہر کی پروا شناور کو ہے کیا — وہ وہاں کھاتا رہا غوطے جہاں ساحل نہ تھا

قصۂ غم عرض کرنے کی اجازت کیوں نہ دی — کہنا مشکل تھا مجھے یا سننا تجھے مشکل نہ تھا

کیوں اڑا کر لے گئی مجھ سوختہ ساماں کی نعش ۔۔ راکھ ابھی ہیں اے ہوائے دامن قاتل نہ تھا

ہم بڑی مدت سے سنتے تھے کہ ہے دیندار فوق
جب اسے پرکھا تو وہ دنیا کے بھی قابل نہ تھا

شہر آشوب کشمیر

(۹ دسمبر ۱۹۳۲ء بوقت شب بمقام سری نگر کشمیر)

گو ہوا سے بھی بہت سستا ہے جل کشمیر میں ۔۔ ٹیکس[1] نے مہنگا کیا پانی کا نل کشمیر میں

اک طرف نار جہنم اک طرف انہار خلد ۔۔ دوزخ و جنت دکھاتا ہے ٹنل[2] کشمیر میں

اب مچل جانے کا رستہ بھی نکالے گا کوئی ۔۔ کارخانہ کھول بیٹھا ہے مچل[3] کشمیر میں

مُردنی چھائی رہا کرتی تھی جس پنجاب پر ۔۔ کھل گیا وہ مثل گلہائے کنول کشمیر میں

اڑ گیا تخت سلیماں تک ہوائے دہر سے ۔۔ ہے محل عبرت کا۔ پریوں کا محل کشمیر میں

خدمت شاہ و رعایا ہی تو بن جاتی ہے جرم ۔۔ جب عداوت چل رہی ہو پرسنل کشمیر میں

آج وہ سب مسترد ہیں۔ تھے جو کل تک بے بدل ۔۔ کاش بدلے کوئی۔ یہ ردّ و بدل کشمیر میں

پیٹ کی خاطر بکا ہے قوم کا ناموس و ننگ ۔۔ مست اپنے حال میں اہل دول کشمیر میں

کاش پھر کشمیر کو چمکائے کوئی نور دین[4] ۔۔ عورتوں میں کاش پھر پیدا ہو لل[5] کشمیر میں

بن رہے ہیں دفتر دل کی جگہ اب شاہی محل ۔۔ اور دفتر بن گئے شاہی محل کشمیر میں

جس طرح جموں کو ہے پکہ ڈنگہ[6] کی گپ پہ ناز ۔۔ فخر رکھتا ہے یونہی ریزنہ کدل[6] کشمیر میں

---

۱ کشمیر میں واٹر ٹیکس کے اجرا کے متعلق ہے ۔ ۲ یہ ٹنل بانہال اور ویری ناگ کے درمیان ہے اور نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ بانہال کے طرف گرم علاقہ جموں لگا ہے اور ویری ناگ کی طرف کشمیر ہے ۔ ۳ مچل صاحب اور ان کا کارخانہ کشمیر میں مشہور ہے۔ ۴ حضرت شیخ نور الدین ولی کا مزار چرار شریف میں ہے ۔ ۵ بی بی للہ عارفہ کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اپنے زہد و تقا کی وجہ سے قابل احترام سمجھی جاتی ہے ۔ ۶ جموں و سرینگر کے یہ دونوں مقام اپنی گپ بازیوں کی وجہ سے شہرت عام رکھتے ہیں۔

دشمنوں نے کر دیا شیرازۂ قومی تباہ
شیر و شکر تھے سب اقوام و ملل کشمیر میں

آج جو برطانوی ہندوستاں میں ہے ہوا
آئے گی طوفان ہی بنکر وہ کل کشمیر میں

ہم تدبر ہی کے دیوالے کا سمجھے اشتہار
بج گیا جب مارشل لا کا بگل[1] کشمیر میں

سیر کر ملتان کی اور دیکھ گرمی کی بہار
کٹ کشو[2] کی موج لینی ہے تو چل کشمیر میں

ڈل طبیعت سے کیا کرتا ہے نفرت ہر کوئی سست
دلربا دیکھی ہے ہم نے سیر ڈل[3] کشمیر میں

گر نہ باور ہو تو دیکھو ملہ خضر کی ڈیل کو
سینکڑوں دیتا ہے پنچے اک حمل[4] کشمیر میں

کیا خبر کشمیر کے افلاس و نکبت کی انہیں
پائونیر پڑھتا ہو جس نے یا سول کشمیر میں

ہم نے یاری کا نشاں تک بھی کہیں پایا نہیں
گو نظر آتے ہیں صدہا یاربل[5] کشمیر میں

لاریوں نے ختم کر ڈالا یہاں کا سب فروٹ
اب کہاں پہلے جو مل جاتے تھے پھل کشمیر میں

کس طرح توحید سے تثلیث آلیتی حنیظ[6]
کر لیا ہے تو نے اس مشکل کو حل کشمیر میں

پنڈتوں نے کر دیا اب یہ ریزولیوشن بھی پاس
ذبح خانہ[7] ہے زنانہ ہسپتل کشمیر میں

سب ممالک میں ہیں آفات کسادو رزی نئے
چل رہا ہے عہد للسادت کا ہل کشمیر میں

جس طرح دریا کو ہے اس ارض اقدس کا خیال
تو بھی تھم تھم کے ادب کے ساتھ چل[8] کشمیر میں

---

۱ کشمیر ایجی ٹیشن کے ایام میں مارشل لا کے نفاذ کی طرف اشارہ ہے ۲ کٹ کشتو کشمیر کی انتہائی سردی کے چند ایام کا نام ہے ۳ سرینگر کی مشہور جھیل جس کے ساحلوں پر محلات شاہی نگری مل چشمہ شاہی۔ نشاط نسیم اور شالامار وغیرہ واقعہ ہیں ۴ حمل سوپور سے متصل ایک علاقہ کا نام ہے خواجہ ملہ خضر ذیلدار سکندر گام کی ذیل میں ۵ یاربل کشمیر میں گھاٹ کو کہتے ہیں ۶ ڈاکٹر عبد الواحد کے ایک لڑکے کا نام جس نے نومبر ۱۹۳۲ء میں ایک عیسائی لیڈی کو مسلمان کر کے اس سے نکاح پڑھوا لیا تھا ۷ کشمیری پنڈتوں کی کانفرنس نے اپنے اجلاس میں سرینگر کے زنانہ ہسپتال کے خلاف ریزولیوشن پاس کرتے ہوئے اس کو عورتوں کا ذبح خانہ قرار دیا تھا ۸ وادیٔ کشمیر میں دریائے جہلم نہایت آہستہ خرامی سے چلتا ہے۔ مگر حدود کشمیر سے باہر نکلتے ہی اس میں ملک شگاف شور پیدا ہو جاتا ہے۔

ہم بھی کرتے سیر کچھ کشمیر کی ملتے جو مفت — ماہی[1] ڈھول ککڑ لوت و تمل کشمیر میں

اپنے مجروحوں کو دیتا ہے کہاں مرہم کوئی — زخم میں سے کھینچ لیتے ہیں نمک کشمیر میں

مضطرب ہیں سب ملازم اور پبلک بیقرار — اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا خلل کشمیر میں

حاکموں تک بھی ملے ناداں ناخلف الیفلٹ عہد — اور ملکوں میں عمل رد عمل کشمیر میں

قابلیت سے ہیں جن کی سرو سنز تک شرمسار — آج تنخواہیں وہ پاتے ہیں ڈبل کشمیر میں

کیوں نہوں ممنون جو شہر[2] کے کہ اس کی وجہ سے

سکۂ امن و اماں کا ہے عمل کشمیر میں

سنہ ۱۹۳۳ء کی پہلی نظم

لاہور میں صبح کی سیر کا بہت کم ناغہ ہوتا ہے۔ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۳۳ء کی صبح کو حسب معمول دریا کی طرف جا رہا تھا ہوا سرد تھی لیکن خوشگوار تھی۔ ایک دو شعر رستے ہی میں چلتے ہوئے تیار ہو گئے اور باقی واپسی پر ان شعروں کے بعد ابتک کہ ۱۱ اپریل کی تاریخ گذر چکی ہے اس طرف توجہ نہیں ہو سکی اور نہ کاروباری مصروفیتیں اس طرف متوجہ ہونے کی اجازت دیتی ہیں۔

یہاں چاہیے یا وہاں چاہیے — مرا دل ہے حاضر کہاں چاہیے

عیاں چاہیے یا نہاں چاہیے — ترقیٔ ہندوستاں چاہیے

نہیں شکوۂ گردش آسماں — ہمیں گردش آسماں چاہیے

برستا تو ہے ابر رحمت مگر — برستا نہیں ہے جہاں چاہیے

جہاں مٹ گئے سرکشان جہاں — وہی در وہی آستاں چاہیے

زمین جس کے نیچے ہو کشمیر کی

ہمیں فوق وہ آسماں چاہیے

کتبہ محمد حسین قریشی خوشنویس — محلہ ڈبہ بازار لاہور

[1] ماہی مچھلی، ڈھول انڈا، ککڑ بوٹ مرغ، تمل چاول [2] سردار عطر سنگھ جو گورنر صوبہ کشمیر سے مراد ہے

مسلمانانِ کشمیر کا فوجی عروج و زوال

۱۹۱۰ء میں تاریخ کشمیر کے حصہ دوم کا مسودہ میرے زیر نظر تھا سلاطین کشمیر کی فوجی نبرد آزمائیوں اور ان کی تیغ رانیوں کی کیفیت کا دل پر جو اثر ہوا۔ وہ ذیل کی نظم میں ظاہر کیا گیا

پھرا ذہن رسا فردوس کی منزل میں ہے　　پھر خیال عرش پیما کشور حاصل میں ہے
پھر سلاطین سلف کی یاد پیہم دل میں ہے　　چاند منزل میں ہے یا لیلیٰ کوئی محمل میں ہے
پھر ہوائے خطۂ کشمیر سے دل شاد ہے
پابگل ہونے پہ بھی سرو چمن آزاد ہے

طبع پابند نفس ہائے نکوہش العیاذ　　رُک سکتی ہے مجھے غیروں کی رنجش العیاذ
ترک ہو سکتی ہے مجھ سے کیا یہ کوشش العیاذ　　درد ہو اور دل نہ ہو سرگرم نالش العیاذ
میں تڑپتا ہوں کہ کیوں صیاد پھر نخچیر ہے
آہ کیسی گردش رفتار چرخ پیر ہے

جنت دنیا کی حالت آج ہے دوزخ نما　　رنج زا ہے آج میرا مسکن راحت فزا
صاحب تکریم کی "تذلیل ہے بے انتہا　　الغرض منظر ہے وہ جس سے نہ تھا میں آشنا
کارواں سالار تھا میں یوسف امید کا
شور تھا مصر مشیت میں مری "تائید کا

طعن جانفرسا سے گر ہوتا ہے کوئی دلشکن　　میں سمجھتا ہوں کہ غافل ہے ترکارِ سوئے ظن
انجمن سے بے خبر ہیروں نشینِ انجمن　　شپرہ ہے مہر کی رویت سے قاصر بے سخن
جلوہ گر اک نور میری وادیٔ سینا میں ہے
دیکھنے کی تاب پوچھو چشم نابینا میں ہے

یاد ہے کشمیر کیا عہد شہاب الدین تجھے — یاد ہیں کیا اس کی صلح و جنگ کے آئیں تجھے
اس کے فیض پا سے تھی سر دم نئی تزئیں تجھے — دیکھ کیا کیا نعمتیں اللہ نے بخشیں تجھے

بے تکلف تجھکو وہ فرمانروا حاصل ہوا
ایک دن کشور کشائی سے نہ جو غافل ہوا

دور زین العابدین دور ترقی تھا تجھے — اس کے روشن کارناموں نے دیا چمکا تجھے
دیدیئے اس کی شجاعت نے وہ دست و پا تجھے — کوہ نے روکا نہ مانع آسکا دریا تجھے

تیری عظمت کا صفائی سے عیاں پہلو ہوا
کشور پنجاب کا دار الخلافہ تو ہوا

تیری خاک پاک سے پیدا ہوئے وہ نامدار — باج دیتے تھے جنہیں گویا جہاں کے تاجدار
فتح خاں جیسے ترے جرار تھے عالی وقار — فتح کی سر حد پہ جا کر جسنے قلعوں کی قطار

حق تو یہ ہے سرزمیں تیری شجاعت خیز تھی
تیری خو تیری ہوا کی طرح عنبر بیز تھی

وہ حسن سا نامور فرمانروائے کاشمیر — سرو بالا قامت بستاں سرائے کاشمیر
عازم ہندوستاں کشور کشائے کاشمیر — سایہ پرور دہ پر و بال ہمائے کاشمیر

وائے جموں نے حبیب تا تار کی فریاد کی
تار تار اس نے دہی کردی قبا بیداد کی

جب ترے حملوں سے غوغے ہند کی کشور میں تھے — سب کے سب تیرے ہی باشندے ترے لشکر میں تھے
کون کہتا ہے کہ داخل غیر تیرے گھر میں تھے — جس قدر جوہر تھے تیری کان کے گوہر میں تھے

دیکھ تیکن انقلاب اے خطہ کشمیر آج
ہو رہی ہے تیرے فرزندوں کی کیا تحقیر آج

تھا محمد شاہ تیرا ایک کم سن تاجدار — دل سے ہوں لاکھوں تصدق جسکے تہور پر نثار

جس کے اب تک سامنے ہیں جوانمردانہ فقرے یادگار   جس نے کی تھی زینت شاہی سے نفرت آشکار
سب نفائس دیکھکر بیکار اپنے ہاتھ میں
اک کماں رکھ لی تو اک تلوار اپنے ہاتھ میں

خانہ جنگی سے ہوئی برباد تیری عز و جاہ   ورنہ ارفع تھا ترا رتبہ تو عالی پائیگاہ
کون تھا ایسا کہ تجھ پر ڈالتا میلی نگاہ   تو نے اپنے ہاتھ سے مارا گیا تو بے گناہ
تجھ سے غداری یہ دور گردش گردوں کی ہے
ہاں شفق کے رنگ میں سرخی یہ تیرے خوں کی ہے

وہ سلف تھے اور ان کے یہ خلف افسوس ہے   وہ قدر انداز اور یہ خود ہدف افسوس ہے
مٹ گیا پچھلوں سے اگلوں کا شرف افسوس ہے   بن گیا گوہر کہن ہو کر خذف افسوس ہے
مسلم کشمیر اٹھ اور باندھ ہمت کی کمر
غالب آ سکتا نہیں ہے حق پہ باطل کا اثر

دیکھ اے کشمیر کہتے ہیں تجھے جنت نظیر   تیرے چشموں اور نہروں میں رواں ہے شہد و شیر
تیرے طائر ہیں صدائے عقل کل کے ہم صفیر   تیری خاک پاک سے نکلے ہیں ہر فن کے شہیر
صفحۂ تاریخ کی مانند کھا پلٹا ذرا
سامنے آنکھوں کے پھر نے آدہی نقشا ذرا

کشمیر ایجی ٹیشن کے ایام میں

(ایک جابر و سخت گیر حاکم سے خطاب)
جو آج دوسری دنیا میں احکم الحاکمین کے روبرو اپنے اعمال و افعال
کی جزا و سزا بھگت رہا ہو گا

(۱)

(۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء بمقام سرینگر کشمیر)

جو ظلم تو نے کیا بیکسوں کی جانوں پر
وہ پیش خیمۂ اسباب انقلاب بنا
جہاں اڑا کئے مرغان سوختہ اکثر
وہ خطہ سوز دروں سے خود کباب بنا
جو بطن مادری ہی میں رہا ضعیف و نزار
وہ طفل رشک دہ جوشش شباب بنا
ہزار حیف جو دوزخ کے بھی نہ تھا قابل
وہ اہل جنت دنیا کا ہمرکاب بنا
ہمیشہ تیرے قدم نے جسے کیا پامال
وہ ذرہ آج چمکتے ہی آفتاب بنا
ہمارے رونے پہ تھمتی نہ تھی ہنسی جسکی
سنا ہے آج وہ خود دیدۂ پر آب بنا

(۲)

تیری بے آئین باتوں پر تو قانونی غلاف
میری حق گوئی پہ قائم جرم ہے تعزیر کا
پیٹ کے بھوکوں پہ ظالم اس قدر جور و ستم
آہ فریادی بنیں لقمہ دہان تیر کا
خشت ہائے ظلم پر بنیاد ہے جس قصر کی
خاتمہ ہے ایک ہی جھونکے میں اس تعمیر کا
غیرت مسلم کر لے غافل حقارت سے نہ دیکھ
شیر پر تجکو ہرا جانا ہے دھوکہ شیر کا

تمت

ھ جنا ..... وہ نگار سے بجبر شدید کہ در بطن مادر بسیر برستہ

عشقِ پنجاب اور حسنِ کشتواڑ

اتوار کی وجہ سے سرینگر کشمیر کی سیرگاہوں اور خصوصاً ہاردن شالامار باغ، نشاط اور چشمہ شاہی پر بہت رونق ہوتی ہے۔ فواروں آبشاروں اور باغات کے سبزہ زاروں سے ان سیرگاہوں میں ہر سیاح ایک سرور و لذت محسوس کرتا ہے۔ ۲ جولائی ۱۹۳۳ء کے اتوار کو تین دوست ہاردن اور شالامار کی سیر کے بعد دن کے آخری حصے میں نشاط کی سیر کیلئے موٹر سے اترے سیڑھیاں چڑھ ہی رہے تھے کہ دائیں طرف کی روش پر "پرستانِ کشتواڑ" کے ایک جھرمٹ کو جو سیر کرکے واپس آرہا تھا اور "عشق آباد پنجاب" کے "چندستانِ محبت" کو جو ابھی نشاط کی منزل اول میں قدم رکھنے ہی پائے تھے۔ ان بھول بھلیوں کا اضطراب افزا سامنا کرنا پڑا۔ جو بالمقابل راہگذروں کو کبھی کبھی تبسم آمیز ندامت کے ساتھ پیش آجایا کرتی ہیں۔ حسن وعشق کا یہ خاموش تصادم جو ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، ہر تماشائی کو محوِ حیرت کر رہا تھا۔

واپسی پر رستے میں شام کے خاموش نظاروں نے نشاط کی شیام سندر جماعت کے واقعہ نہیں بلکہ حادثہ کی طرف ذہن منتقل کر دیا۔ اور مندرجہ ذیل چھ شعر تیار ہو گئے۔

یہ حسنِ کشتوار ہے یا قتل گاہِ عشق — مدفن ہے حسرتوں کا کہ باغِ نشاط ہے
تو "حسنِ خوش نصیب" جو چاہے کرے بجا — میں "عشقِ بدنصیب" مری کیا بساط ہے
ہے حسن احتیاطِ محبت سے دور دور — اور عشق کو ہنوز سرِ انبساط ہے
چلتا ہے حسن عشق سے بچ بچ کے اس جگہ — ہر چند ایک دارِ فنا کی صراط ہے
محتاط عشق بھی ہے بہ اندازۂ نیاز — یہ وضع وہوش لازمۂ احتیاط ہے

دامن کشاں ز حسن بہ امید و بیم باش
ہشیار از تصادم برق و کلیم باش

سہرا

بتقریب شادی برخوردار عبد الحمید اسسٹنٹ انجنیئر ریلوے گرنڈہ ڈیویژن) خلف اخوان صاحب بابو رحیم بخش صاحب انسپکٹر ریلوے پنجاب، (حال ریٹائرڈ بمقام سیالکوٹ)

برات ۱۹ اپریل ۱۹۳۰ء کو ۴½ بجے بعد دوپہر سیالکوٹ سے پشاور پہنچی جہاں معززین شہر کی ایک کثیر تعداد نے ریلوے سٹیشن پر خیر مقدم کیا۔ شام کو خانصاحب میر کریم بخش صاحب بی ای ایس انسپکٹر آف ویکلر ایجوکیشن (حال تعا بمقام ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ سرحد کی دختر بلند اختر کے ساتھ رسم نکاح خوانی کے بعد کئی اصحاب نے سہرے اور نظمیں پڑھیں جن میں سے عزیز منظور حسن طالب علم جماعت دہم (حال فورتھ ایر کلاس مشن کالج لاہور) خلف اخوانصاحب بابو غلام حسن صاحب رئیس و میونسپل کمشنر وزیر آباد نے نیازمند کا لکھا ہوا حسب ذیل سہرا پڑھا

اے حمید آج مبارک ترے سر پر سہرا
جلوۂ نور سعادت ہے سراسر سہرا

مہر دمہ سے بھی ہے وہ چند منور سہرا
کیا عجب بزم کو چمکائے چمک کر سہرا

للہ الحمد کہ مدت کی برآئی امید
آج خالق نے دکھایا ترے سر پر سہرا

لڑیاں سہرے کی ہیں زنجیر محبت دل کو
زلف محبوب کا نقشہ ہے سراسر سہرا

بدنگاہوں کی نظر کا ہے بہت اسکو خیال
کیوں نہ بن جائے نقابِ رُخ انور سہرا

رونمائی کیلئے آئینہ خود بن جائے
میرے نوشاہ کا دیکھے جو سکندر سہرا

ہر قدم پر ہے دلاویزیئے رفتار نثار
پائے نوشہ کو نہ کیوں چوم لے بڑھکر سہرا

نکہت باغ جناں سے ہے معطر محفل
حوریں لے آئی ہیں جنت سے بنا کر سہرا

والد و والدہ ہیں شاد چچا ہیں خوشنود
کارِ خیر تو مبارک بود ایں سر سہرا

کہدو منظور یہ نوشہ سے بھری محفل میں
ناز کرتا ہے ترے بخت رسا پر سہرا

دل کی تڑپ

کشمیر کے ماضی وحال کو دیکھکر اس کے مستقبل کے لئے

(۱۰ جنوری ۱۹۱۴ء بمقام لاہور)

شان رفتہ دیکھ لی ہے تو نے دور آسماں :
آہ! جس حالت میں اب مسلم ہیں وہ حالت بھی دیکھ
کھا چکا الوان نعمت مدتوں اے ہم نفس
قوم درماندہ کے غم کھانے کی اب لذت بھی دیکھ
جن مسلمانوں کے قدموں پر تھے نازاں تخت وبخت
ان مسلمانوں کی اب کشمیر میں ذلت بھی دیکھ
مدتوں جس قوم نے لوٹی ہے ثروت کی بہار
دیدۂ عبرت سے اب اُس قوم کی نکبت بھی دیکھ
تو نے وہ "قلت" بھی دیکھی ہے کہ تھے جس پر ناز
شرم جس کو دیکھ کے آجائے وہ "کثرت" بھی دیکھ
گو بجتے تھے ہم کبھی عالم میں وہ دن بھی ہیں یاد
تو نے وہ نوبت جو دیکھی ہے تو یہ نوبت بھی دیکھ
شکل تھی خورشید طلعت اور ملک سیرت تھی خو
اب جو ننگ خلق ہے وہ صورت اور سیرت بھی دیکھ
وہ بھی غم دیکھا ہے تو نے عیش تھا جس کا مآل
جس میں پہلو رنج کا پنہاں ہے وہ راحت بھی دیکھ
غفلتیں آئیں بھی لیکن دور بھی ہوتی گئیں
بھیس میں جو موت کے آئی ہے وہ غفلت بھی دیکھ
تو نے دیکھی ہیں بہت چیزیں جو عبرت خیز ہیں
جس سے خود عبرت کو عبرت آئے وہ عبرت بھی دیکھ

(ناتمام)

مختصر فہرست کتب

مؤلفہ مصنفہ منشی محمد الدین فوق ایڈیٹر مالک پروپرائٹر اخبار کشمیری لاہور

تاریخ حریت اسلام ۸ ے
تذکرۃ الصالحین ۱۲ ا ر
وجدانی نشتر عرف سوز و گداز ۸ عہ
ملاّ دو پیازہ ۴ ہر
راجہ بیربر ۴ ہر
تذکرہ خواتین دکن ۸ ر
اکبر اعظم ۸ عہ
روایات اسلام ۶ ر
سوانحعمری مولانا روم ۱۲ ا ر
حالات شمس تبریز ۶ ر
سیرت فریدیہ ۶ ا ر
حیات فرشتہ ۳ ر
حضرت ابراہیم ادہم ۴ ہر
محبّ وطن خواتین ہند ۸ ر
زنانہ حمائل جواہر ۶ ا ر
سعد زاغلول پاشا ۱۰ ا ر
تاریخ سیالکوٹ ۱۰ ا ر

مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۲ ا ر
فلاتح ملتان ۳ ر
تان سین ۴ ہر
تاریخ انگورہ ۸ عہ
ناصح مشفق ۱۲ ا ر
تاریخ کاروش پہلو ۱۲ ا ر
تذکرہ رہنمایان ہنود ۸ عہ
بتان حرم ۸ ر
غازی محمد بن قاسم ۲ ر
اذان بتکدہ ۴ ر
کلام فوق مجلد عہ
ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے ۳ ر
دیوان حافظ کی تاریخی فالیں ا ر
اخبار نویسوں کے حالات ۱۲ ا ر

شالامار باغ ۸ ر
سکاڈوں کے گیت ۲ ر
سبق آموز تاریخی کہانیاں ۴ ر
تذکرہ علمائے لاہور ۱۰ ا ر
تذکرہ صوفیائے لاہور ۱۲ ا ر
حیات داتا گنج بخش ۸ عہ
تذکرہ قدیم شعرائے لاہور ۴ ہر
لاہور عہد مغلیہ میں ۸ ر
مکمل تاریخ کشمیر ہر سہ جلد ۱۰ ا ر
حکمت کے موتی ۴ ہر
حکایات کشمیر ۶ ر
شاہی سیر کشمیر ۲ ر
لالہ عارخہ ۴ ہر
شباب کشمیر ۸ عہ
مشاہیر کشمیر عہ
تاریخ اقوام کشمیر عہ

راجہ ٹوڈرمل ۴ ہر
رہنمائے کشمیر ۸ عہ
کشمیر کی رانیاں ۴ ہر
تمدن کشمیر ۸ ر

ناول و فسانے

انار کلی ۱۲ ا ر
خانہ بربادی ۱۲ ا ر
رام کہانی ۸ ر
نیم حکیم خطرہ جان ۸ ر
مسٹریز آف امرتسر ۴ ر
غم نصیب ۱۲ ا ر
جغرافیہ پونچھ و کشمیر ۳ ر
حیات نورجہان و جہانگیر
السلف والخلف یا تذکرہ حسن (اپنے خاندانی حالات کی کتاب) پرائیویٹ ایڈیشن

کتب ملنے کا پتہ: ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور

ہماری مطبوعات اور تعلیمی محکمے

ہماری مطبوعات جو قریبًا سب کی سب پنجاب وکشمیر کے مشہور مصنف و مورخ منشی محمد الدین صاحب فوق اخبار کشمیری لاہور کی تصنیفات سے ہیں پبلک کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبجات اور دیسی ریاستوں کے محکمہ ہائے تعلیم میں بھی قبولیت حاصل کر چکی ہیں منجملہ ان کے مندرجہ حاشیہ کتب نمبر ایک سے نمبر دس تک گورنمنٹ جموں وکشمیر کے سررشتہ تعلیم میں بطور انعامی ولائبریری کتب منظور ہیں نمبر ۱ نمبر ۵ نمبر ۶ نمبر ۷ نمبر ۹ ریاست پونچھ اور نمبر ۷ ریاست ہائے ٹونک وکپورتھلہ کے سررشتہ تعلیم میں اور نمبر ۸ محکمہ تعلیم صوبہ متوسط (سی پی) اور نمبر ۱ پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے مدارس پنجاب اور ریاستہائے بہاولپور وبھوپال نے اپنے مدارس کے لئے بطور انعام ولائبریری کتب منظور کی ہوئی ہے۔

یہ سب کتابیں دو دو تین تین بلکہ چار چار مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

کتاب نمبر ۱ سررشتہ تعلیم جموں وکشمیر کی جماعت ششم اور محکمہ تعلیم پونچھ کی جماعت پنجم اور کتاب نمبر ۷ سررشتہ تعلیم ریاست مالیر کوٹلہ کی جماعت ہشتم کے لئے بطور سپلیمنٹری ریڈر منظور ہے۔ اور کتاب نمبر ۱۲ محکمہ تعلیم پونچھ نے جماعت سوم پرائمری کے لئے کورس مقرر کی ہوئی ہے

ہمیں امید ہے کہ محکمہ تعلیم پنجاب اور ریاستوں کے صاحبان انسپکٹر مدارس۔ ان کے اسسٹنٹ اور ہیڈ ماسٹر صاحبان مدارس ہماری مقبول عام کتابوں کی طرف خاص طور پر توجہ فرما کر ہماری سرپرستی فرمائیں گے۔ کتاب ۱۲ محکمہ تعلیم یوپی میں بھی بطور لائبریری وانعامی منظور ہے

(۱) حکمت کے موتی ۴ر
(۲) روایات اسلام ۶ر
(۳) سوانح مولانا غنی ۶ر
(۴) مشاہیر کشمیر عہ
(۵) مکمل تاریخ کشمیر ۱۰ر
(۶) کشمیر کی رانیاں ۴ر
(۷) تاریخ کا روشن پہلو ۱۲ر
(۸) سکاوٹوں کے گیت ۲ر
(۹) شباب کشمیر عہ
(۱۰) حکایات کشمیر ۶ر
(۱۱) تاریخ حریت اسلام
(۱۲) جغرافیہ پونچھ ۳ر

المشتہر

ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور